قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2020 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

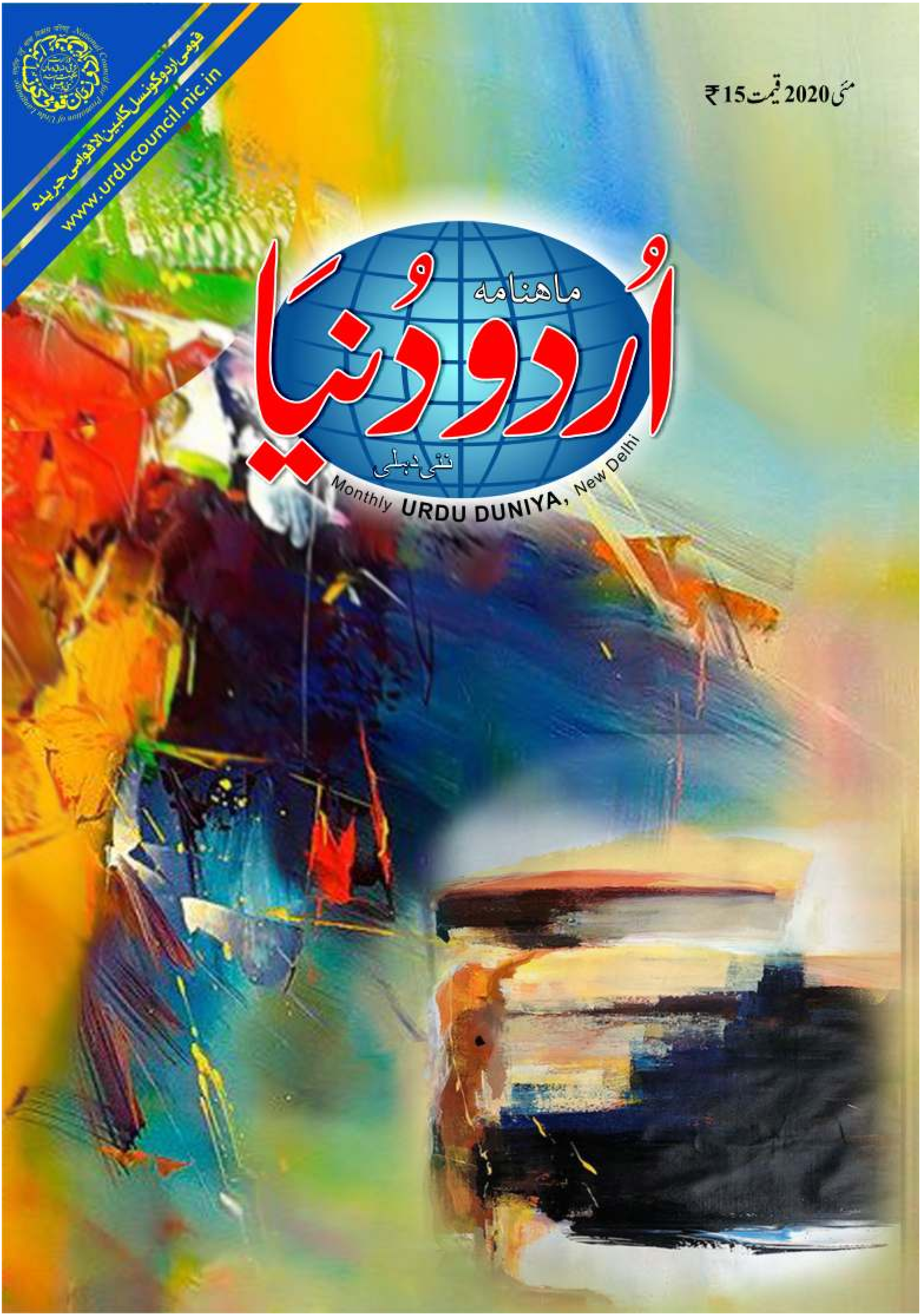

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

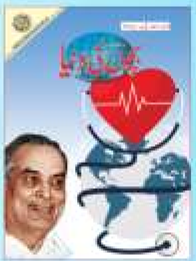

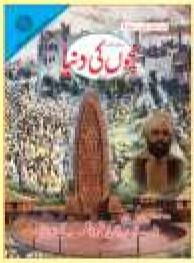

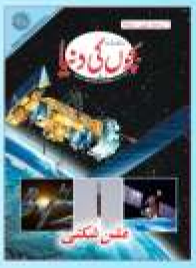

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماهنامه
اُردو دُنیا
دھلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22،شمارہ:05،مئی 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II،نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22،تھرڈ فلور،ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

فروغ اردو: امکانات و اقدامات
جدید انفارمیشن ٹکنالوجی کا اردو میں استعمال: صورتِ حال اور امکانات — محمد جہانگیر وارثی 6

فروغ اردو کے لیے ضروری اقدامات — سورج دیو سنگھ 9
نئی نسل اور اردو زبان — ایم اے کنول جعفری 11

نقد و نگاہ
مشترکہ ہندوستانی قومی فضا اور چکبست کی شاعری — فرحت نادر رضوی 14
آگرہ بازار کے آئینے میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور شاعری — رضوان الحق 17
دکن کا نیر سخن: احسن یوسف زئی — غضنفر اقبال 20

کلام مومن میں تصوف اور رومانیت — مسرور صغری 24
تقابلی مطالعے کی اہمیت وافادیت — محمد نہال افروز 27

ذکر سعید
مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور دہلی یونیورسٹی — جسیم الدین 30
مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی مکتوب نگاری — فاروق اعظم قاسمی 32
پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی: شخص و عکس — عبدالباری قاسمی 36
مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا اسلوبِ نگارش — حقانی القاسمی 39

اردو فکشن: تفہیم و تناظر
اردو فکشن میں راوی اور بیانیہ کی نوعیتیں — انجم پروین 42
جمیل مظہری کے ناولٹ 'شکست و فتح' کی عصری معنویت — تسلیم عارف 46
مسز عبدالقادر کے تحیر خیز افسانے — محمد جابر حمزہ 48
ابن صفی کا ناول وبائی ہیجان اور کورونا وائرس — حمیرا عالیہ 51
جموں و کشمیر میں اردو افسانہ 2000 کے بعد — زمرودہ محمد میر 54

خراج عقیدت
کچھ یادیں، کچھ باتیں عبدالاحد ساز کی — صدر عالم گوہر 57

سلسلۂ صحافت
ماہنامہ 'بچوں کا ہلال' رامپور — سعدیہ سلیم شمسی 60

شخصیات
نیر سلطانپوری کا شعری اسلوب — محمد یٰسین 63

قابل اجمیری: بزمِ رفتہ کا شاعر — عمران عاکف خان 65

نگر نگر اردو
وِدربھ میں معاصر اردو تنقید و تحقیق — خان حسنین عاقب 68

عالمی ادبیات
تاریخِ عربی ادب کی مشہور کتابوں کا جائزہ — محمد شاکر رضا 72

نیا آسماں نئے ستارے
علی گڑھ میں اردو سفرنامہ — محمد اکمل خان 76
اردو میں مذاہب و ملل کی ترجمانی — تفسیر حسین 80
حمید الماس بحیثیت مترجم — زلیخا بیگم 82

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 85

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 90

ہماری بات

ادب اور سماج کا باہمی رشتہ نہایت مضبوط ہے کیونکہ ادب سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہی سماج کی تعمیر وتشکیل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ادب کے بغیر سماج وحشی بن جاتا ہے۔ ایک سچا، حساس اور باشعور ادیب وہ کہلاتا ہے جو اپنے سماج اور معاشرے سے علیحدہ ہو کر نہ سوچتا ہے اور نہ ہی لکھتا ہے۔ اس کی تحریروں میں معاشرے کے مسائل وو سائل کا بہتر تجزیہ ہوتا ہے۔ کارآمد ادب وہی کہلاتا ہے جو اپنے زمانے کے مسائل سے ہم آہنگ ہو اور جس میں حیات وکائنات کے حقائق سے بحث کی گئی ہو اور مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہو۔

ہر سچا ادیب اپنے معاشرے پر گہری نگاہ رکھتا ہے، وہ معاشرے کی خوبیوں کو بھی پہچانتا ہے اور اس کی خامیوں پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے، وہ معاشرے کو خوب صورتی عطا کرنے والے اخلاقی، علمی و عملی عناصر سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور ان خامیوں کا بھی اسے علم ہوتا ہے، جن کی وجہ سے ایک معاشرہ زوال وانحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ادیبوں اور فنکاروں کے قلم سے جو ادب وجود میں آتا ہے وہ نہ صرف قارئین کے ذہن وفکر کو روشن کرتا ہے بلکہ معنویت کے اعتبار سے پورے انسانی معاشرے کے لیے نتیجہ خیز اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ ہر زمانے کے ادیبوں نے سماجی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ایسا ادب تخلیق کیا ہے جو اس زمانے کی سماجی ضروریات اور تقاضوں پر پورا اترتا ہو۔ جب حالات نے تقاضا کیا کہ سماج میں تبدیلی لائی جائے اور افراد کے دلوں میں انقلاب کی چنگاری بیدار کی جائے تو انھوں نے انقلاب انگیز تحریروں کا سہارا لیا اور جب ایک غلام معاشرے کو آزادی کی قدر وقیمت کا احساس ہوا تو اس سماج کے ادیبوں نے نغمہ ہائے آزادی لکھے اور ان نغموں کی بدولت معاشرے کے ایک ایک فرد میں حصول آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی، اسی طرح جب کبھی ضرورت محسوس ہوئی کہ قوم اور معاشرے میں امن و یکجہتی اور اتحاد واخوت کا ماحول قائم کیا جائے، تو ہمارے ادیبوں نے یہ ذمے داری بھی بخوبی نبھائی۔

آج کے ملکی وعالمی ماحول میں بھی اہل ادب کی ذمے داریاں پہلے کی طرح قائم ہیں، بلکہ کئی اعتبار سے اس وقت ان کی ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اکیسویں صدی چونکہ اطلاعاتی انقلاب اور ٹکنالوجی کی صدی ہے، جس کے اپنے بے شمار فوائد ہیں، مگر سماجی سطح پر اس کے کئی نقصانات بھی سامنے آرہے ہیں۔ آج تفریح کے ذرائع بھی بہت سارے ہیں، مگر اسی تناسب سے تخریب کے ذرائع بھی بکھرے پڑے ہیں۔ پہلے معاشرہ اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا، تو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں بے چینی و بے اطمینانی کے اسباب بھی کم تھے، آج جبکہ ہم ترقی کی انتہاؤں پر پہنچتے جارہے ہیں تو اسی کے ساتھ معاشرتی اقدار کے زوال کا بھی ہمیں سامنا ہے اور اسی وجہ سے سماجی انتشار وخلفشار اور انارکی کے واقعات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ قومی یکجہتی و ہم آہنگی کے جذبات سرد پڑتے جارہے ہیں۔ ایسے ماحول میں ہمارے ادیبوں کی ذمے داری ہے کہ وہ معاشرے کی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے اتحاد واخوت اور قومی یکجہتی کو مضبوطی بخشنے والا ادب تخلیق کریں۔ اردو کے ادیبوں نے اس ضمن میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی ذمے داری کو محسوس کیا اور اسے پورا بھی کیا ہے، انھوں نے انتشار زدہ ماحول میں لوگوں کے ذہنوں میں بقائے باہمی کی اہمیت کو جاگزیں کیا اور ایسی شاعری کی، جس سے ماحول میں عداوت کے بجائے محبت کا فروغ ہو۔

اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ امن اور محبت ہی کی بات کی اور رواداری کے جذبے کو فروغ دیا۔ اردو زبان وادب میں رواداری اور اتحاد و یگانگت کی ایک عظیم روایت رہی ہے، کلاسیکی شاعری میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جس میں جذبۂ اتحاد اور رواداری کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اس طرح کے شعر کہے گئے ہیں جس سے مختلف طبقات کے درمیان تصادم کے بجائے تفاہم کی فضا ہموار ہو۔ یہی اردو زبان کی خوبصورتی اور اس کا حسن ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

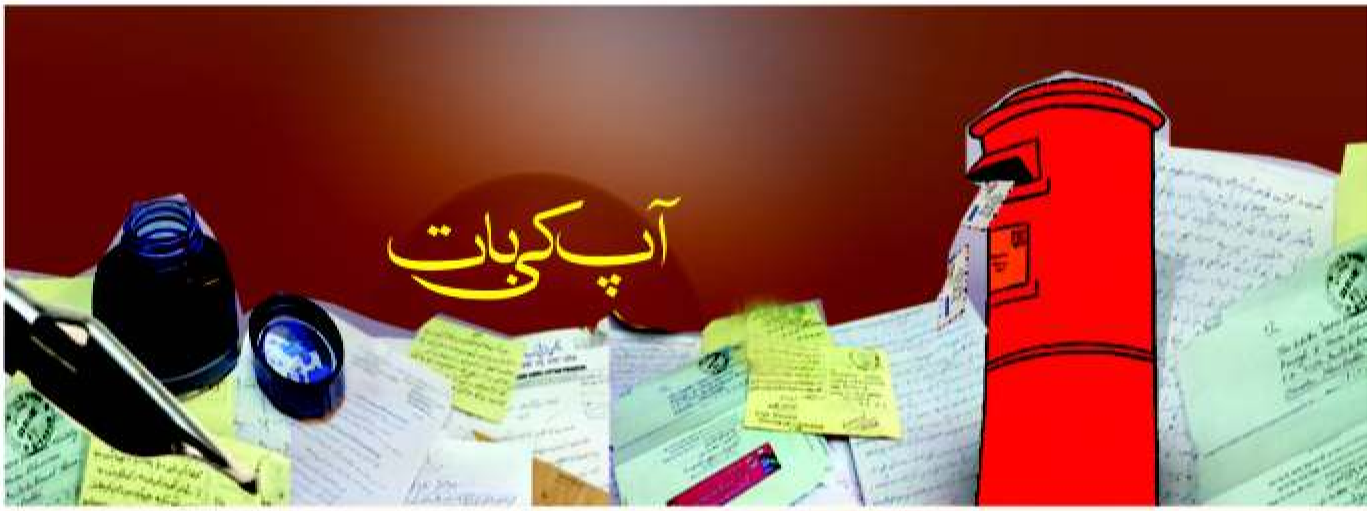

مارچ کے شمارے میں آفاق ندیم خان صاحب نے اردو زبان کی تدریس کے ضمن میں مبادلہ تدریس کی بابت ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا ہے۔ فقط صفحہ 9 پر 'علیحدہ' دو بار اس غلط لفظ کی بجائے 'علٰیحدہ' یا 'علاحدہ' املا کا تصرف درکار تھا۔ اگلے صفحے پر بھی 'رونماں' کی جگہ 'رونما' املا چاہیے تھا۔

نصرت نبی کے قلم سے اخذ معیاری و بلند پایہ مضمون بھی شخصی مراثی کے معانی و مفہوم کی بخوبی خط کشی کرتا ہے۔ اس میں ص 24 پر 'لوازمات غلط' لفظ کا استعمال کھٹکتا ہے، کیونکہ محمد مصطفیٰ خاں مدح کے موقر لغت 'اردو ہندی شبدکوش' میں یہ صاف طور پر درج کیا گیا ہے کہ: ''لازم' لفظ کی جمع ''لوازم' لفظ غلط ہے، لیکن اردو میں بولتے ہیں، بلکہ اس کا جمع 'لوازمات' بھی بنا لیتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔'' (ص 593)

جناب اسلم جمشید پوری کا گذشتہ سال کے 21 افسانوی مجموعوں اور متعدد ناولوں پر مبنی تبصرہ اور عمیق و دقیق تنقیدی مقالہ بھی ان کی عرق ریزی کے موجب قابل صد ستائش ثابت ہوا ہے۔ اس میں عصری حسیت سے مملو اوصاف کا بھی خصوصاً محاکمہ دیدنی ہے۔ مستزاد، کتب کے سرورقوں کی خوبصورت تصاویر نے تو گویا سونے پر سہاگے کا ہی مفید کام کیا ہے۔ دیگر تمام تر مشمولات کے ہی باعث یہ شمارہ بھی اس سے قبل کے ہر ایک شمارے کی ہی مانند جلد بندھوا کر ذاتی کتب خانے کی زینت بنوانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک، A-201، گلی نمبر K-18، گورونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' ماہ مارچ 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ دیگر شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی خوبصورت ہے۔ تمام تر مضامین معیاری ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے روز اول ہی سے اردو زبان و ادب کی دل و جان سے جو خدمت کی ہے اور کر رہی ہے قابل ستائش ہے۔ آپ کا ادارہ نایاب کتابیں عمدہ کتابت کے ساتھ شائع کرتا رہتا ہے۔ آپ کے ادارے سے جو چار رسائل 'اردو دنیا'، 'خواتین کی دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' نکلتے ہیں خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہیں۔ 'اردو دنیا' میں جس معیار کے مضامین، تبصرے، مباحثے اور اردو سے متعلق قومی و علاقائی خبریں شائع ہوتی ہیں دنیائے اردو ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔

مارچ 2020 کے شمارے میں شیخ عقیل احمد نے 'ہماری بات' میں ادب کی اہمیت و افادیت اور اس کے ارتقائی سفر کی طرف جو توجہ مبذول کرائی ہے واقعی فکر انگیز ہے ساتھ ہی ساتھ اردو صحافت کی ترقی پر جو گفتگو کی ہے بڑی معنی خیز ہے۔ زبان و تعلیم کے تحت آفاق ندیم کا مضمون 'اردو زبان کی تدریس میں مبادلہ تدریس کا استعمال' بہت اہم اور معلوماتی ہے۔ آفاق صاحب نے اس مضمون میں مطالعہ کی اہمیت و افادیت، مبادلہ تدریس کا طریقہ کار اور اس کے لائحہ عمل جس انداز میں پیش کیا ہے قابل تعریف ہے۔ نقد و نگاہ تحت مضامین قابل قدر ہیں۔ 'فارسی میں درباری شاعری ایک مطالعہ' اس میں درباروں میں قصیدہ پیش کرنے کی بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔ 'قرۃ العین حیدر' صدیق محی الدین کا مضمون ہے اس میں قرۃ العین کی حیات و خدمات کا ان کی خود نوشت 'کار جہاں دراز' کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم شمس کا مضمون 'داغ کے شاگرد مولانا حسن رضا خاں بریلوی' ہے۔ مولانا حسن رضا خاں بریلوی کا شمار داغ کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے، اس مضمون کے ذریعے مجھے ان کی شخصیت اور شاعری سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ 'شخصی مرثیہ معنی و مفہوم'، 'اردو میں انگریزی منظوم تراجم کی روایت' اور 'ترجمہ سے ترجمانی تک' بھی اہم اور معلوماتی مضامین ہیں۔ جائزہ کے تحت '2019 کا فکشن' اسلم جمشید پوری نے گزشتہ برس کے اردو فکشن کا بہترین احاطہ کیا ہے۔ خراج عقیدت میں وہ دو مضامین شامل ہیں جن میں مرحوم رضا نقوی واہی اور مرحومہ خدیجہ عظیم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ اہم مقالے ہیں دونوں مرحوم شخصیتوں کی زندگی کے بہت سے رموز کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شخصیت کے تحت ہیرالال چوپڑہ، وفا ملک پوری، اور مانوس سہسرامی کی شخصیت اور شاعری پر مبنی تینوں مضامین میرے لیے خاص معلومات افزا ثابت ہوئے ہیں۔ تہذیب و ثقافت کے ذیل میں 'قدیم گوالیار میں فن مصوری اور بت گری کی روایت' وقار صدیقی نے عرق ریزی اور دیانت داری کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ نیا آسماں نئے ستارے میں آصف مبین کا مضمون 'دکنی منظومات میں نقد شعر کی روایت' اور عامر شیرازی کا 'صنف رباعی کا آغاز و ارتقا' بھی قابل توجہ ہیں۔ نگر نگر اردو کے تحت 'مشرقی خاندیش کے موجودہ نثر نگار' وسیم عقیل شاہ نے مشرقی خاندیش کے ضلع جلگاؤں کے موجودہ نثر نگاروں کا تذکرہ احسن طریقے سے کیا ہے۔ سائنس کے ذیل میں 'البرٹ آئنسٹائن، خلا تک پہنچنے والی لفٹ، انسانی زندگی میں کیمیائی ٹیکنالوجی کا دخل' مضامین انسانی عقل اور سوجھ بوجھ کے نئے نئے دریچے کھولتے ہیں۔ کمپیوٹر کے کالم میں 'ریڈیو اور ویڈیو ٹیکنالوجی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مضمون بہت ہی اہم اور معلوماتی ہے۔ قارئین کے خطوط، تعارف اور تبصرہ کے کالم رسالے کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ''اردو دنیا'' اپنی انفرادیت کی بنا پر دنیائے اردو ادب میں بہت ہی مشہور و مقبول رسالہ ہے۔

عظمت النسا، C-162، فورتھ فلور، نزد طیب مسجد، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

■

جدید انفارمیشن ٹکنالوجی کا اردو میں استعمال صورت حال اور امکانات

محمد جہانگیر وارثی

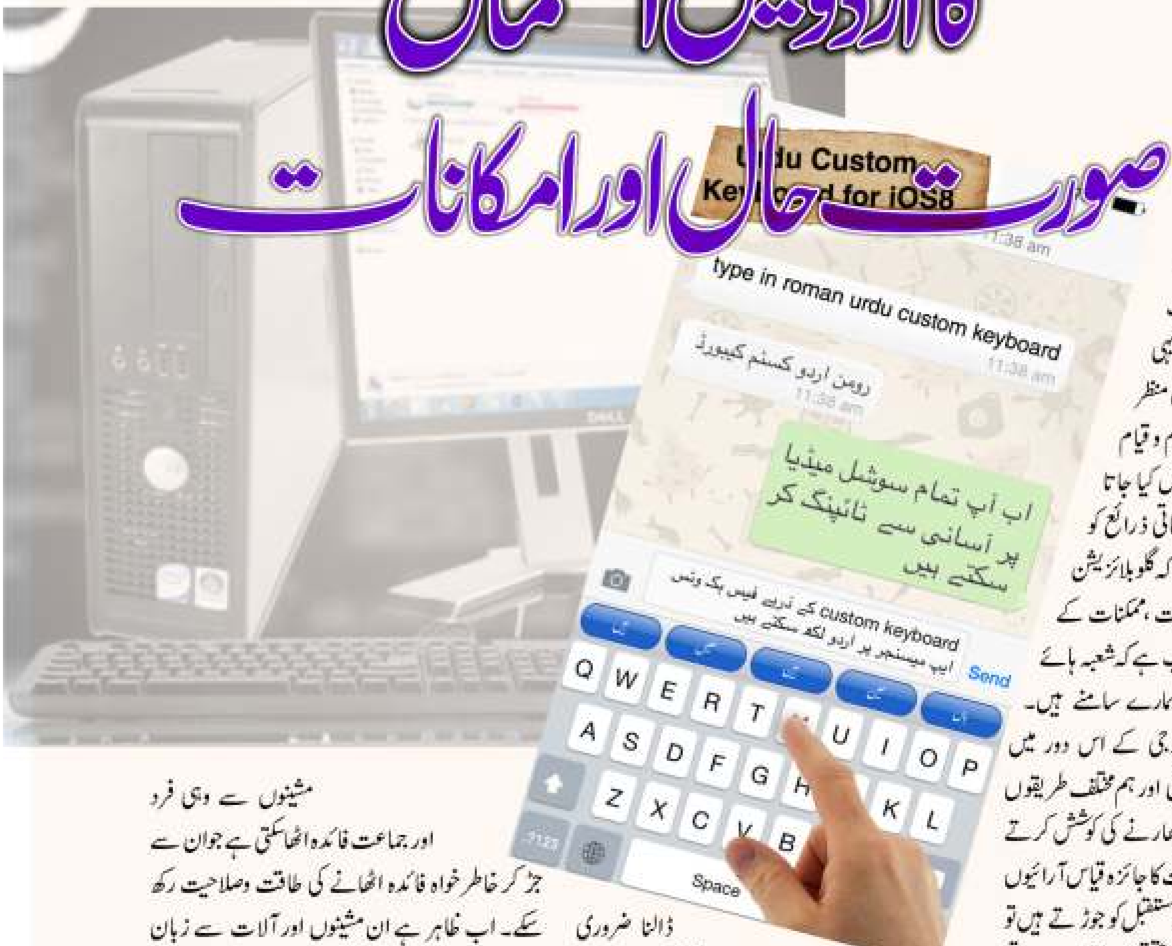

دنیا میں ہونے والی برق رفتار ترقیوں نے نہ صرف انسانی زندگی کو متاثر کیا بلکہ زبان وبیان اور تہذیب وثقافت کو بھی جدت آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ترقیوں کے پس منظر میں جہاں طبی معاملات اور طعام وقیام کے نئے نئے مسائل پر غور وخوض کیا جاتا ہے، وہیں وسائل علوم اور معلوماتی ذرائع کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ کیوں کہ گلوبلائزیشن کے اس عہد میں بے شمار نا ممکنات، ممکنات کے زمرے میں آچکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شعبہ ہائے زندگانی کے نت نئے مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں ہمارے زاویۂ فکر میں تبدیلی آئی اور ہم مختلف طریقوں سے مستقبل کے مناظر کو بھی ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے مستقبل کے حالات کا جائزہ قیاس آرائیوں سے جڑا ہوگا، مگر جب حال سے مستقبل کو جوڑتے ہیں تو ان قیاس آرائیوں میں بہت سی حقیقتیں پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے عہد میں فروغ اردو کے امکانات کا تجزیہ کریں گے تو بہت سی باتیں واضح ہوں گی اور ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ آئندہ اردو ٹکنالوجی کے سہارے کس حد تک اپنا مقام متعین کرے گی۔ کیوں کہ اردو آج نئی نئی ایجادات کے سہارے فروغ پا رہی ہے تو ظاہر ہے مستقبل میں ترقیوں کی رفتار کے پروں پر سوار ہوکر مزید آگے بڑھے گی، مگر اس کے لیے لازمی شرط ہے کہ اہل اردو انفارمیشن ٹکنالوجی کے امکانات پر مسلسل غور وفکر کرتے رہیں۔

اس مضمون میں اساسی طور پر تین پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اول، انفارمیشن ٹکنالوجی کے ابعاد وانسلاکات۔ دوم، انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو کا موجودہ استعمال۔ سوم، انفارمیشن ٹکنالوجی کے تناظر میں اردو کے امکانات۔

موجودہ عہد میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقیوں نے معلومات کے تبادلے میں ایک سے ایک شکل پیدا کردی ہے۔ یہ اصطلاح دراصل کمپیوٹر کے عہد کی اصطلاح ہے۔ یہ اصطلاح اس لیے رائج ہے کہ معلومات کے ضمن میں ہی انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق آئندہ پانچ برسوں میں انٹرنیٹ سے منسلک آلات کی تعداد 50 ارب تک پہنچ جائے گی۔ گویا ان آلات اور مشینوں سے وہی فرد اور جماعت فائدہ اٹھا سکتی ہے جو ان سے جڑ کر خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی طاقت وصلاحیت رکھ سکے۔ اب ظاہر ہے ان مشینوں اور آلات سے زبان کا رشتہ جڑا ہوتا ہے۔ پروگرامنگ سے لے کر آپریٹنگ تک کے مرحلے میں زبان بھی ایک وسیلے کے طور پر اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان آلات سے جو زبان جتنی زیادہ قریب ہوگی، اتنی ہی اس زبان کی ترقی کی راہیں کھلتی جائیں گی۔ امریکی مشہور مستقبل شناس ریمنڈ کرزویل تسلیم کرتے ہیں کہ 2045 تک انسان حیاتیاتی مشین کے طور پر ابھرے گا۔ یعنی ہمیشہ کی زندگی پانے میں کسی حد تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ حیات وممات کے فلسفے پر یقین رکھنے والوں کے لیے یہ تسلیم کرنا تو ناممکن ہے، تاہم اس مستقبل شناس کے دعوے سے اتنی بات ضرور سامنے آتی ہے کہ دنیا کا منظر خاصا تبدیل ہوجائے گا اور زندگی کا

نظریہ بالکل تبدیل ہوجائے گا۔ اب زبان کے ماہرین کے سامنے بھی نت نئے مسائل آئیں گے کہ اس صورت حال میں زبان کا کس حد تک کردار ہوگا اور کتنی زبان گلوبلائزیشن کے عہد میں اپنے آپ کو زندہ رکھ پائے گی۔

کمپیوٹر سے اردو کے رشتے یا اردو کی بات کی جائے تو یہ سلسلہ کسی نہ کسی سطح پر 40 سالہ تاریخ رکھتا ہے۔ کیوں کہ 1980 میں مرزا جمیل نامی پاکستانی فرد نے اردو سافٹ ویئر تیار کرنے والی غیر ملکی کمپنی سے رابطہ کیا اور کسی طرح اردو سافٹ ویئر کی شروعات ہوئی۔ ہندوستانی اردو اخبارات میں سب سے پہلے روزنامہ 'سیاست' اور پاکستانی اخبارات میں 'جنگ' نے اس کا استعمال کیا۔ یہ بیسویں صدی کی نویں دہائی کی بات ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اردو اخبارات ورسائل نے اس سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اب اس طرح نہ صرف اردو انفارمیشن بلکہ تمام زبانوں کی انفارمیشن کا معاملہ جدید ٹکنالوجی سے جڑ گیا ہے۔ ڈاکٹر اصغر علی ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی ضروریات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا موجودہ عہد کے انسان کے لیے آکسیجن کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ایک منٹ کے لیے انٹرنیٹ تعطل کا شکار ہوجائے تو اندازاً اکیس کروڑ پیغامات کی ترسیل جمود کا شکار ہوجائے گی۔ زمینی، فضائی اور سمندری سفر متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اربوں روپے کا کاروباری نقصان ہوگا۔ گویا انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ آج کی روح عصر ہے۔ انٹرنیٹ موجودہ عہد کے دل کی دھڑکن ہے ادھر دل نے دھڑکنا بند کیا اُدھر موت واقع ہوئی''۔

(زبان وادب؛ ششماہی مجلہ؛ شعبہ اردو فیصل آباد پاکستان؛ اشاعت 2016؛ ص 5)

جب کمپیوٹر سامنے آیا تھا تو اس کی زبان فقط انگریزی ہی تھی۔ جس طرح دیگر عالمی زبانوں نے کمپیوٹر سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی اسی طرح اردو بھی کوشش کرتی رہی۔ پہلے رومن رسم الخط میں لوگ اردو کا استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد یونی کوڈ کے استعمال نے انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں کو کمپیوٹر سے جڑنے کا خاصا موقع دیا۔ یہاں تک کہ مائیکرو سافٹ نے اس پر توجہ دی۔ اس حوالے سے ایم مبین لکھتے ہیں:

''اب دنیا کے کسی بھی کمپیوٹر میں نہ صرف دنیا کی کوئی بھی زبان لکھی جاسکتی ہے بلکہ اس کے ویب صفحات آسانی سے اس کمپیوٹر میں کھل سکتے ہیں اور تیار بھی کیے جاسکتے ہیں۔ مائیکرو سافٹ نے اپنے ونڈو کے 2000

جدید ٹکنالوجی سے جڑنے کے بعد کئی سطح پر اردو کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ یو ٹیوب چینلس کے علاوہ بہت سے ایسے واٹس ایپ گروپ ہیں، جن میں اردو کے مسائل پر بات چیت کی جاتی ہے۔ لوگ ان گروپس میں اردو کے متعلق کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ غزلیں، کہانیاں، ناول کے حصے، تبصرے، مراسلے اور نئی نئی رائے کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ ایک سطح پر دیکھا جائے تو یہ چیزیں بہت معمولی ہیں، مگر گہرائی میں جانے سے اندازہ ہوتاہے کہ ٹکنالوجی سے ہر ایک کو بولنے والی زبان مل گئی اور سوچنے والا ذہن۔ کیوں کہ ہر فرد ان سائٹس اور گروپ میں تبادلہ خیال کا حق رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی رائے بھی پیش کرتا ہے۔

کے ورژن میں اس تکنیک کو محفوظ رکھا۔ اور ونڈو کے اس ورژن میں انھوں نے ایسے فونٹ تیار کرڈالے جن سے یونی کوڈ زبان میں تیار کیے گئے کسی بھی صفحات اور فائل آسانی سے کھل جائیں۔ انھوں نے ونڈ وکے ساتھ Arile, Thohama,son shavit, Times roman جیسے ایسے کئی فونٹ دیے جن میں یونی کوڈ کی سہولت موجود ہے۔''

(ایم مبین، اردو اور انٹرنیٹ، مشمولہ اردو میڈیا؛ ترتیب؛ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2012، ص 347)

جدید ٹکنالوجی سے اردو کو جوڑنے میں یونی کوڈ نے اہم کردار ادا کیا۔ کیوں کہ اسی کے سہارے اردو کا استعمال فیس بک، انسٹاگرام، واٹس ایپ، ٹویٹر، ای میل کے علاوہ دیگر سوشل نیٹ ورکس پر بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ آن لائن یونی کوڈ کنورٹر نے بھی اردو کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ ان پیج سے یونی کوڈ اور یونی کوڈ سے ان پیج میں فائل تبدیل کرنے کی سہولت نے اردو کے فروغ کو یقینی بنایا ہے۔ اسی یونی کوڈ کی دین ہے کہ پی ڈی ایف فائل کے علاوہ سافٹ ویئر میں اردو کی کتابیں، خبریں، مضامین اور تقاریر ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اب آپ کو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے استعمال کے لیے کسی اور زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے پورے کمپیوٹر کو اردو میں منتقل کرسکتے ہیں۔ ای میل، چیٹنگ، براؤزنگ سب اردو زبان میں کرسکتے ہیں۔ اردو یونی کوڈ کی ایجاد نے یہ ممکن کردکھایا ہے۔ اب آپ گوگل یا کسی بھی سرچ انجن میں جاکر اردو میں ٹائپ کریں اور اردو میں جوابات حاصل کریں۔''

(اردو میڈیا، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2012، ص 351)

یہ حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ پر اردو کے دائرے کو وسیع کرنے میں یونی کوڈ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو سے ناواقف فرد بھی اردو لکھنے کی کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہوگیا۔ کیوں کہ صوتی لحاظ سے کی بورڈ کا استعمال کرنا آسان ہوگیا ہے۔ فونوٹک کی بورڈ اردو ٹائپنگ میں بہت مددگار ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشل نٹ ورکنگ سائٹس پر بھی اردو کا خاصا مواد موجود ہے۔ جن میں شعروادب سے لے کر صحافتی مواد بہت زیادہ ہیں۔ اسی طرح کمپنیوں اور دیگر تجارتی چیزیں بھی ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب یونی کوڈ کی ایجاد سے ہی ممکن ہوپایا ہے۔

جدید ٹکنالوجی سے جڑنے کے بعد کئی سطح پر اردو کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ یوٹیوب چینلس کے علاوہ بہت سے ایسے واٹس ایپ گروپ ہیں، جن میں اردو کے مسائل پر

بات چیت کی جاتی ہے۔ لوگ ان گروپس میں اردو کے متعلق کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ غزلیں، کہانیاں، ناول کے حصے، تبصرے، مراسلے اور نئی نئی رائے کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ ایک سطح پر دیکھا جائے تو یہ چیزیں بہت معمولی ہیں، مگر گہرائی میں جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹکنالوجی سے ہر ایک کو بولنے والی زبان مل گئی اور سوچنے والا ذہن۔ کیوں کہ ہر فرد ان سائٹس اور گروپ میں تبادلہ خیال کا حق رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی رائے بھی پیش کرتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو نہ صرف زبان فروغ پاتی ہے، بلکہ انسانی ذہن ودماغ کو تقویت ملتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جدید ٹکنالوجی کا استعمال مثبت طریقے سے اردو میں بھی ہورہا ہے۔ بہت سے نیوز پورٹل ہیں۔ ادبی وتخلیقی چیزوں کے لیے بہت سی ویب سائٹس اور بلاگ ہیں۔ ان بلاگ سے بھی اردو کا فروغ ہوا ہے۔ نیوز پورٹل، تخلیقی ویب سائٹس اور بلاگس کی فہرست سازی مقصود نہیں ہے۔ اس لیے سلسلے وار ان کا شمار نہیں کیا جارہا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ نہ صرف برصغیر ہندوپاک میں بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں بہترین افسانہ فورم اور نیوز ویب موجود ہیں۔ اس ضمن میں الگ سے یہ کام کر لیے جائیں تو مزید اردو کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے۔

ملٹی لنگول ویب سائٹس، اگر ایسی ویب سائٹس ہوں گی تو دیگر زبانوں کے سہارے یوزر اردو کی خبریں اور ادبی چیزیں پڑھیں گے۔ اس لیے انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کو مزید وسیع کرنے کے لیے ملٹی لنگول ویب سائٹس کی شروعات ہونی چاہیے۔ اس سے کئی فائدے برآمد ہوں گے۔ اول، زبان کا سلسلہ دراز ہوگا۔ اس کے علاوہ اشتہارات کے مواقع بھی پیدا ہوں گے۔ کیونکہ اشتہار دینے والے جب ملٹی لنگول ویب سائٹ کو اشتہار دیں گے تو اس میں اردو کی شمولیت ہوگی اور اس طرح اردو میں اشتہارات تیار کرنے والے بھی سامنے آئیں گے۔ اس کے علاوہ آن لائن اردو لرننگ پر خاصی توجہ کی ضرورت ہے۔ یوں تو اردو سکھانے کے لیے کئی ویب سائٹس ہیں، مگر ان پر خاطر خواہ مواد ہے اور نہ ہی خاطر خواہ ٹائم دیا جاتا ہے۔ اس لیے ناقص ویب سائٹس سے اردو سکھانا آسان نہیں ہے۔ اس ضمن میں اردو اکادمیوں اور ملک کے نامور اردو ادیبوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

انفارمیشن کے تبادلے میں تراجم کا اہم کردار ہے۔ ظاہر ہے جب اس حوالے سے پیش رفت ہوگی تو انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کا دائرہ وسیع ہوگا۔ تراجم کے سلسلے میں بھی بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عالمی سطح کی بڑی زبانوں کے مترجم تیار کرنے کے لیے اردو کی بڑی بڑی اکادمیوں کو حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔ کیونکہ تراجم کے سہارے گلوبلائزیشن کے دور میں زبانیں فروغ پائیں گی۔ تراجم کے امکانات سے اردو کا مستقبل مربوط ہے۔ کیونکہ اس سے معلومات کا بھی تبادلہ ہوتا ہے اور تہذیب وثقافت کا بھی۔ جس عہد میں ہم جی رہے ہیں، اس عہد کے تقاضے بہت نازک ہیں۔ اگر ان تقاضوں کو نظر انداز کردیا گیا تو زبان کا فروغ بہت آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے اگر اردو کو عالمی سطح پر انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں زندہ رکھنا ہے تو بہت سی حکمت عملیاں بنانا ہوں گی۔

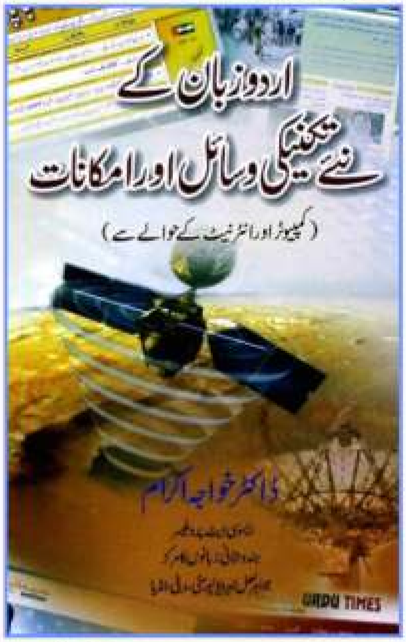

انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کئی سطحوں پر متاثر ہوئی ہے اور اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا ہے۔ یونی کوڈ کے انقلاب کے بعد اردو سیکھنے کا رواج عام ہوا ہے۔ ہمیشہ اردو زبان کے رسم الخط کے متعلق بھی بات ہوئی اور آج بھی ہورہی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو اپنے رسم الخط سے بھی زندہ ہے۔ کیونکہ اس کی ساخت یونی کوڈ کے عہد میں اسے ممتاز بناتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کے رسم الخط میں خود بہ خود کچھ نہ کچھ نیا ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ آج سوشل نیٹ ورک سائٹس پر بے شمار لوگ رومن رسم الخط میں اردو کا استعمال کررہے ہیں۔ ان کے استعمال سے اردو کا فائدہ کسی نہ کسی سطح پر ضرور ہورہا ہے، مگر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اردو رومن استعمال کرنے والے تمام افراد ایک طرح سے رومن اردو لکھ رہے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے کہ ہر ایک کا رومن لکھنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ یہ الگ موضوع ہے کہ آخر ان کے الگ الگ طریقے سے لکھنے سے اردو کا کیا نقصان ہوگا یا بھلا، مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اردو رومن رسم الخط کا سلسلہ جاری ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے عہد میں یہ امکان ہے کہ آئندہ رومن میں اردو لکھنے والوں کا سلسلہ دراز ہوگا۔ اردو کو رومن میں لکھنے کے لیے باضابطہ کوئی کمیٹی تیار نہیں کی گئی، مگر از خود رومن اردو کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس کے شروع ہونے میں ٹکنالوجی کا بھی عمل دخل ہے۔

اس کے علاوہ ٹکنالوجی کے استعمال سے اردو اسلوب بھی متاثر ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ کاغذ پر اردو لکھنے یا کتاب لکھنے والے اپنے متعینہ قاری کو ذہن میں رکھتے ہیں اور اپنے موضوع ومواد پر دھیان دیتے ہیں۔ اس لیے ایسے لکھنے والوں کا اسلوب الگ ہوتا ہے، مگر جب کوئی فرد سوشل سائٹس پر اردو لکھتا ہے تو اس کا اسلوب الگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسیج کو آسان بنانے اور قابل فہم رکھنے کے لیے اپنی زبان میں لچک پیدا کرتا ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کرتا ہے۔ اس طرح اردو اسلوب بھی متاثر ہوا ہے۔ امید ایسی ہی کی جاسکتی ہے کہ آئندہ سوشل نٹ ورکنگ سائٹس استعمال کرنے والوں کا اسلوب اور بھی زیادہ متاثر ہوگا۔ الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ سوشل سائٹس کے ذریعے اردو سے قریب ہونے کے بعد لوگوں میں اردو تہذیب کو جاننے کا شوق بھی پیدا ہوا ہے۔

گلوبلائزیشن کے عہد میں ہر فرد نئی تہذیب جاننے کا شوقین نظر آتا ہے۔ تہذیب کے تئیں لوگوں کو شوقین بنانے میں انفارمیشن ٹکنالوجی کا اہم کردار رہا ہے۔ ظاہر ہے جب عالمی سطح پر اردو کے تئیں لوگ متجسس ہوں گے تو اردو کا دائرہ وسیع ہوگا۔ میڈیا کے حوالے سے بھی لوگ اردو سے قریب ہوں گے۔ ادب اور تہذیب کے حوالوں سے بھی لوگ اردو کی طرف متجسس نظروں کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔ اس صورت حال میں اردو مزید فروغ پائے گی۔ گویا اکیسویں صدی میں اردو کے امکانات بہت ہیں مگر شرط یہ ہے کہ کچھ مثبت ومستحکم طریقے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔

■

Prof. M. J Warsi
Chairman, Dept of Linguistics
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 09 068771999

فروغِ اردو کے لیے ضروری اقدامات

سورج دیو سنگھ

اردو زبان ہندوستان کی صدیوں پرانی جس مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، اسی مشترکہ تہذیب کی وجہ سے ہی اس ملک میں ہندوؤں و مسلمانوں اور سکھوں و عیسائیوں نے مل جل کر اپنے مشترکہ دشمنوں سے نہ صرف زور آزمائی کی بلکہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں بھی سب قوموں نے مل جل کر کاندھے سے کاندھا ملا کر فرنگیوں سے لڑائیاں لڑیں، جس کے باعث ملی جلی تہذیب کی ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ دراصل اردو اسی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی دین ہے۔ اس ضمن میں اقبال اشہر کا یہ کلام ملاحظہ ہو:

اردو ہے میرا نام، میں خسرو کی پہیلی
غالب کا ہوں دیوان اور چکبست کی ہیلی
کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں مانا

صدیوں پہلے ہندوستان میں جس مشترکہ تہذیب کی داغ بیل پڑی تھی اس کو صوفی سنتوں نے نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس کڑی کو تقویت دی اور مزید استحکام بخشا۔ لیکن فرنگیوں نے سب سے پہلے اسی مشترکہ تہذیبی وراثت اور کلچر کو ختم کرنے کی منظم سازشیں کیں۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریزی حکومت کی زبان کی پالیسی کے مرکز میں انگریزی تھی اور اس کی کمیونل پالیسی کے مرکز میں ہندی اور اردو۔ اور بلا وجہ ان دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندی اور اردو میں اختلاف پیدا کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی ان کڑیوں کو ختم کرنے کا کام کیا جنھیں زبان نے جوڑ رکھا تھا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زبان کوئی بھی ہو اور دنیا کے کسی بھی خطے یا علاقے میں لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہو اس کا سب سے اہم کام عوام کو ایک دوسرے سے جوڑنا ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھیں تو ہماری زبان یعنی اردو زبان بھی اپنے ابتدائی دور سے یہی کام کرتی رہی ہے۔ اردو زبان نے ابتدائی دور سے لے کر اب تک جتنا طویل سفر طے کیا ہے، اس میں کئی ایسے مراحل سے اسے گزرنا پڑا ہے جہاں اس نے نہ صرف ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا بلکہ ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کامیابی کے پرچم بھی لہرائے ہیں۔ اس کی انفرادیت اور شیرینی، ہر دلعزیزی اور سرشاری نے ہر کسی کو اپنی طرف نہ صرف متوجہ کیا ہے بلکہ اس سے دل لگانے پر مجبور بھی کیا ہے۔ موجودہ دور میں ہندوستان کی کسی بھی زبان میں اتنی ہمت و حوصلہ اور صلاحیت نہیں کہ وہ اس کے مدِ مقابل کھڑی رہ سکے۔ سابق جسٹس سپریم کورٹ مارکنڈے کاٹجو نے ایک موقع پر کہا تھا کہ 'میں نے مختلف ملکوں کا دورہ کیا ہے اور کئی زبانوں سے میری واقفیت ہے لیکن میں اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی زبان اردو میں جو کشش ہے اور اپنی جانب کھینچنے کی جو قوت ہے وہ دوسری زبانوں میں مفقود ہے۔' باوجود اس کے اردو کی یہ حالت کیوں اور کیسے ہوگئی ہے؟ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آج ہم اس موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں کہ 'اردو کو نئی نسل سے کس طرح زیادہ سے زیادہ مربوط کریں؟' اس تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ اردو اخوت، محبت، ہمدردی اور شیرینی سے بھری ہوئی ہے۔ یہ وہ دلکش زبان ہے جو اظہارِ خیال پر آمادہ ہوئی تو غزل کے قالب میں ڈھل کر ولی، میر، درد، غالب، مومن، اقبال، فیض، فراق اور جوش وغیرہ جیسے اہم شاعروں اور ادیبوں کو پیدا کیا جن کے اردو کلام کے مطالعے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام موضوعات پر جتنی باتیں ہو سکتی ہیں وہ سب کچھ کہی جا چکی ہیں اور آج ان ہی کی کہی گئی باتوں کو دہرایا جا رہا ہے یا از سرِ نو دہرانے کی ضرورت ہے۔

اوپر پیش کردہ تمام باتوں پر غور و فکر کرنے کے بعد اب یہ سوال ہمارے ذہن میں اٹھتا ہے جو لازمی بھی ہے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد مسلسل کم کیوں ہوتی چلی جا رہی ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس زبان کو ایک خاص فرقے اور مذہب بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے؟ اگر ایسا ہے اور اس کے پسِ پردہ کوئی تنگ نظری کام کر رہی ہے تو غالباً اس کثیر المذاہب و کثیر التہذیب (Plural Society) زبان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ بقول شخصے: 'زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔' کسی بھی زبان کو کسی مخصوص فرقے اور مذہب کے ساتھ جوڑ دینا اس کی ترقی کی راہ میں روڑے و رکاوٹ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ زبان اردو سرزمینِ ہند پر پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور پروان چڑھی ہے۔ اس لیے اردو کے ساتھ ناانصافی اس مشترکہ تہذیب پر بھی چوٹ ہے جو ہماری مشترکہ پہچان ہے۔ میرے خیال سے اس منفی مفروضے کا اگر کہیں وجود ہے تو اس کو رد کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

غور کرنے والی بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اردو بولنے والوں کی تعداد لکھنے پڑھنے والوں سے کافی زیادہ ہے۔ لیکن دقت اور پریشانی یہ ہے کہ جو لوگ اردو لکھتے پڑھتے ہیں وہ خود تو لکھتے پڑھتے ہیں لیکن اپنے گھروں میں اپنے بچّوں کو اردو پڑھانے میں نہ تو دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ اردو پڑھنے کے لیے دوسروں کو تلقین کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اپنے بچّوں کو انگریزی، سائنس اور ریاضی جیسے موضوعات ضرور پڑھائیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائیں تاکہ انھیں اردو سے بھی واقفیت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی اگر اردو لکھنے، پڑھنے، جاننے اور سمجھنے کے لیے راغب کرنے کی کوشش کی جائے تو... اردو کی ویسی حالت نہیں رہے گی جیسا کہ آج ہے۔

اردو لکھنے پڑھنے اور اس سے دلچسپی رکھنے والے حضرات میں اردو کے اساتذہ، طلبہ و طالبات کے علاوہ اردو اخبارات کے نمائندے، اردو کی سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کو ایک ایسی کوشش ضرور کرنی چاہیے جس سے اس زبان کو سیدھے طور پر فائدہ پہنچے اور زبان کو عام لوگوں تک پہنچنے میں مدد مل سکے۔ مثلاً اردو اساتذہ اگر چاہیں تو ان حضرات کے لیے جو اردو سے ناواقف ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے ہوں ان کو اردو سیکھنے پر آمادہ کریں اور اس بات کی تردید کریں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ کوئی بھی زبان کسی خاص فرقے یا سماج کی نہیں ہوتی ہے بلکہ زبان کا صرف جغرافیہ ہوتا ہے اور یہ بھی سراسر حقیقت ہے کہ اردو زبان کا جغرافیہ سرزمینِ ہند ہے۔ اسی لیے یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری

ادارے بے حد اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ یہ ادارے اردو سے نابلد لوگوں کو اردو سکھانے کے لیے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسز وغیرہ کا انتظام کر سکتے ہیں۔ جس کی طرف قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کوشاں بھی ہے۔ یقیناً اس سے اردو کے فروغ میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اس ضمن میں اردو ڈائرکٹوریٹ اور بہار اردو اکادمی کے علاوہ دیگر سرگرم اکادمیوں کا بھی بے حد اہم رول رہا ہے۔

حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ سرکاری اداروں اور اسکولوں میں اردو لکھنے پڑھنے والے بچوں کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی چلی جارہی ہے جو ایک تشویشناک مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے ان بچوں کو پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں میں اردو پڑھانے والے خاطر خواہ اساتذہ نہیں ملتے ہیں۔ اگر ان بچوں کو اردو پڑھانے والے اساتذہ مل جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ آگے چل کر اردو کے پڑھنے والے کم نہیں ہوں گے۔ اردو لکھنے پڑھنے والے ابتدائی وثانوی درجوں میں ہی نہیں ہوں گے تو ظاہری بات ہے کہ اعلی تعلیم کے میدان میں اردو کے طلبہ و طالبات کی تعداد یقینی طور پر کم ہوتی چلی جائے گی۔

اب ایسے حالات میں حکومت اور سرکاری تنظیموں کی ذمے داری کافی بڑھ جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں میں اردو کے اساتذہ کی تقرری کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر سرکار، سرکاری ادارے اور نیم سرکاری ادارے اس کام میں تیزی لائیں تو اردو کے پڑھنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد میں اضافہ یقینی طور پر ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں اردو کے اساتذہ اگر چاہیں تو جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ویسے گھروں کے والدین کے ساتھ تبادلۂ خیال کر کے اور اردو کے متعلق ان کی رائے لے کر اس کے فروغ کے متعلق کوئی راستہ نکالنا چاہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی نئی راہ نکل سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو تحریک کے روح رواں سر سید احمد خاں تھے لیکن ان کی اس تحریک کو ملک کے بے شمار ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے بلاتفریق مذہب وملت نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس میں نئی جان بھی پھونکی۔ ہر مذہب وملت کے قلم کاروں نے اپنے اپنے طور پر اس تحریک کو کامیاب بنانے میں بھرپور کوشش کی اور آج بھی اردو ادب کے اساتذہ اور فنکار اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں جن کی کوششوں سے کاروان اردو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

اردو کے فروغ کے لیے ہر دور میں تحریکیں چلائی گئی ہیں۔ اس سلسلے کو پھر سے زندہ کرنے اور استحکام بخشنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کا تحفظ اور فروغ، نئی نسل کی آبیاری میں ہی مضمر ہے۔ نئی نسل اردو سے آشنا ہوگی تبھی اردو کے پڑھنے اور لکھنے کا سلسلہ جاری وساری رہ سکے گا۔ مجھے ذاتی طور پر لگتا ہے کہ نئی نسل میں اردو زبان سے محبت جگانے کے لیے ایک تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ دوسری زبان پڑھنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی پڑھتے رہنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سماج کے ہر فرد تک اپنی آواز کو پہنچانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اردو کی ترقی کے لیے اپنی خدمات کے دائرے کو بڑھانا ہوگا۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی اغراض ومقاصد کے بروئے کار لانے کے لیے، ہر سطح پر اردو کی ترقی کے راستے ہموار کرنے ہوں گے۔ مذکورہ مقاصد کی حصولیابی کے لیے انفرادی طور پر الگ الگ کئی گروپ تشکیل کر کے، انھیں اردو کے فروغ کے لیے کون کون سے نئے اقدامات

> **دنیا کی کسی بھی زبان کو نہ تو کسی ایک مذہب یا قوم کے لوگ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ایک قوم کے چاہنے پر اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ زبانوں کے بننے اور سنورنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں تب جاکر وہ اظہار خیال کے لائق ہوتی ہیں۔ زبان اردو بھی اپنے دور کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی تاکہ یہ خاص و عام کے جذبات و خیالات کی ترجمانی بلا امتیاز مذہب و ملّت کر سکے۔**

اٹھانے ہیں اس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ماہانہ یا سالانہ رپورٹ بھی تیار کرنی ہوگی تاکہ ہمیں یہ بھی اندازہ ہو سکے کہ جو اقدامات کیے گئے ہیں ان سے کیا کیا فائدے ہوئے ہیں؟ اور کون کون سے نئے چیلنجز ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں؟

اس سلسلے میں ہر مہینے اردو کے تعلق سے مختلف قسم کے پروگرام منعقد کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ نئی نسل، بالخصوص جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے انھیں اردو کے پروگرام میں شریک کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اردو ڈائرکٹوریٹ اور بہار اردو اکادمی کا رول قابل تحسین ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو عوام الناس کی زبان ہے اس لیے جب تک عوام، اردو کی محفلوں میں بیٹھ کر نہ صرف اس کی خوبیوں کو جانیں گے بلکہ زبان کے تاریخی پہلوؤں سے بھی اپنی واقفیت کو نہیں بڑھائیں گے تب تک اردو زبان کو خاطر خواہ مواقع فراہم نہیں ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان کے فروغ میں مذہبی رہنماؤں کا بھی بے حد اہم رول ہو سکتا ہے امام صاحبان اپنے ذاتی مفادات سے اوپر اٹھ کر خلوص دل سے نہ صرف عوام بلکہ اردو کی ترقی کے لیے اپنے بچوں اور ساتھ ساتھ مضافات کے اردو سیکھنے کی خواہش رکھنے والے بچوں اور بچیوں کو اردو پڑھنا لکھنا سیکھنے کی طرف راغب کر سکتے ہیں۔

دنیا کی کسی بھی زبان کو نہ تو کسی ایک مذہب یا قوم کے لوگ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ایک قوم کے چاہنے پر اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ زبانوں کے بننے اور سنورنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں تب جاکر وہ اظہار خیال کے لائق ہوتی ہیں۔ زبان اردو بھی اپنے دور کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی تاکہ یہ خاص و عام کے جذبات و خیالات کی ترجمانی بلا امتیاز مذہب وملت کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو، عربی اور فارسی زبان کے قریب ہے اور ان کے اثرات اس زبان پر زیادہ ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے نہایت فراخدلی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان کی ہکاری زبانوں (بھاری آوازوں والی زبانوں) کو گلے لگایا ہے بلکہ دنیا کی بہت ساری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ زبان بہت جلد ہندوستان بھر میں مقبول عام اور ہر دل عزیز بن گئی۔ آج بھی اس زبان کی شاعری بالخصوص صنف غزل اور بول چال کے آداب واطوار صرف ہمارے ملک ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالمگیر سطح پر محبت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ زبان تمام فرقوں، تمام خطوں کی زبان ہے اور اب تو یہ ایک عالمگیر زبان بن گئی ہے۔ بالخصوص بیرون ممالک میں بھی اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ملک کی تقسیم کے بعد بھی تقسیم نہ ہوئی اور آج تک برصغیر بالخصوص ہندوستان میں اپنا لوہا منوا رہی ہے یعنی کہ خالص ہندوستانی زبانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زبان قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نہ صرف ہندوستان کے ہر طبقے، مذہب اور فرقے کی زبان ہے بلکہ قومی یکجہتی کی سب سے بڑی علامت بن کر عالمگیر شہرت ومقبولیت کی حامل بن چکی ہے۔

■

Dr. Suraj Dev Singh
Dept of Urdu, Magadh Mahila College
Patna University
Patna - 800001 (Bihar)
Mob.: 9431808564
Email.: drsurajdsingh@gmail.com

ایم اے کنول جعفری

نئی نسل اور اردو زبان

اردو میں ان دنوں جتنے اخبارات ورسائل شائع ہو رہے ہیں، اس سے قبل اتنی تعداد میں کبھی شائع نہیں ہوئے۔ دارالخلافہ نئی دہلی کے علاوہ ملک کے کئی صوبوں کی راجدھانیوں اور بڑے شہروں سے روزانہ چھپنے والے اخبارات کے علاوہ ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبارات بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔ اردو میں ہر مہینے شائع ہونے والے جرائد کے علاوہ، دوماہی، سہ ماہی اور سالانہ میگزینیں بھی شائع کی جارہی ہیں۔ اردو کی ترقی وترویج کے لیے نہ صرف قومی سطح پر سرکاری رسالے نکالے جا رہے ہیں، بلکہ کئی اردو اکادمیوں سمیت نجی ادبی ادارے بھی اسی طرح سرگرم عمل رہ کر اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اردو کے تعلق سے 'جشنِ اُردو' اور 'مشاعروں' کا انعقاد بھی کیا جارہا ہے۔ دوسری جانب اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو کے فروغ کے نام پر ہونے والی تمام سرگرمیوں کے باوجود نئی نسل میں اردو سے پہلے جیسی نسبت موجود نہیں ہے۔ نئی نسل کے اردو سے لاتعلق ہونے کے معاملے میں اردوداں حضرات دو حصوں میں منقسم ہوگئے ہیں۔ ایک طبقہ جہاں یہ خدشات ظاہر کرنے سے گریز نہیں کررہا ہے کہ مستقبل قریب میں اردو زبان آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گی، وہیں دوسرا گروہ اس بات کو لے کر خاصا مطمئن ہے کہ اُردو زبان کو کسی طرح کا خطرہ لاحق نہیں ہے۔ یہ زبان ہر حال میں زندہ اور تابندہ رہے گی۔ سوال یہ بھی ہے کہ حالات پر دُوررس نظر رکھنے والے اہالیانِ اردو آخر کس طرح اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو کا مستقبل تابناک نہیں ہے۔ اس دلکش زبان کی بقا کو لے کر خود کو ہلکان کرنے والے کئی سنجیدہ لوگ ایسا بھی کہتے سنے جاتے ہیں کہ اردو زبان کا مستقبل اگر پوری طرح تاریک نہیں ہے، تو اسے ماہِ کامل کی طرح روشن بھی نہیں کہا جاسکتا۔

دراصل کسی بھی زبان کی ترقی اور بقا کا انحصار اس زبان کے بولنے، سننے، لکھنے، پڑھنے اور اس کے فروغ میں گہری دلچسپی لینے والوں کی تعداد، جذبہ اور جستجو پر ہوتا ہے۔ کسی زبان کے فروغ کا یہ سلسلہ جب تک قائم ودائم رہتا ہے، تب تک اس زبان کو زوال کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر عوام کسی زبان کا استعمال کم کرتے کرتے اسے ترک کردیں اور نئی نسل کی اس زبان میں دلچسپی باقی نہ رہے، تب اُس زبان کو فنا ہونے میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

پانچ جنوری سے 13 رجنوری 2019 تک دہلی کے پرگتی میدان میں 'معذوروں کے لیے پڑھنے کے سامان' (Readers with special needs) موضوع پر منعقد ہونے والے نو روزہ 27 ویں عالمی کتاب میلے میں اردو کے تئیں لوگوں میں کافی دلچسپی دیکھی گئی تھی۔ میلے میں اردو کتابوں کے مجموعی طور پر لگنے والے 15 اسٹالوں پر اردو کی کتابیں خریدنے والے افراد کی بھیڑ نظر آئی۔ ان میں زبان وادب کی اچھی واقفیت رکھنے والے لوگوں کی تعداد کافی تھی۔ اردو کے تئیں لوگوں کی یہ دلچسپی یقینی طور پر باعث انبساط اور فرحت بخش ہی ہے۔

دوسری جانب اردو کے شائقین میں مرزا غالب، علامہ اقبال، مومن خاں مومن، سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد اور کیف بھوپالی سمیت کئی دیگر پرانے شعرا اور انشاپردازوں میں تو خاصی دلچسپی دیکھی جاتی ہے، لیکن نئے لکھنے والے ادیب وشعرا کی کتابیں نوجوان طبقے کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہ رہی ہیں۔ یہ امر تشویش کا باعث تو ہے ہی، اسے آنے والے وقت کے لیے بھی نیک فال اور اچھا اشارہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات درست ہے کہ کتابیں بے جان ہوتی ہیں، لیکن مطالعے کے بعد یہی کتب سماج اور انسانی ترقی کے لیے نئی راہیں دکھانے میں پیش پیش رہتی ہیں۔ کتابوں سے ہمیں نیک صلاح اور مفید مشورے تو حاصل ہوتے ہی ہیں، ان میں درج کتنی ہی باتیں سبق آموز اور معلومات میں بھی اضافہ کرنے والی ہوتی ہیں۔

کسی بھی زبان کی ترقی وترویج کے لیے لازم ہے کہ اس کے بولنے، سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والے کثیر تعداد

میں ہوں۔ زبان کی تحریری شکل کی شاندار نمائندگی ہی نہ ہو، بلکہ اس کی تمام تر ادبی اصناف کو منظرِ عام پر لانے کے لیے طبع آزمائی بھی ہوتی رہے۔ انگریزی دنیا کی ایک ایسی زبان ہے، جس کی کھڑکی سے پورے عالم کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ کرۂ ارض کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جہاں کسی نہ کسی شکل میں انگریزی الفاظ انسانی زبان سے ادا نہ ہوتے ہوں۔ اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بولنے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہی نہیں، دیگر ممالک میں بھی موجود ہیں۔ ایک زمانہ تھا، جب روزگار کے سلسلے میں سمندر پار کر عرب ممالک میں داخل ہونے والے ہندوستانی خطے کے افراد کے سامنے وہاں کے باشندوں کی مادری زبان 'عربی' گفتگو میں رکاوٹ بن جایا کرتی تھی۔ بات چیت میں اردو زبان کا استعمال کرتے ہی ہر ایک سعودی باشندے کی زبان سے، 'عربی، عربی' کے کلمات نکلا کرتے تھے۔ مطلب صاف تھا کہ وہ صرف اور صرف اپنی مادری زبان 'عربی' میں ہی گفتگو کر اور سمجھ سکتے ہیں۔ کم ہی لوگ اُردو کے علاوہ انگلش بھی بول اور سمجھ سکتے تھے۔ ہند، پاک اور بنگلہ دیش کے لوگ عربی نہیں سمجھتے تھے اور عربی حضرات اردو زبان سے پوری طرح ناواقف تھے۔ خلیجی ممالک میں نوکریاں کرنے والے کام گاروں کے سامنے اپنی بات کہنا اور دوسرے کی سمجھنا بہت ضروری تھا۔ شروع شروع میں دقت آئی، لیکن اشاروں کی مدد سے رفتہ رفتہ روز مرہ کام آنے والے عربی الفاظ سمجھ میں آنے لگے۔ دھیرے دھیرے سعودی شہری بھی اردو کے کافی الفاظ جان گئے۔ یہ بات الگ ہے کہ برصغیر کے عربی اور دینی اداروں سے فارغ عالم اور فاضل کو عربی ممالک میں اس طرح کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

شمالی ہند کے تعلیمی اداروں سے تو اردو کبھی کی غائب ہو چکی ہے۔ کچھ مغربی اور جنوبی صوبوں میں بڑی شان و شوکت سے رائج اُردو کی چمک اب وہاں بھی پھیکی ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ گنے چنے اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ صرف دینی مدارس ہی ایسے ہیں، جو اُردو کے دم توڑتے چراغوں میں اپنا لہو جلا کر اسے تا دیر روشن رکھ سکتے ہیں۔ چونکہ دینی مدرسے عربی کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی دیتے ہیں، اس لیے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اردو کی بقا کی ذمے داری موجودہ زمانہ کے مدرسین، اساتذہ، ادیبوں اور شعرا پر عائد ہے۔ یہ حضرات اپنی ذمے داری کو سمجھ کر عمل پیرا ہوتے رہیں تو اچھا ہے، لیکن جو حقیقت سامنے آ رہی ہے، وہ بہت زیادہ تکلیف دینے والی ہے۔ آج ادیب و شعرا ہی نہیں اردو سے اپنا قدیمی رشتہ جوڑنے کا دعویٰ کرنے والے گھرانوں سے بھی رفتہ رفتہ اردو نکلتی جا رہی ہے۔ انسانی زندگی سے متعلق ہر شعبے میں ٹیسٹ اور امتحاناتی مقابلوں کے درمیان آج کا نوجوان اردو سے کنارہ کش ہوتا جا رہا ہے۔ والدین یا اہلِ خانہ بھی اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو اردو کی طرف راغب کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ حضرات صرف اتنا کہہ کر اپنی ذمے داری سے بری نہیں ہو سکتے کہ انھوں نے تو زندگی بھر اُردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھا، لیکن اگر نئی نسل اردو کے ساتھ جڑے رہنا نہیں چاہتی تو وہ کیا کر سکتے ہیں؟

حالانکہ یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہی جاتی رہی ہے کہ اُردو کسی خاص قوم، فرقہ، علاقہ یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والی اردو وہ زبان ہے جس نے اپنی لطافت، شیرینی اور کشش کی بنا پر مذہب و ملت، ذات برادری اور علاقائی تفریق کے بغیر عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ امیر، غریب، حاکم، محکوم، اعلیٰ، ادنیٰ، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، بودھ اور جینی وغیرہ اردو کے دلدادہ ہی نہیں ہوئے، بلکہ سبھی نے اس کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا ہر ممکن تعاون دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو سرکاری دفاتر، عدلیہ، اسکول و کالج اور دیگر اداروں کی زبان بن گئی۔ اردو پر سبھی کا حق ہے۔ یوں بھی اگر یہ کسی خاص قوم، فرقہ، مذہب اور علاقہ کی زبان ہوتی، تو اس کو اتنی وسعت اور فروغ کبھی نہ ملتا۔ یہ بات الگ ہے کہ کئی پیڑھیوں سے اُردو کو فروغ دینے میں کوشاں کچھ گھرانوں میں اب اردو کے لیے پہلے جیسا ماحول نہیں ہے۔

ہماری پیاری زبان اردو ہی ہے جس نے وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی جنگ میں، 'انقلاب زندہ باد' کا فلک شگاف نعرہ دیا۔ اسی نے حب الوطنی کے ترانے، جوش سے لبریز نظمیں، وطن پرستی کا جذبہ پیدا کرنے والی تحریریں اور ایوانِ فرنگی میں زلزلہ برپا کرنے والی تقریریں دیں۔ یہ بات بے حد تکلیف دہ ہے کہ آزادی کی جنگ میں اہم کردار ادا کرنے والی اردو، آزادی کے بعد حاشیہ پر ڈال دی گئی۔ سرکاری محکموں، دفتروں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں سے بے دخلی کے ساتھ اردو کے تئیں لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ حالانکہ اس زبان کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو افراد اس زبان کو پڑھ لکھ نہیں سکتے، وہ بھی اردو کے کتنے ہی الفاظ بولتے اور سمجھتے دیکھے جاتے ہیں۔ اردو کے تعلق سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ موجودہ دور میں نئی نسل کے طلبا اور طالبات میں اردو کے تئیں دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا رجحان انگریزی کی طرف بڑھا ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ اُردو زبان ختم ہونے کے قریب آ گئی ہے۔ مغربی تہذیب سے متاثر نئی روشنی کے کئی گھرانوں میں اردو کو بھلے ہی وہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہو، جس کی یہ حق دار ہے، لیکن ہندوستان میں پیدا ہوئی اردو کو بیرونِ ممالک میں کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور پسند کیا جا رہا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال پر نظر ڈالنے سے یہ بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے۔

اپنے خیر سگالی دورے پر ہندوستان آئی امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں جنوبی ایشیا کی اردو و ہندی کی ترجمان ہیلینا وہائٹ نے 27/ اکتوبر 2018 کو لکھنؤ میں ایک مشہور اردو اخبار کے صحافی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ہندوستان کے مشترکہ خاندانی نظام، رشتوں کا تقدس، بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کے برتاؤ کی بہت تعریف کی تھی۔ ان کے اردو سے لگاؤ، پیار اور جنون کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسے اپنی جان سے تعبیر کیا۔ خود ان کے الفاظ میں، ''اس زبان سے انھیں پیار ہے۔ اردو میں انگریزی سے بھی زیادہ مافی الضمیر ادا کرنے کی صلاحیت ہے۔ انھوں نے اردو زبان واشنگٹن میں لکھنوی استانی محترمہ فرزانہ اور پاکستانی استانی مونا سے سیکھی ہے۔۔۔ اردو رسم الخط انھیں بہت پسند ہے۔ اسے دیکھنا اور پڑھنا انھیں اچھا لگتا ہے کیونکہ اُردو رسم الخط دیگر زبانوں کے رسم الخط سے مختلف ہے...

قریب انیس برس قبل جودھ پور میں گزرے اَیام کے دوران ہندی سیکھنے والی ہیلینا وہائٹ نے اردو ڈیڑھ دو برس قبل ہی سیکھی ہے، لیکن ان کی بول چال اور تلفظ کی ادائگی سے ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا ہے کہ انھیں اردو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہے۔ اردو کو اپنی جان اور ہندی سے پیار کا کھلے دل سے اقرار کرنے والی ہیلینا وہائٹ کی گفتگو میں انگریزی الفاظ شاذ و نادر ہی استعمال کیے گئے۔ ان کی اُردو دوستی، ہندی اور ہندوستان سے لگاؤ اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان کسی خاص فرقہ اور مذہب کا ثقافتی ورثہ نہیں ہوتی، بلکہ اس کے استعمال کرنے والے افراد کی ملکیت ہوتی ہے۔

ہیلینا کے برعکس اردو گھرانوں سے تعلق رکھنے والے آج کے طلبا و طالبات عام فہم اردو الفاظ کے بجائے انگریزی الفاظ کے استعمال کو ترقی کا زینہ سمجھ رہے ہیں۔ اردو یا کسی دوسری ہندوستانی زبان میں بات کرنا کسرِ شان سمجھا جانے لگا ہے۔ روز مرہ استعمال ہونے والی خورد و نوش کی اشیا کے عام فہم ناموں کی روایت ختم ہوتی جا رہی

ہے۔ سیب کو ایپل، آم کو مین گو، کیلے کو بنانا، تربوز کو واٹر میلن، سنترے کو آرنج، ٹماٹر کو ٹماٹو، آلو کو پٹاٹو، چینی کو شگر، نمک کو سالٹ، چاول کو رائس، دروازہ کو ڈور، گھنٹی کو بیل، باورچی خانہ کو کچن، غسل خانہ کو واش روم، بیت الخلا کو ٹائلیٹ، ہاتھ دھونے کو ہینڈ واش، جوتے کو شوز، فیتے کو لیس، کتاب کو بک، کاپی کو نوٹ بک، بستہ کو بیگ، ناشتہ کو بریک فاسٹ، دوپہر کے کھانے کو لنچ، شام کے کھانے کو ڈنر، کرسی کو چیئر، میز کو ٹیبل، چمچ کو اسپون، ریل گاڑی کو ٹرین، مٹھائی کو سویٹ، دودھ کو ملک، بھینس کے گوشت کو مٹن، گائے کے گوشت کو بیف، مرغ کے گوشت کو چکن اور مچھلی کو فش ہی نہیں کہا جا رہا ہے، بلکہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو چچا کی جگہ انکل، چچی کی جگہ آنٹی، ماں کی جگہ ممی، ابا کی جگہ پاپا یا ڈیڈی، بھائی کی جگہ برودر، بہن کی جگہ سسٹر، دادا کی جگہ گرانڈ فادر اور دادی کی جگہ گرانڈ مدر وغیرہ الفاظ کہلانے پر فخر محسوس کیا جا رہا ہے۔

گھر آنگن کے ماحول پر تیزی سے اثر انداز ہو رہی مغربی تہذیب کی وجہ سے ہمارے بچے شروع سے ہی انگریزی اصطلاحات و لفظیات کی گرفت میں آتے جا رہے ہیں۔ یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں، جب اپنی زبان کا دم بھرتے آئے اردو گھرانوں میں موجودہ بزرگوں کے بعد کی نسل چارپائی، پلنگ، لحاف، روشن دان، آنگن، حویلی، رسوئی، طشتری، قاب، رکابی، پیالہ، پیالی، عطر، قلم، دوات، کاپی، گھڑی، تولیہ، کمرہ، دالان اور صابن جیسے الفاظ اور ان کے معنی سے نابلد ہو جائے گی۔ اس کا ایک نقصان یہ ہوگا کہ اردو کی پاسداری والوں کے درمیان ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، جن کی کثرت آج کل کے مشاعروں اور جشن اردو کے نام سے ہونے والی تقریبات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ زیادہ تر حضرات کے اشعار و مقالات ہندی (دیوناگری رسم الخط) میں لکھے دیکھے جاتے ہیں۔ اس طرح کے ہنگامہ خیز پروگراموں میں زیادہ تر تعداد ان سامعین کی پائی جاتی ہے، جنھیں اردو حرف تہجی کا الف، ب، ت... بھی نہیں آتا۔ یہ لوگ اُردو شعر و شاعری میں موجود کشش کے سبب محض سیر و تفریح کے لیے ایسی محفلوں میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ اُردو کے فروغ اور بقا سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

حالانکہ ہمارے ملک کی خصوصیات میں مختلف زبان ولغت اور تہذیب و تمدن کے اشتراک کی وجہ سے تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد زبان وکلام ہی نہیں بدل جاتے، بودوباش کے طریقوں میں بھی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ صوبے اور علاقائی زبان کے طور پر ڈوگری، میتھلی، بھوجپوری، کنڑ، تیلگو، گجراتی، پنجابی، اڑیا، مراٹھی، تمل، ملیالم، بنگالی، آسامی، میزو، منی پوری، کشمیری، کاشی، ناگا، نیپالی اور کونکانی سمیت کئی دیگر زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ملک کی قومی زبان ہندی ضرور ہے، لیکن رابطے کی زبان اردو ہی ہے۔ اردو کی وسعت اور کشادہ دلی کی وجہ سے ملک کے کسی بھی خطے کا شخص اُردو زبان میں گفتگو کر دوسرے شخص کے سامنے اپنے افکار و خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔ اردو نے لوگوں کے درمیان تعلقات محدود کرنے کی بجائے تجارت، ملازمت، سیاحت، تعلیم و تربیت، تبلیغ و دعوت اور اغراض و مقاصد کی راہوں کو ہموار کر زندگی کی دشواریوں کو ختم کیا ہے۔ کبھی ہندوستانی دفاتر، عدلیہ اور بادشاہی نظام کی زبان رہنے والی اردو نے وطن عزیز کی آزادی میں ہر ممکن تعاون دیا۔ مقررین کی تقاریر کو روانی اور قلم کاروں کی تحریروں کو تیزی دیتے ہوئے مجاہدین کے قلب و جگر میں آزادی کے لیے جان پر کھیلنے کا جذبہ اور شہادت کا جنون پیدا کرنے والی زبان اُردو ہی تھی۔

امیر خسرو، میر امن، بہادر شاہ ظفر، مرزا غالب، میر تقی میر، مولانا محمد باقر، حسرت موہانی، اکبر الہ آبادی، مومن خاں مومن، محمد رفیع سودا، نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی گوہر، منشی پریم چند، بسمل عظیم آبادی، اشفاق اللہ خاں، شبلی نعمانی اور سرسید احمد خان جیسے کتنے ہی ادیب، شاعر، خطیب اور دانشوران نے اپنی شاعری، مضامین، صحافت، تصنیفات اور تقاریر سے ملک و قوم کی رہنمائی کی ہے۔ رتن ناتھ سرشار، تلک چند محروم، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، پنڈت بالمکند عرش ملسیانی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، راجندر سنگھ بیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رام لعل، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، بلونت سنگھ، خوشتر گرامی، فکر تونسوی، پنڈت آنند نرائن ملا، راج نرائن راز وغیرہ کتنے ہی لوگوں نے اپنے خون جگر سے اردو کی آبیاری کی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کچھ لوگ اردو کی ترویج وترقی کے لیے اس کا رسم الخط (فارسی) تبدیل کر دیوناگری کرنے کی وکالت کرتے آ رہے ہیں۔ دوسری جانب آج کل چھپنے والے ہندی اخبارات و جرائد میں اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ دہشت (آتنک)، آفت (آپدا) قحط (اکال)، عدالت (نیایالے)، حادثہ (درگھٹنا)، راہ گیر یا مسافر (یاتری)، کلام (کاویہ)، آغاز (آرمبھ)، نقصان (چھتی)، شہادت (بلی دان)، اعلان (گھوشنا)، حلف نامہ (شپتھ پتر)، درج (انکت)، حیوانیت یا درندگی، (پاشوکتا) ترجیح (پراتھمکتا)، میخانہ (مدرالے)، آزادی (سوتنترتا)، اوزار (اپکرن)، استعمال (پریوگ)، آبادی (جن سنکھیا)، تباہی (وناش)، مریض (روگی)، معصوم (اگیان)، پریشان (وچلت)، شادی (وواہ)، صلاح (منترنا) جرمانہ (دنڈ)، نقدی (روکڑ یا پونجی)، انتظام (ویوستھا)، تعداد (سنکھیا)، اغوا (اپ ہرن)، معاوضہ، اسلحہ (ہتھیار)، شہزادی (راجکماری)، مدنظر (درشٹی گت)، چوکی دار (رکھوالا) اور غریبی (نردھنتا) وغیرہ اردو الفاظ کا خوب استعمال کیا جا رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں اردو کے لفظ 'وبال' کی جگہ 'بوال' اور 'مخالفت' کی جگہ 'خلافت' وغیرہ کئی الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔

یہ بات ذہن نشیں کر لیں کہ ملک میں اردو میڈیم کے تعلیمی ادارے ہی بند نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ ہماری تہذیب و تمدن اور قومی وراثت کے گہوارے بند ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندی اور انگلش میڈیم والے جن اسکول کالجوں میں اُردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے، وہاں اساتذہ اور تعلیمی اکائیوں کا تعلیمی معیار کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا۔ آج کا ماحول مایوسی بھرا ضرور ہے، لیکن ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم، آپ اور تمام محبّ اردو بند ہونے کے قریب پہنچ چکے اداروں کو اپنا سو فیصد تعاون دے کر بچا سکتے ہیں۔ ادارے بچیں گے تو اُردو زندہ رہے گی۔ کسی دوسرے کی جانب دیکھنے کی بجائے ضروری ہے کہ خود سے ہی اس کی شروعات کریں۔ اپنے بچوں کو شروع سے ہی اردو پڑھانے کا ذہن بنا لیں۔ اگر مقابلہ جاتی دور میں انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھانا مجبوری ہی ہے، تو بچوں کو ایسے اسکولوں میں داخل کرائیں، جن میں اُردو مضمون کی تعلیم دی جا رہی ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو بچوں کے لیے کسی ٹیوٹر کا انتظام کر گھر پر ہی اردو کی تعلیم دلوائیں۔ 'بچوں کی دنیا' نئی دہلی، 'بچوں کا ماہنامہ امنگ دہلی'، 'گل بوٹے' ممبئی اور 'باغیچہ' لکھنؤ کی طرز پر ملک میں کتنے ہی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ انھیں لازمی طور پر منگوایا جائے۔ ایسی میگزین پڑھنے سے بچوں میں اردو کے تئیں رغبت پیدا ہوگی۔ وہ اردو سیکھنے کے ساتھ اوپری درجات میں اپنی تعلیم ہی مکمل نہیں کر سکتے، بلکہ دیگر زمروں کے ٹیسٹوں میں شامل ہو کر اعلیٰ افسران بننے میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

■

M. A. 'Kanwal' Jafri
127/2, Jama Masjid
Neendru, Tehsil Dhampur
Distt: Bijor - 246761 (UP)
Mob.:9917767622

فرحت نادر رضوی

مشترکہ ہندوستانی قومی فضا اور چکبست کی شاعری

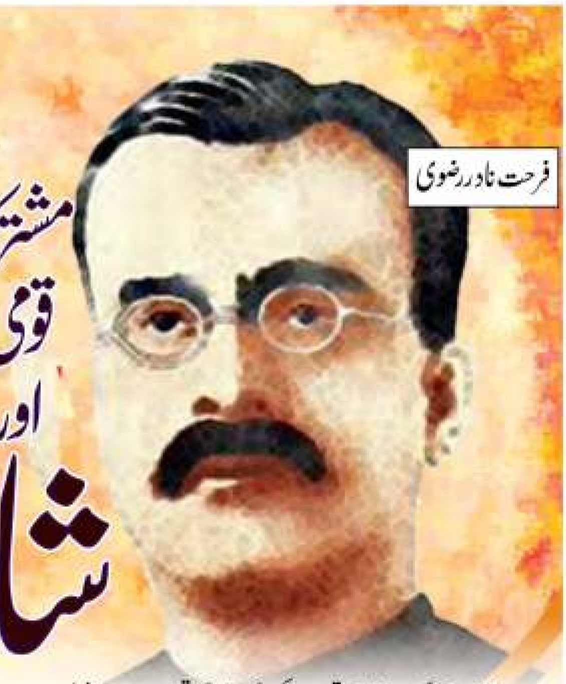

مشترکہ دکھ سکھ اور مشترکہ تجربات کسی بھی قوم کی تعمیر وتشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہندوستانی اقوام کی ہفت رنگ قومی تہذیبی اور تاریخی اساس سرزمین ہندوستان کے قومی تشخص کی بنیاد ہے۔ اس ملک کی ہمہ جہت قومی مذہبی روایات، رسم ورواج اور ثقافتی مزاج نے اقوام عالم کے درمیان ہندوستان کو نہ صرف ایک ممتاز مقام بخشا ہے، بلکہ اسے دیگر خطۂ زمین کے بالمقابل ایک انفرادی شان بھی عطا کی ہے۔

یہ نیرنگی خواہ مذاہب وعقیدے کی کثرت کے سبب پیدا ہوئی ہو، یا تہذیبی وتمدنی بوقلمونی کے سبب، یا تکثیر السنۂ ہند کے نتیجہ میں، یا پھر تہذیب ومعاشرت کے دھنک رنگوں کی کہکشاں کے سبب، بہرحال یہ اپنے اندر رنگ ونور کی ایک ایسی دلکش آمیزش کی حامل رہی ہے جس نے ہمیشہ بصارتوں کو متوجہ کیا ہے، اور ذوق نظارہ کو فہمائش شوق بخشی ہے۔

یہ وہ سرزمین رہی ہے جس کے نغمات کی لہروں نے ہر دور کی رگوں میں رواں سرخ سیال کی گردشوں کو تیز تر کیا اور جنون شوق کی چنگاریوں کو اسی سرزمین کی ہوائے شوق نے بھڑکا کر شرارہ کیا ہے۔ جب جب مطربہ فکر کی مضراب ہنر اس دوشیزۂ بزم رنگ ونور کے تار جاں سے الجھی ہے، بڑے سحر انگیز اور جانفزا نغمے بیدار کیے ہیں، جن کی بازگشت نے ادب وشاعری کا ایک جہان آباد کیا۔ یہ کیسی راگ راگنیاں تھیں جن کی لے پہ دوشیزۂ تہذیب، اپنی دھنک رنگ اوڑھنی لہرا کر بیتابانہ رقص کرتی رہی، سر گونجتے رہے، تار جاں الجھتے اور سلجھتے رہے، نقش جلتے رہے، عکس بنتے رہے، ہر تخریب نے تعمیر کی بنیادیں فراہم کیں، اور ہر تعمیر میں نشاۃ ثانیہ کا پیغام ملتا رہا۔ عناصر میں ربط واعتدال قائم ہوا، خم گیسوئے ہستی سلجھے، پھر الجھے..... پریشان ہوئے، صفحۂ ہستی پر ہندوستانی ادب وشاعری نے گزرتے وقتوں کے نشان اپنے انداز میں قائم کیے اور تاریخ وطن مرتب ہوتی چلی گئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ پریوں کے اس دیش کو، اس اندر سبھا کو، اس کے تمام نقوش جانفزا کو، اور اس کے نغمہائے شیریں نوا کو سننے اور دیکھنے، سات سمندر پار سے بھی اہل دل اور صاحبان ذوق آنے لگے۔ ظاہر ہے یہ نیرنگی حیات اور بوقلمونی فکر وخیالات کوئی معمولی واقعہ تو نہ تھی کہ دور دراز کے دلوں کو تو مسخر کر لے مگر وطن عزیز کی مٹی سے پھوٹنے والی فنی کونپلوں میں اپنے رنگ نہ بھرے۔ چنانچہ فن کی تمام جہتیں نہ صرف اس نیرنگی سے متاثر ہوئیں، بلکہ خود ہی اس نیرنگی کی ترجمان بھی بن گئیں۔ چنانچہ مصوروں کے موئے قلم نے کبھی صفحۂ قرطاس پر مولسری، چمپا اور سرسوں کے رنگ بکھیرے، اور جب ادیب وشعرائے ہندی نے اس حسن صد انداز کو پیراہن الفاظ عطا کیا تو کہیں خسرو کے نغمے گونجے، کہیں نظیر کی بانسری نے تان اڑائی، کہیں جوش کے یہاں حسن ورعنائی کے پیکر جہاں تاب مجسم ہوئے، کہیں اقبال کے یہاں بانگ درا اور صور اسرافیل کی صورت کاروان شوق کو مہمیز سفر عطا کی اور کہیں چکبست کے یہاں قومی وطنی جذبات کی ترجمان بنی، اور فغان ناقوس اور صدائے اذان کی صورت تسخیر قلوب کرتی رہی۔ مگر صورت خواہ کچھ ہو نتیجہ بہر صورت ایک ہی نکلا یعنی

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
(غالب)

اس حسن کی زیبائی کہیں چھپ نہ سکی۔ سرزمین ہندوستان جہاں کشت تصوف بارآور ہوئی، جہاں کی پرسکون فضا میں تفکر وتفلسف کے شجر بالیدہ ہوئے، جہاں نانک اور چشتی نے محبت کے نغمے گائے، اور حق اور وحدت کی بنیاد استوار کی، جہاں کی نیرنگی میں بھی ایک باطنی یکرنگی پوشیدہ رہی، جہاں قدیم ہندوستانی فلسفہ 'ایکو ہم دوتیو ناستی' کا پیغام پیش کرتا رہا اور جہاں اہالیان تصوف نے فلسفہ 'وحدت الوجود' پیش کیا، یعنی خواہ مذاہب ہوں یا فنون لطیفہ، یا فلسفہ وحکمت، ہر جگہ نیرنگی میں ایک باطنی یک رنگی کا وجود لازم نظر آیا، ہر رنگ کے پس پردہ اسی ایک حسن مستور کی جھلک محسوس کی گئی، اور ظہور عالم ذات کو فقط ہجوم صد صفات سے تعبیر کیا گیا اسی فضا میں ایک سب سے شوخ اور واضح رنگ جو ابھر کے سامنے آیا وہ 'رنگ عشق' تھا۔ یہ رنگ عشق ہندوستانی تہذیب وثقافت کا بھی رنگ تھا، مذاہب وادیان کا بھی رنگ تھا، بلکہ یوں کہا جائے کہ ہندوستانی حیات کا اصل رنگ نمو یہی ایک رنگ تھا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ جب یہ رنگ بکھرا تو کہیں دھان کے کھیتوں میں سبزہ لہلہایا، کہیں بسنت رنگ سرسوں پھولی، کہیں راگ ملہار کی تانیں گونجیں، کہیں برہا کا گداز ابھرا، کہیں آلھا اور کجری کی دھنیں جاگیں، غرض ایک طلسم پیدا ہوا کہ ذہنوں کو اسیر کر لیا اور جب یہ طلسم رنگ و بو سمٹا تو ایک لفظ میں سمایا، اور وہ ایک لفظ تھا 'ہندوستان' چکبست اسی ہندوستان کے عشق کے نغمات گاتے رہے 44 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت طلب کرنے والے اس شاعر کی شناخت اس کی قومی اور وطنی شاعری کے حوالے سے کی جاتی رہی ہے۔

چکبست کا زمانہ سیاسی بیداریوں کا زمانہ تھا 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے شکست کھانے والے ہندوستانی وطن پرستوں کے جذبے ایک بار پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو رہے تھے۔ سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی فضا پر بھی اصلاحی رجحان غالب نظر آ رہا تھا۔ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کی تصانیف وتقاریر پر مقصدیت کا غلبہ تھا۔ قومی وطنی جذبات کی گونج ادب وشاعری کی فضا میں ہر طرف موجود تھی۔ اقبال کی شاعری کی ابتدا ہی وطن پرستی سے ہوئی، ظاہر ہے کہ اس فضا میں حب وطنی اور قومی جذبات سے چکبست کی شاعری کا فروغ پانا عین فطری تھا۔ خاک ہند، ہمارا وطن، وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک، یہ ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں چکبست کے وطنی جذبات براہ راست ابھرے ہیں۔ جبکہ ان کی دیگر سیاسی نظموں میں بھی ان کے وطنی اور قومی جذبات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جب 1915 میں ہوم رول کی مانگ ہندوستانیوں کی طرف سے انگریزی حکومت کے سامنے پیش کی گئی تو شاعر کا دل ایک بہتر مستقبل کی تمنا سے لبریز ہو کر کہہ اٹھا۔

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

آوازۂ قوم، ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا، وطن کا راگ وغیرہ ان کی وہ سیاسی نظمیں ہیں جن سے ان کی

قومی وطنی شاعری کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے۔ وطنیت اور قومیت کا یہی احساس ان کے یہاں قوم کے رہنماؤں کے لیے عقیدت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مسز اینی بسنت سے بھی ان کی عقیدت کا سبب مسز اینی بیسنٹ کی پر اعتدال اور غیر متعصبانہ روش تھی، وہ مذہبی نقطۂ نظر سے امت آدم کے مابین تفریق کے سخت خلاف تھیں 'مسز اینی بیسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیام وفا' کے نام سے جو نظم 1917 میں انھوں نے لکھی اس سے یہ بات ظاہر ہے۔

داستاں دین کی دنیا کو سنائی تو نے
مذہبی بیر کی بنیاد مٹائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے
راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے
کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دنیا میں اجالا ہوتا

اپریل 1916 کو مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول کی تجویز پیش کی، یہ تجویز ہندوستانیوں کے روشن مستقبل کی بشارت محسوس کی گئی، چکبست نے اس سلسلے میں مسز اینی بیسنٹ کی آواز سے اپنی آواز ملائی۔

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

اور۔

وطن کے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

اتحاد قومی کے جذبات مذہب کے دائرۂ محدود سے نکل کر وطن کی آزاد فضاؤں میں پروان چڑھتے نظر آتے ہیں۔

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دلکش سے حظ اٹھائے ہوئے
کہیں ہیں نغمۂ ناقوس دل لبھائے ہوئے
اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکم پیر مغاں کا ہے نشۂ مئے میں
یہ راگ آکے ملیں ہوم رول کی لے میں

ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا دراصل ان کی ایک سیاسی نظم ہے مگر مشترکہ قومی جذبات یہاں بھی موجزن ہیں۔

اہل وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلی
جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالہ
ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

(دسمبر 1916 کو کانگریس کے اجلاس میں پڑھی گئی)

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی نے جو تحریک شروع کی

> **آوازئہ قوم، ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا، وطن کا راگ وغیرہ ان کی وہ سیاسی نظمیں ہیں جن سے ان کی قومی وطنی شاعری کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے۔ وطنیت اور قومیت کا یہی احساس ان کے یہاں قوم کے رہنماؤں کے لیے عقیدت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔**

اس کی بازگشت بھی نہایت عقید تمندی کے ساتھ چکبست کی شاعری میں ابھری۔ یہ وہ شاعری تھی جہاں گذشتہ شعری استعارے نئی معنویت اور مفہوم کا پیراہن پہنے نظر آئے۔ عشق، وفا، جفا، جیسے موضوعات نئے مفہوم اور نئے جوش وخروش کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھلے، علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

'وفا و جفا کا مفہوم بدل گیا تھا، حسن و عشق کے معنی تبدیل ہوگئے تھے۔ جنون شوق عقل سیاسی کا آئینہ دار ہو گیا۔ غزل میں ایک نئی معاشی اور سیاسی معنویت پیدا ہوئی، اور اس کا سہرا یقیناً حسرت، جوہر اور چکبست کے سر ہے' (اردو میں قومی شاعری کے سو سال، ص 55)

چکبست کے دل میں قوم کے رہنماؤں کے لیے غیر معمولی عقیدت نظر آتی ہے، جس کے تحت انھوں نے کئی نظمیں اور شخصی مرثیے بھی لکھے۔ مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

مرثیہ بال گنگا دھر تلک۔

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عام ترا
نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا
یاد کرکے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

بشن نرائن در کی موت پر بھی روح شاعر ماتم کناں نظر آتی ہے۔

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے
حسن اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مٹی جاتی ہے
ہم مٹے جاتے ہیں تقدیر مٹی جاتی ہے

دل مایوس محبت کا عزا خانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں ویرانہ ہے

اقبال نرائن کا مرثیہ۔

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے ثروت کا
جسے روتی ہے دنیا وہ ہے جوہر آدمیت کا
مآل زندگی ہے لاش پر آنسو محبت کا
دعائے خیر مرنے پر صلہ ہے حسن خدمت کا
سفر اس روح کا بھی طے ہو رحمت کے اجالے میں
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

شاعر کو صرف وطن ہی نہیں اہل وطن بھی اسی قدر عزیز ہیں، اس کا دل وطن عزیز کے خدمت گاروں کے لیے جیسے عقیدت مندانہ جذبات سے لبریز ہے ویسے ہی پرتاثیر پیرایۂ اظہار میں ڈھلا ہے۔ ان شخصی مرثیوں میں لفظوں کی نشست و برخاست ہمیں مراثی انیس کی فضا یاد دلا دیتی ہے۔ خصوصاً ان کی مذہبی نظموں میں مشترکہ قومی عناصر کی آمیزش بہت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نظمیں کرشن کنہیا اور رامائن کا ایک سین، اس نقطۂ نظر سے اردو شاعری کا اہم اثاثہ ہیں جہاں بات اگرچہ ہندو مذہبی پیشواؤں کی ہو رہی ہے مگر نظم کا مجموعی مزاج اس مشترکہ تہذیبی ماحول کا عکاس ہے، جس میں ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اشتراک رکھتے ہیں، ان نظموں میں بھی مراثی انیس کی فضا زندہ ہوئی ہے۔

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا کوئی بشر نہیں تصویر سنگ ہے

اس نظم کے متعلق علی جواد زیدی بہت درست لکھتے ہیں۔

'اس نظم کا تعلق اگرچہ ایک مذہب کے ماننے والوں سے ہے، لیکن حق بات یہ ہے کہ کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والا اسے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، دراصل اس میں انسانی احساسات کی صداقتوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے'

(اردو شاعری کی گیارہ آوازیں، ص 49)

میر انیس سے چکبست کی گہری ذہنی وابستگی ان کی شاعری سے چھلکی پڑتی ہے، لفظوں کے در و بست اور نشست و برخاست میں وہی اہتمام یہاں بھی نظر آتا ہے جو مراثی انیس کو ایک منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ یہاں بھی بلند انسانی اقدار بالکل اسی انداز میں پیش کی گئی ہیں جس کا اہتمام مراثی انیس میں کیا جاتا رہا اور جس کی بنیاد پر حالی نے دیگر اصناف سخن کے بالمقابل اردو مرثیوں کی

عظمت کا اعتراف کیا۔ یعنی مشترکہ تہذیبی وثقافتی اقدار اور اصلاحی تحریکات دونوں ہی شعرا کے یہاں دو مختلف حوالوں کے تحت یکساں اہمیت کے ساتھ موجود ہیں اور ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ واقعات کے تانے بانے اور تفاوت زمانی ومکانی کے باوجود فکری اساس ہمارے شعرا کے مابین مشترک ہے۔ اور یہی بات انھیں ایک ربط داخلی بھی عطا کرتی ہے۔ چکبست کو غالباً انھیں اصلاحی کاوشوں کی بنیاد پر حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے، چند اشعار، مختلف نظموں سے، یہاں پیش ہیں۔

روح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے
پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر
وہی بسمل، وہی جوہر، وہی شمشیر بھی ہے
شعلہ و شمع وہی ہے وہی دلگیر بھی ہے
خود مصور ہے وہی اور وہی تصویر بھی ہے
وہی حاکم، وہی قیدی، وہی زنجیر بھی ہے
جوہری بھی ہے وہی جوہر عالی بھی وہی
پھول بھی وہ ہی ہے اس باغ کا مالی بھی وہی

اقبال کی طرح چکبست نے بھی وطن کی محبت میں سرشار ہوکر یہاں کی فضائے صدصفات کے حسن جہاں تاب کا بیان کیا ہے۔ سیر دہرہ دون سے ماخوذ ان اشعار میں جنگلی، خودرو جھاڑیوں کی باس، تازہ ہوا کی لطافت، اور پاک وصاف چشمۂ آب کی نمی آپ بھی محسوس کرسکتے ہیں۔

گھنے درخت، بڑی جھاڑیاں، زمیں شاداب
لطیف وسرد ہوا، پاک و صاف چشمہ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

آصف الدولہ کا امام باڑہ سے چند اشعار دیکھیے۔

وہ سپیدی سحر نور کی ہلکی ہلکی
آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
ایسے عالم میں وہ کہرے سے ابھرنا اس کا
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز

ہندوستان کی وہ مشترکہ قومی فضا، جہاں تمام مذاہب کے لیے نہ صرف احترام، بلکہ محبت کے جذبات بالیدہ ہوئے، چکبست کی شاعری میں بڑی قوت کے ساتھ ابھرتی ہے۔

شاعر کا ذہن دراصل ایک آئینہ خانہ ہے جہاں موجودات ومظاہر اپنی صورت اصلی سے بھی کچھ زیادہ دلکش شکل اختیار کرلیتے ہیں، موضوع خواہ کچھ بھی ہو، جب پیکر شعری میں ڈھلتا ہے تو اس کی ارضیت آفاقیت سے متبدل ہوکر ہمہ گیر ہوجاتی ہے، اور اس کے پیکر مادی میں لطافت حسن کچھ اس طرح سرایت کرجاتی ہے کہ مجرد خیالات اور خشک موضوعات بھی شان دلبری کے حامل نظر

آتے ہیں، آوازۂ قوم اگرچہ سیاسی نظم ہے مگر ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کے عکس نے چکبست کے قلم سے یہاں بھی صفحۂ قرطاس پر قوس قزح اتار دی ہے۔

رقیب کہتے ہیں رنگ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت، نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو
تمام رنگ میں بس ایک نور پیدا ہو

شاعر کا آہوئے دل، رمیدۂ دشت شوق ہوتا ہے، تو وہ لبوں سے وطن عزیز کے لیے عقیدتوں کے گہر روتا نظر آتا ہے۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے حسن نور ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب وزینت کیا اوج کیا نشاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

جولان گاہ ہستی کے عناصر ترکیبی کے درمیان مذہب ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، شاعر کی فلسفیانہ وسیع المشربی مذہب کو تقاضائے آدمیت کی تکمیل اور حقوق بشریت کی ادائیگی کی صورت میں دیکھتی ہے۔

مردہ ہے، رواں روح ہوگر جسم بشر سے
کانٹا ہے جدا ہو جو نزاکت گل تر سے
ہے مثل خزف دور صفا ہو جو گہر سے
آئینہ بیتاب اترتا ہے نظر سے
مذہب بجز اخلاق روا ہو نہیں سکتا
معنی سے کبھی لفظ جدا ہو نہیں سکتا

وسیع القلبی اور وسعت نظر ہندوستان کی مٹی کی خاص صفت ہے، یہی ہندوستان کا اصلی فلسفۂ حیات بھی ہے یہی وجہ تھی کہ خواہ عرب ہوں یا آریائی یا پھر ترک وافغان اس مٹی نے سب کو اپنی آغوش عاطفت میں کچھ اس طرح پناہ دی کہ آنے والے اسی کے ہوکر رہ گئے۔ اس کے نتیجے میں سرزمین ہندوستان ایسی مقدس تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی اساس کی حامل بن گئی جس میں تمام ترنیرنگیوں کے باوجود ایک داخلی یکرنگی بھی تھی، جس کا سبب وہ باطنی رشتۂ الفت تھا جس نے ان الگ الگ تہذیبوں کے موتیوں کو محبت کے ایک ہی دھاگے میں گوندھ لیا تھا، چنانچہ اس نیرنگی کی تکمیل عشق قرار پائی، لہٰذا اب فنون لطیفہ کی خواہ کوئی بھی صورت ہو، اس میں عشق کی کارفرمائی وجلوہ گری لازمی ٹھہری۔ ایسی صورت میں فن کو بالعموم اور ہندوستانی فنون کو بالخصوص جذبۂ عشق سے بے خبری کے عالم میں نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کی تفہیم وتشریح کے لیے واردات قلبی سے گزرنا لازمی ہوگا، خواہ ذہنی سطح پر ہی کیوں نہ ہو، خواہ شب ماہتاب میں تاج کا عکس برآب ہو، یا تان سین کے نغمات کی لے ہو یا آستانۂ نظام الدین کی چوکھٹ کا راز نہانی ہو یا خسرو کے کلام عاشقانہ کے اسرار کی تلاش ہو، گاندھی کے قلب شفیق کی حکمت کو سمجھنا ہو یا اپنی ہیئت کے جذبہ حب الوطنی کا ادراک حاصل کرنا ہو، یا پھر چکبست کے قومی ووطنی اشعار کی تفہیم کرنی ہو۔ تنقید وتبصرے کا حق بغیر عشق کے، بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوئے ادا نہیں ہوسکتا۔

ممکن ہے کہ اقبال کی طرح چکبست کے یہاں کوئی منضبط فلسفہ یا کوئی مسلسل نظام فکر موجود نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے یہاں بعض مقامات پر فنی تراش خراش کے فقدان کا احساس ہوتا ہو، مگر ان کی شاعری میں ہر مقام پر ایک پرخلوص، ایک بے لوث جذبۂ بیتابانہ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اس جذبے کو وطن پرستی، حب الوطنی، جذبۂ اصلاح اہل وطن جو چاہیں کہہ لیں، نام کچھ بھی دیں، جذبہ بس ایک ہے اور قوی ترین ہے، اور وہ جذبہ ہے تمنائے ارتقائے اہل وطن جو ہر صورت ان کی شاعری میں موجزن نظر آتا ہے۔

ان کے لہجے کے زیروبم میں ہم کبھی اقبال کی بانگ درا اور صور سرافیل کی گونج سن سکتے ہیں، حالی کے خلوص اور قلب گداز کی تپش محسوس کرسکتے ہیں، کبھی نظیر کی سادگی اظہار کا درک کرسکتے ہیں اور کبھی ان انگنت رنگوں کے درمیان خود شاعر کا وہ انفرادی انداز بھی دیکھ سکتے ہیں جو اس کے صرف ایک شعر سے اسے شاعری کی دنیا میں لافانی بنا سکتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

■

Dr. Farhat Nadir Rizvi
M-114, Abul Fazal Enclave-1
Jamia Nagar, New Delhi-110025

رضوان الحق

آگرہ بازار کے آئینہ میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور شاعری

نظیر اکبرآبادی عوام کے شاعر تھے اور وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب عوام کی کوئی سماجی، تہذیبی تاریخی وسیاسی حیثیت نہ تھی۔ سب کچھ بادشاہ اور اشرافیہ کے لیے تھا، اس لیے اس زمانے میں نظیر اکبرآبادی کی کوئی شناخت نہ بن سکی۔ انھیں اس زمانے کے تذکروں اور تہذیبی تاریخوں میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ تبدیل ہوا اور عوام الناس کی اہمیت بڑھی، نظیر اکبرآبادی کی حیثیت بھی بدلتی گئی، پہلے حاشیے میں ان کا ذکر شروع ہوا، پھر مرکزی دھارے میں آئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ احتشام حسین کی 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں نظیر اکبرآبادی اردو کے واحد ایسے شاعر ٹھہرے جن پر ایک علیحدہ باب لکھا گیا، میر و غالب پر بھی علیحدہ باب کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ اس طرح تنقید نے نظیر اکبرآبادی کی قدر و قیمت کے تعین میں انتہا پسندی سے ہی کام لیا ہے، چاہے وہ ان کی حمایت کرنے والے ہوں یا ان کو نظر کرنے والے ہوں۔

یوں تو نظیر اکبرآبادی کا ذکر 1936 سے پہلے بھی ہونے لگا تھا لیکن ترقی پسند تحریک نے نظیر اکبرآبادی کی معنویت کو سب سے زیادہ قبول ومقبول کیا۔ اسی سلسلے میں 1954 میں حبیب تنویر نے نظیر اکبرآبادی کی حیات و شاعری پر ایک ایسا ڈراما اسٹیج کیا، جس نے نہ صرف نظیر اکبرآبادی کو غیر معمولی شہرت دلائی بلکہ خود حبیب تنویر ہندستانی ڈرامے کی دو ہزار سالہ تاریخ میں ایک روشن باب بن کر ابھرے اور یہ ڈراما ہندستان کی سرزمین پر اب تک کھیلے گئے چند بہترین ڈراموں میں شمار ہونے لگا۔ جنھوں نے یہ ڈراما صرف پڑھا ہے دیکھا نہیں ہے، وہ اس ڈرامے کی عظمت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے ہیں۔ ڈراما کے مقام کا تعین اسٹیج کیے گئے ڈرامے سے ہی ہوتا ہے۔ شائع شدہ متن سے نہیں۔ میں نے بھی جب تک اسے دیکھا نہیں تھا، صرف پڑھا تھا تب تک اسے اتنا عظیم ڈراما نہیں سمجھتا تھا۔ نظیر اکبرآبادی کو ان کی شاعری کے بعد جس ایک چیز نے سب سے زیادہ مقبول کیا، وہ حبیب تنویر کا ڈراما آگرہ بازار ہے بلکہ اردو کے ادبی حلقے سے باہر اگر آج لوگ نظیر اکبرآبادی کو جانتے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کی وجہ تخلیق کے سلسلے میں حبیب تنویر نے آگرہ بازار کے دیباچے میں لکھا ہے۔

''اطہر پرویز کا ٹیلی فون آیا کہ ۱۴ مارچ کو جامعہ ملیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین، جامعہ ملیہ کی طرف سے یوم نظیر منایا جا رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ میں اس سلسلے میں نظیر پر ایک ڈراما تیار کرادوں۔''[1]

یہ بات 1954 کی ہے، جب اس ڈرامے کی داغ بیل پڑی، یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں سے آزادی ملے چند ہی برس ہوئے تھے اور عوام الناس کے خواب اور امنگیں جواں تھیں۔ حبیب تنویر اپنے زمانے کی نبض کو صحیح سے سمجھ رہے تھے۔ اس ڈرامے میں وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل کے ایک شاعر اور اس کی شاعری کی بات کر رہے تھے۔ لیکن اس کے ذریعے وہ اپنے زمانے کے جذبات کی عکاسی بھی کر رہے تھے۔ اس سے قبل ہندستانی تاریخ و تہذیب میں کبھی بھی کسی ککڑی بیچنے والے کو، کسی لڈو بیچنے والے کو، کسی تربوز بیچنے والے کو، کسی پان بیچنے والے کو اور کسی مداری کا تماشا دکھانے والے کو وہ اہمیت نہیں ملی تھی جو آگرہ بازار میں ملی، نظیر اکبرآبادی نے ان لوگوں کو اہمیت دی تھی لیکن خود انھیں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حبیب تنویر اپنے وقت کے ساتھ چل رہے تھے اور نظیر اکبرآبادی اپنے وقت سے بہت پہلے آگئے تھے۔ اگر یہ ڈراما آزادی سے قبل یا ترقی پسند تحریک شروع ہونے سے قبل لکھا گیا ہوتا تو یقیناً یہ اپنی موجودہ شکل میں نہ ہو کر کسی اور شکل میں ہوتا اور نہ اس ڈرامے کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا جس طرح اسے لیا گیا۔

اب اگر اس ڈرامے کا جائزہ لیا جائے تو اس جائزے کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور دوم اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری۔ میں پہلے اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت پر بات کرنا چاہوں گا اس کے بعد ان کی شاعری پر۔ لیکن سب سے پہلے ہم اپنے زمانے کے ایک شاعر احمد محفوظ کا ایک شعر پڑھنا چاہوں گا، جو اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ شعر اس طرح ہے۔

کہاں ہوتے جو ہم موجود ہوتے
نہ ہونا ہی تو ہے ہونا ہمارا

اس پورے ڈرامے کے دوران نظیر اکبرآبادی اسٹیج پر نظر نہیں آتے ہیں، لیکن اسٹیج پر موجود تمام کرداروں کے حواس پر وہ کچھ اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ہر جگہ نظیر ہی نظیر محسوس ہوتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کو مرکز میں رکھ کر اور جشن نظیر منانے کے لیے تیار کیے گئے ڈرامے میں پورے ڈرامے کے دوران خود نظیر کا اسٹیج پر نہ آنا اپنے آپ میں ایک حیرانی کی بات ہے، سوال اٹھتا ہے حبیب تنویر نے ایسا کیوں کیا؟ اس سلسلے میں حبیب تنویر رقم طراز ہیں:

''مطالعے کے دوران نظیر کے کلام سے میری دلچسپی تو ضرور بڑھتی چلی گئی لیکن ساتھ ہی ڈراما لکھنے کے سلسلے میں میری الجھنیں بھی بڑھ گئیں۔ میں ڈرامے کی کشمکش کی تلاش میں تھا، نظیر کے حالات زندگی معلوم کر رہا تھا۔ اور ان کے حالات کی تصدیق و تحقیق کے لیے سندیں ڈھونڈ رہا تھا کہ مجھے یکا یک اردو شاعری کی تاریخ کا سب سے بڑا ڈراما مل گیا۔''[2]

حبیب تنویر اردو شاعری کی تاریخ کے اس بڑے ڈرامے کی وضاحت کرتے ہوئے آگرہ بازار کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ نظیر اکبرآبادی کا نام کسی ناقد یا تذکرہ نویس نے ان کی تقریباً سو سالہ زندگی میں کسی نے نہیں لیا اور ان کے انتقال کے سو سال بعد تک بھی کسی نے اس شاعر کا ذکر نہیں کیا لیکن عوام نے اسے زندہ رکھا اور اس کی نظمیں سینہ بہ سینہ چلتی رہیں۔ ان کی نظمیں فقیر اور درویش شمال سے جنوب تک گاتے رہے۔ نظیر اکبرآبادی کی زندگی اور شاعری کا یہی سب سے بڑا ڈراما ہے اور تاریخ ادب کا سب سے دلچسپ باب۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ نظیر کے حالات زندگی معلوم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہی ڈرامے کے حق میں رحمت بن گئیں، ڈرامے کی تکنیک اور موضوع کے تعین میں یہ بات معاون ثابت ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ادبی تاریخوں نے نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے حالات درج نہیں کیے۔ شاعری بھی کتابوں میں محفوظ نہ ہو سکی، لیکن عوام نے ان کی شاعری کو اپنے سینوں میں بسا لیا اور اسے زندہ رکھا۔ جب مستند حالات زندگی ہی نہ معلوم ہوں تو اور کیا کیا جا سکتا تھا؟ یہی وجہ بنی کہ پورے ڈرامے میں کہیں بھی نظیر اکبرآبادی کو اسٹیج پر نہیں لایا گیا۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اس ڈرامے سے نظیر اکبرآبادی کی شخصیت کس طرح ابھرتی ہے؟ اسے ڈرامے کی ہی چند مثالوں کے ذریعے نمایاں کیا جائے گا۔ اس ڈرامے کا ایک اہم کردار تذکرہ نویس نظیر اکبرآبادی کی شخصیت کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے۔

''بھئی، بہت باغ و بہار آدمی ہیں۔ خوش مزاج شگفتہ افتاد، ہر شخص سے ہنس کر ملنے والا، کسی کا دل نہ دکھانے والا، ایسا کہ شاید جس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ لیکن شاعری آں چیز دیگر است''۔ فحش کلامی، ہرزہ گوئی، ابتذال اور عامیانہ مذاق کی تکبندی کو ہم نے شعر نہیں مانا۔ میاں نظیر کو شاعر ماننا ان پر بہت بڑا بہتان ہوگا۔ شعرا کے تذکرے میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔''[3]

ایسا نہیں ہے کہ اس ڈرامے میں سبھی لوگ نظیر اکبرآبادی کی شخصیت کے قائل ہی ہوں اور سب ان کی تعریف ہی کرتے ہوں، تذکرہ نویس دنیاوی معاملوں میں ایک معتدل شخص ہے، اگرچہ شاعری کے معاملے میں وہ اپنا ایک مخصوص مذاق رکھتا ہے اور اس پیمانے پر نظیر پورے نہیں اترتے لیکن بطور انسان وہ اس کی عزت کرتے ہیں۔ آگے پتنگ والا جب یہ کہتا ہے ''میں گیا تھا میاں نظیر کے ساتھ تیراکی کا میلا دیکھنے۔''[4] پتنگ والے کی یہ بات سن کر اس سے چند قدموں کی دوری پر اپنی دکان پر بیٹھا کتاب والا اپنے دوستوں سے کہتا ہے۔ ''سن لیا حضور، میاں نظیر دریا کنارے نیم عریاں پریوں کا تماشا دیکھنے گئے تھے، پیری میں بھی وہی عالم ہے۔''[5] اس مکالمے سے واضح ہے کہ کتاب والا نظیر اکبرآبادی کی کردار کشی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک سیدھی سادی سی بات کا کہ میاں نظیر جمنا پر ہونے والا پیراکی کا تماشا دیکھنے گئے تھے، یہ فعل آگرہ کی عوامی زندگی کا بہت اہم جز ہے لیکن کتاب والا نظیر اکبرآبادی کے اس فعل کو نیم عریاں پریوں کا تماشا دیکھنے سے تعبیر کرتا ہے، وہ بھی ان کی پیری کے زمانے میں۔

اس ڈرامے میں پتنگ والا دراصل ایک ایسا شخص ہے جو نہ صرف نظیر اکبرآبادی کا معتقد ہے بلکہ دوست بھی ہے، جو آگرہ کی عوامی سرگرمیوں میں نظیر اکبرآبادی کے ساتھ شامل رہتا ہے۔ وہ نظیر اکبرآبادی کی شخصیت سے متعلق ایک قصہ یوں بیان کرتا ہے۔

''میاں نظیر نے ایک چابک جو اس کو رسید کی تو وہ منظور حسین کو لگتی ہوئی ٹٹو کو لگی۔ میاں نظیر ٹٹو سے اتر پڑے زبردستی ان کے ہاتھ میں چابک دے کر کہا۔ میاں میرے بھی ایک جڑ دو، انھوں نے بہت منت کی، وہ نہ مانے۔ آخر مجبوراً منظور حسین نے چابک لے کر ذرا سا ان کے چھوا دیا اور دوڑے ہوئے میرے پاس آئے۔ مجھ سے سارا حال بتایا اور گھر جا کر پڑ رہے۔ دو دن تک کھانا پینا سب موقوف۔ جب میاں نظیر نے میری زبانی یہ حال سنا تو بے چین ہو کر ان کے پاس گئے۔ انھیں اپنے گھر لے گئے، خاطر تواضع کی۔ ان کے ساتھ ہولی کھیلی، مٹھائی کھلائی، اپنی نظمیں سنائیں۔''[6]

اس واقعے سے ظاہر کہ نظیر اکبرآبادی کس قدر انصاف پسند ہیں اور اگر غلطی سے بھی کوئی بری بات ہو جائے تو اس کا پورا انصاف چاہتے ہیں، صرف زبانی معافی پر اکتفا نہیں کرتے۔ نظیر کی شخصیت سے متعلق ایک اور واقعہ بہ زبان نظیر کی نواسی سنیے۔

''میں بتاؤں! ہمارے نانا پیسے کو ہاتھ نہیں لگاتے، جیسے ہم کو اماں کہتی ہیں نا کہ گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے ویسے ہی۔''[7]

دراصل نظیر اکبرآبادی اپنی ذاتی زندگی میں ایک صوفی صفت انسان تھے اگرچہ وہ گدی نشین صوفی نہیں ہیں، شہر کی تمام سرگرمیوں میں پوری دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں لیکن صوفیہ کی اس صفت کو پورے اعتقاد کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ پیسے کو ہاتھ نہ لگانے کی طریقت کو پتنگ والا اس طرح بیان کرتا ہے۔

پتنگ والا: روپیوں کی تھیلی لیے نواب سعادت علی خاں کے پاس سے آدمی آیا۔ رات بھر روپیہ گھر میں پڑا رہا اور روپے کی وجہ سے میاں نظیر کو نیند نہ آئی، صبح کو جواب میں کہلا بھیجا کہ ذرا سے تعلق سے تو یہ حال ہے، اگر زندگی بھر کا ساتھ ہو گیا تو نہ جانے کیا ہوگا۔ بلاوے بہت آئے، پر میرا یار آگرے سے نہ ٹلا۔ ہر بار یہ کہہ کر ٹال گیا کہ میں ماشے بھر کا قلم چلانے والا، میری کیا مجال! بس یہیں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا دیکھ لی۔ کہتے ہیں۔

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب [8]

اس ڈرامے میں نہ صرف نظیر کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے بلکہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ کیسے لباس پہنتے ہیں، ان کی شکل و صورت کیسی ہے ان سب کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر آج کے تناظر میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت دیکھیں تو ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جمہوری اقدار میں یقین رکھتے ہیں۔ بقول پتنگ والا ''میاں نظیر کی نگاہ میں آدمی آدمی میں کوئی فرق نہیں۔ وہ پتنگ بنانے والا ہو، چاہے کتاب بیچنے والا، ان کے لیے تو بس آدمی ہے۔''[9] نظیر کی یہی وہ فکر تھی جس کی وجہ سے تاریخ ادب میں نظر انداز کر دیے جانے کے باوجود، عوام نے انھیں اپنے سینے میں بسائے رکھا۔

نظیر اکبرآبادی نے خود اپنی شخصیت کے بارے میں ایک نظم کہی تھی، اس میں وہ اپنے بارے کئی اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج ہم جس تصویر کو نظیر اکبرآبادی کی تصویر سے پہچانتے ہیں، دراصل وہ ان کی نظم کو پیش نظر رکھ کر کسی مصور نے بنائی تھی۔ ان کی کوئی اصل تصویر موجود نہیں ہے، اس وقت کیمرا تو وجود میں ہی نہیں آیا تھا۔ آیئے اب وہ نظم ملاحظہ فرماتے ہیں۔

کہتے ہیں جس کو نظیر سنیے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلم، غریب، بزدل، و ترسندہ جاں
سست روش، پستہ قد، سانولہ ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا، قد کے موافق عیاں
ماتھے پہ اک خال تھا، چھوٹا سا مسے کے طور

تھا وہ پڑا آن کر، ابروؤں کے درمیاں
وضع سبق اس کی تھی، تس پہ نہ رکھتا تھا ریش
مونچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنباں سال
پیری میں جیسی کہ تھی کہ اس کو دل افسردگی
ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں
فضل سے اللہ نے اس کو دیا عمر بھر
عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

آگرہ بازار میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری:

اب ہم آگرہ بازار میں نظیر کی شاعری پر بات کریں گے۔ اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے دو پہلو ہیں اول وہ جو ان کی شاعری پر اس کے کردار بات کرتے ہیں، یہی اس ڈرامے کا مرکزی خیال ہے اور دوم وہ شاعری جو اس ڈرامے میں استعمال ہوئی ہے، ان کی شاعری کی عظمت کی دلیل کے طور پر بھی اور نظیر اکبرآبادی کے پیغام کے طور پر بھی۔

اس ڈرامے میں جب پہلی بار نظیر اکبرآبادی کا ذکر ہوتا ہے وہ ذکر کتاب والے اور ایک شاعر کے درمیان کا مکالمہ ہے۔

''کتاب والا: میاں نظیر کے ایک شاگرد حال ہی میں میرے پاس آئے، ان کی ایک نظم کو لے کر کہ کیا میں اسے اپنے رسوخ سے شائع کروا سکتا ہوں۔ اب بھلا بتائیے، کون پڑھے گا میاں نظیر کا کلام؟

شاعر: صاحب، ایک زمانہ آنے والا ہے کہ یہی بازاری چیزیں چلیں گی۔ ہولی یا دیوالی پر کچھ تکبندی کر لیجیے، علم و فضل کی معراج پر پہنچ جائیے گا۔ یہ تو ذوق کا عالم ہے آج کل۔ ابھی ابھی یہ ککڑی والا میرے پاس دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا: 'صاحب، میری ککڑی پر نظم لکھ دیجیے'۔''[10]

یہ مکالمے اس وقت کے اشرافیہ کی ذہنی کیفیت اور ان کے شعری رویے کا اشاریہ ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ نظیر کا کلام پڑھنے لائق نہیں ہے اور ان کے شاگرد اسے شائع کروانا چاہتے ہیں، اس لیے کتاب والا نظیر کی شاعری کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہولی دیوالی پر قافیہ پیمائی کہتے ہیں۔ لیکن شاعر آنے والے وقت کو بھی سمجھ رہا ہے اور کہتا ہے کہ آنے والے زمانے میں یہی چیزیں چلیں گی، اس صورت حال کو وہ زوال سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن آج یہ حقیقت زوال کی نشانی نہیں بلکہ سماجی مساوات کی جدوجہد ہے۔

شاعری اور موسیقی ڈرامے کا ایک لازمی حصہ ہمیشہ سے رہی ہے، چاہے ہم عالمی سطح پر کسی زبان کی بات کریں یا اردو ڈرامے کی روایت کو دیکھیں۔ آگرہ بازار سے قبل جو ڈرامے کھیلے جا رہے تھے چاہے وہ پارسی تھیٹر ہو یا اپٹا اور دیگر اداروں کے ذریعے کھیلے جا رہے ڈرامے ہوں۔ ان سب میں موسیقی اور شاعری زیادہ تر ڈرامے کی زیبائش کے لیے استعمال ہوتی تھی، وہ ڈرامے کا داخلی حصہ نہیں بن پاتی تھی۔ آگرہ بازار کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے شاعری اور موسیقی کو ڈرامے کا داخلی حصہ بنا لیا ہے۔ ان کے بغیر اس ڈرامے کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم یہ ڈراما دیکھتے نہیں بلکہ کتاب میں پڑھتے ہیں، تو موسیقی اور شاعری کا وہ جادو نہیں ابھر پاتا ہے، جو اس ڈرامے کا سب سے بڑا کمال ہے۔

ڈراما شہر آشوب سے شروع ہوتا ہے اور مشہور نظم آدمی نامہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ڈراما تقریباً دو درجن نظموں، غزلوں اور متفرق اشعار پر مبنی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آگرہ بازار میں نظیر اکبرآبادی کی جو شاعری استعمال ہوئی ہے وہ کوئی بڑا روحانی تجربہ تو نہیں ہے لیکن روزمرہ زندگی میں اس کی افادیت بکثرت موجود ہے۔ اس میں ہر جگہ ایک رجائی پہلو ہے اور اس میں غیر معمولی طور پر زندگی کی تمام گہما گہمی موجود ہے۔ یہ شاعری آگرہ کے بازار کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں نہ جانے کتنے ایسے لفظ استعمال ہوئے ہیں، جو نہ کبھی اس سے قبل اردو شاعری میں استعمال ہوئے تھے اور نہ بعد میں استعمال ہوئے۔ لیکن وہ الفاظ آج بھی روزمرہ زندگی میں سننے کو مل جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں نظیر کی شاعری کے متعلق کس طرح کی گفتگو ہوتی ہے اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔

''تذکرہ نویس: سنیے میر اسی زمین میں کہتے ہیں۔

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرچشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالہ

اور یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ چھالا کا قافیہ باندھا ہے۔

گذرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے میرے پاؤں کا چھالا

شاعر: بے شک اس قافیے میں انشاء کا شعر بھی خوب ہے۔ فرماتے ہیں

اتنا تو پھرا وادیٔ وحشت میں کہ میرے
ہے پائے نظر میں بھی پڑا اشک کا چھالا

ہم جولی: لیکن صاحب نظیر کا شعر بھی اپنی جگہ لطف سے خالی نہیں ہے کہ

صحرا میں میرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا''[11]

اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی نظمیں شہر آشوب، روٹی، مفلسی، خوشامد، مدح گرونانک، بلدیو جی کا میلا، برتن والا، جنم آشٹمی، چوہا، طوائف کی گائی غزل، اور پیسا پہلے باب میں ہیں جب کہ دوسرے باب کی شروعات بنجارہ نامہ سے ہوتی ہے یہ نظم پہلی دفعہ جب یہ ڈراما کھیلا گیا تو نہیں تھی لیکن بعد میں ان نظموں کو خصوصی طور سے شامل کیا گیا، جو نظیر کی نمائندہ نظمیں ہو سکتی ہیں۔ بنجارہ نامہ کے بعد جو نظمیں ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے۔ نظیر کی ایک غزل ہے جو حمید گاتا ہے۔ اس کے بعد پیراکی، اس کے بعد ایک نابینا فقیر کی دعائیہ نظم ہے۔ اس کے بعد ریچھ کا بچہ، ککڑی، تربوز، لڈو نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں ڈرامے کا بہت اہم حصہ ہیں۔ اس ڈرامے کا اختتام جس نظم سے ہوتا ہے، وہی اس ڈرامے کا پیام بھی ہے اور نظیر کی شاعری اور حیات کا بھی، یہ نظم ہے آدمی نامہ۔ چونکہ ان میں بیشتر نظمیں لوگوں کی پڑھی سنی ہوئی ہیں، اس لیے صرف آدمی نامہ کے ساتھ میں اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں۔

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حوالہ جات:

☆ حبیب تنویر نے لکھا ہے، اردو میں شائع آگرہ بازار، پرانا متن ہے، جب کہ اس کے بعد کافی ترمیم اضافہ کیا جا چکا ہے۔ اس لیے میں نے اس ہر جگہ قول دیوناگری اشاعت سے لیا ہے۔

1. حبیب تنویر، آگرہ بازار، وانی پرکاشن، نئی دہلی۔ 2010، ص 5 (ہندی رسم الخط میں)
2. ایضاً، ص 5,6
3. ایضاً، ص 75
4. ایضاً، ص 85
5. ایضاً، ص 86
6. ایضاً، ص 95
7. ایضاً، ص 99,100
8. ایضاً، ص 100
9. ایضاً، ص 101
10. ایضاً، ص 70,71
11. ایضاً، ص 89

■

Dr. Rizvanul Haque,
Assistant Professor, Urdu,
Regional Institute of Education,
Shyamla Hills, Bhopal-462013 (MPO)
Mob09479438340
E-mail rizvanul@yahoo.com

غضنفر اقبال

دکن کا نیرِ سخن

احسن یوسف زئی

دکن صدیوں کی تاریخ کا آئینہ ہے۔ سلاطین اور علمائے ربانی دکن کے صورت گراں اور معماران ہیں۔ ثقافت، تمدنی میراث اور رواداری اس عجوبۂ روزگار دکن کے امین ہیں۔ دکن میں شعری روایت گہری ہے۔ کئی دبستانِ شعر نے دکن کو خراج دیا ہے۔ بہ قول علامہ اقبال۔

نور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمین
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک گر پائے فشار

دکن دیس کے شہر گلبرگہ کے تعلقہ الند میں محبوب خان یوسف زئی و بادشاہ خانم کے گھر عبدالستار خان احسن یوسف زئی نے 4 رفروری 1932 کو آنکھ کھولی۔ احسن کی سات بہنیں اور تین بھائی تھے۔ ان کے والد ناظرِ تعلیمات تھے۔ الند کے بعد وہ بیڑ میں برسرِ کار رہے۔ محبوب خان یوسف زئی شعر گوئی کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے بعض اشعار بیڑ سے قریب آبشار سوتاڑا کے دیواروں پر کندہ ہیں۔ ان کی ناگہانی موت سے احسن کو خاندان کی کفالت کی ذمے داری اُٹھانی پڑی۔ انھوں نے یہ ذمے داری بہ حسن وخوبی نبھائی۔ انھوں نے بھائی اور بہنوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش پیٹ کی اولاد کی طرح کی۔ احسن یوسف زئی نے اپنی کتاب 'خمیرِ خاک زندگی' (1984) کا انتساب اپنے مرحوم والدین کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا:

''والدِ مرحوم محبوب خان یوسف زئی اور والدہ مرحومہ کے نام، جنھوں نے گھنے پیڑوں کی طرح ہمیں چھاؤں میں رکھا اور خود چلچلاتی دھوپوں کا زہر پیتے رہے۔ اور جن کی مفارقت کے بعد ہی پتا چلا کہ زندگی تو جلتا ہوا سورج ہے۔''

(بہ حوالہ: کتاب خمیر خاک زندگی۔ احسن یوسف زئی، ص:03)

احسن کے میٹرک الند ضلع گلبرگہ سے کامیاب کرنے کے بعد اُن کا خاندان بیڑ کی طرف مراجعت کر گیا تھا۔ اورنگ آباد دکن کے کالج میں جماعتِ یازدہم میں داخلہ لیا تھا۔ وہ گھاٹی ہاسٹل میں قیام پذیر تھے۔ اس ہاسٹل کے منتظم مولوی یعقوب عثمانی (1914-1978) تھے۔ وہ بہ سلسلۂ ملازمت لکھنؤ سے اورنگ آباد دکن آئے اور اسی خاک کا حصہ ہوگئے۔ انھوں نے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی پرورش اعلیٰ اقدار پر کی تھی۔ احسن، یعقوب عثمانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اورنگ آباد دکن میں 1963 میں احسن نے علمی وادبی تنظیم 'بزمِ احسن' کی بنیاد رکھی۔ بزمِ احسن سے سکندر علی وجد، قاضی سلیم، بشر نواز اور قمر اقبال وابستہ تھے۔ احسن نے شاعری کی ابتدا قطعات نگاری سے کی تھی۔ بعد میں وہ غزل کی طرف راغب ہوئے۔ عروض وقافیہ کے ماہر تھے۔ استادانہ قابلیت رکھتے تھے۔ اگر چہ ان کی بی اے میں ہی تعلیم ادھوری رہ گئی اسی ادھوری تعلیم نے احسن کو اولین شعری مجموعہ 'تہہ دریا' (1980) کا فکر انگیز انتساب ''اس روشنی کے نام جس کے بغیر آدمی انسان نہیں بنتا'' لکھوایا۔

احسن یوسف زئی کا تقرر کلکٹر آفس بیڑ میں بہ طور ٹائپسٹ ہوا۔ وہ رحلت کے وقت نائب تحصیلدار تھے۔ انھوں نے بے عیب وبے داغ ملازمت کی تھی۔ ہر خاص وعام میں احسن مقبول تھے۔ ان کی غزل خوانی منفرد اور ان کا دلکش ترنم مشاعروں کی کامیابی کا ضمانت دار تھا۔ احسن نے صلے اور ستائش کی تمنا کے بغیر اپنا ادبی سفر طے کیا۔ ان کا بائیں بازو پر جھکاؤ تھا۔ نماز روزے اور تمام ظواہرِ دین کے پابند تھے۔ والی بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے شہرت بھی پائی تھی۔ فلم بینی سے شغف تھا۔ خود بھی فلم شوق سے دیکھتے اوروں کو بھی دیکھنے پر مائل کرتے۔ احسن نے بیڑ کے ادب وشعر کو گرمایا تھا۔ اقبال (1978) اور مولانا آزاد (1988) صد سالہ تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بیڑ کی مشہور ''آپ کا'' ہوٹل فن کاروں کا مرجع ہوا کرتی تھی۔ احسن یوسف زئی بے لوث انسان اور علمی وجاہت کا پیکر تھے۔ انھوں نے نجی زندگی

احسن یوسف زئی سنجیدہ اور با مذاق شاعر تھے۔ان کا کلام ملک کے جرائد میں اشاعت پذیر ہوا کرتا تھا۔ احسن کے دو شعری مجموعے'تہہ دریا' (1980) اور 'خمیر خاک زندگی' (1984)ان کی حین حیات شائع ہوئے۔ بعد ازمرگ اہلیہ احسن نے شعری مجموعہ آب رواں' (1990) کی اشاعت کی تھی۔احسن یوسف زئی کی کتابیں 'تہہ دریا' اور'خمیر خاک زندگی' پر مہاراشٹر اُردو اکاڈمی ممبئی کے انعام بھی ملے۔مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی جانب سے احسن کو مشہور شاعر قاضی سلیم کے ہاتھوں 7/فروری 1983 کو شعری خدمات کے اعتراف میں تہنیت پیش کی گئی۔

کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔اپنوں سے بے غرض محبت اور گہرے تعلق خاطر کی وجہ سے احسن نے اپنا گھر تاخیر سے بسایا۔ان کا عقد نکاح شیخ عبدالقادر مرحوم کی صاحب زادی صفیہ سلطانہ سے 14/مارچ 1966 کو بیڑ میں انجام پایا تھا۔ان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

احسن یوسف زئی سنجیدہ اور بامذاق شاعر تھے۔ان کا کلام ملک کے جرائد میں اشاعت پذیر ہوا کرتا تھا۔ احسن کے دوشعری مجموعے'تہہ دریا' (1980) اور'خمیر خاک زندگی' (1984)ان کی حین حیات شائع ہوئے۔ بعدازمرگ اہلیہ احسن نے شعری مجموعہ'آب رواں' (1990) کی اشاعت کی تھی۔احسن یوسف زئی کی کتابیں'تہہ دریا' اور'خمیر خاک زندگی' پرمہاراشٹر اُردو اکاڈمی ممبئی کے انعام بھی ملے۔مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی جانب سے احسن کو مشہور شاعر قاضی سلیم کے ہاتھوں 7/فروری 1983 کو شعری خدمات کے اعتراف میں تہنیت پیش کی گئی۔

احسن یوسف زئی کے مزاج میں رکھ رکھاؤ اور اگلے زمانے کی تہذیب دیکھی جاسکتی تھی۔وہ ادبی منافقت سے دور تھے۔سگریٹ نوشی کثرت سے کیا کرتے۔اسی علت نے احسن کومختلف عوارض میں مبتلا کردیا۔انھوں نے مختصر بحر کا انتخاب اپنی سخن وری کے لیے کیا تھا۔شومی قسمت کہ ان کی زندگی بھی مختصر بحر ثابت ہوئی۔6/مارچ 1988 کی رات میں چھپن برس میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ 7/مارچ 1988 کو احاطۂ درگاہ حضرت شہنشاہ ولیؒ بیڑ میں سپرد خاک کیے گئے۔راقم تحریر کی آنکھوں نے دیکھا بیڑ کے اہل اُردو احسن کے غم میں سیاہ پوش ہوئے۔تعلیمی اداروں کوتعطیل دی گئی۔احسن نے وفات سے دوچار دن قبل دو شعر کہے تھے جوان کی ڈائری کے صفحات پر درج تھے۔

خدا کی شان ہے کیا آدمی ہے
بھری بستی میں تنہا آدمی ہے
اونچی اُڑان لاتا کیا سوچ کر پرندہ
لاتا کہاں سے منظر اپنی نظر پرندہ

احسن کے سانحہ انتقال کے بعد اورنگ آباد دکن کا کثیر الاشاعت روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز نے 8/مارچ 1988 کا شمارہ شاعرِ دکن کے نام سے منسوب کیا تھااوراحسن کی خواہر زادی ڈاکٹر حسینی کوثر سلطانہ نے کتاب'بزم احسن' (2010) ترتیب دی ہے۔راقم تحریر نے دکن کے منتخب شعرا کی غزلوں کا انتخاب 'کلام تجھ لب کا' (2019) مرتب کیا تھا۔اس کتاب کا آغاز کلام احسن سے ہوا ہے۔ نوجوان تحقیق کار وادیب علیم الدین علیم نے اپنی کتاب 'تذکرۂ شعرائے مراٹھواڑہ' (2019) میں احسن کا ذکرِ جمیل بطریق احسن کیا۔احسن کی وفات حسرت آیات پر پروفیسر شاہ حسین نہری نے 188اشعار پر مبنی مرثیہ قلم بند کیا تھا۔چند ابیات مرثیہ ملاحظہ کیجیے۔

وہ سبھی کے دلوں کی دھڑکن تھا
سینہ سینہ اسے بسا دیکھو
اپنی شعروں میں سانس لیتا ہے
وہ غزل میں سما گیا دیکھو
وہ دھڑکتا رہے گا سینوں میں
زندہ احسن ہے اپنی غزلوں میں

احسن یوسف زئی تجربہ پسند شاعر تھے۔ان کے کلام میں استادانہ شان تھی۔احسن کی غزل آبِ رواں کی مانند بہتی چلی جاتی تھی کیوں کہ وہ خمیر خاک زندگی سے اٹھی ہے اور شعبۂ غزل میں تہہ دریا بن چکی ہے۔ان کی غزل میں قدیم وجدید شعری لوازمات اور افکار موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نئے تجربے کیے ہیں۔مگر یہ تجربے غزل کے دائرے میں رہ کر کیے گئے ہیں۔یعنی ان کی غزل اپنی روایت سے انحراف نہیں کرتی بلکہ روایت کے سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔احسن یوسف زئی کی غزل ایک مہذب اور عزت دار انسان سے روشناس کراتی ہے۔ جودل ودماغ کوایک ساتھ متاثر کرتی ہے۔

جسم و جاں کا رشتہ کائنات کا ورثہ
تو ازل کا آئینہ میں ابد کی حیرانی
شب رنگ پرندے رگ وریشے میں اتر جائیں
کہسار اگر میری جگہ ہوں تو بکھر جائیں
مٹھیوں میں بند ہیں مٹی کے خواب
زندگی کا زخم پیشانی میں ہے

احسن یوسف زئی پختہ مشق شاعر تھے۔ان کا شعری تجربہ اور تخلیقی عمل بالکل جداگانہ تھا۔انھوں نے فنی جگر کاوی سے اپنی شعری دنیا الگ بسائی تھی۔اپنے تخلیقی عمل کے سلسلے میں احسن کا احساس تھا:

''شعر سے میرا تعلق بڑا بے لوث ہے۔اسی وجہ سے شاید میرے اندرون میرے اپنے سے مہابھارت ہوتی رہتی ہے کہ آخر شعر کی تمھیں ضرورت کیا ہے؟ سب کی طرح سب کے درمیان رہتا ہوں۔میرے اطراف بلاواسطہ بالواسطہ دھڑکتی سوچتی، بولتی، سنتی کائنات پھیلی ہوتی ہے۔اس کائنات میں انگنت سانسوں کی حرارت ہے۔بے شمار دھڑکنوں کی بازگشت ہے۔صدیوں صدیوں کے تجربے،احساسات جبلتیں،فطرتیں،افکار زندگی کی قوس قزح کے تمام رنگ ہر ہر قدم پر ہر ہر سطح، ہر ہر روپ

میں بکھرے ہوئے ہیں۔ان میں اپنی زندگی جیتے ہوئے جب ذات عروج کائنات سے دوچار ہوتی ہے تو صورتِ حال تخلیقی اظہار کا موجب بنتی ہے۔"

(بہ حوالہ: کتاب بزم احسن۔مرتبہ: ڈاکٹر حسینی کوثر سلطانہ،ص:111)

بالائی سطور میں شاعر نے اپنے تخلیقی عمل پر قلب آسا اور چشم کشا جملے زیبِ قرطاس کیے ہیں۔شاعر کا اپنا جہانِ معنی ہے جس سے وہ بلیغ فکر اور اظہار خیال کی دل کشی کے ساتھ حسنِ بیان کو شعری اعتبار عطا کرتا ہے۔ احسن کی اثر انگیز شاعری میں فنی جمالیات کا جہان بھی ان کے جمال پرست ہونے کی گواہی دیتا ہے۔شاعر نے اپنے کلام میں نیرنگ سے جدت پسندی کی عمدہ مثال قائم کی ہے۔اسی لیے ان کی شاعری تصنع اور آورد کے بجائے آمد کا اعلان نامہ ہے۔

کس نام سے پہچانوں
ہر نام تمھارا ہے
تمھارا ساتھ جس قدر
یہ پرتپاک زندگی
میری آنکھوں میں کہاں ہیں آنسو
جگنوؤں میں اُجالے ان کے
چنبیلی کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ترا نام میری دعاؤں میں ہے
تیری پلکوں پہ کب سے ٹھہرا ہوں
میرے ہونٹوں کا قرض لوٹا دے

احسن کی شعری جہات میں مختصر بحر کا اہتمام ملتا ہے۔مختصر بحر میں اچھے اور سچے شعر کہنا غیر معمولی تخلیقی عمل ہے۔ احسن نے مختصر ترین بحروں کا انتخاب کرکے سہل ممتنع کو زمین کی وسعت اور آسمان کی رفعت عطا کی ہے۔ انھوں نے مختصر بحر میں الفاظ کو خوبصورت شعری متن کا اظہار بنایا ہے۔احسن کی مختصر بحری غزلیں اختراعی اوزان کے نئے جہان کا پتا دیتی ہیں۔

بے حرف و صدا بول
سچ کے بھی سوا بول
ایک چہرہ ایک نام
اور افسانہ تمام
گذشت وموجود کی گواہی
سکوتِ شام ملال تنہا
آنگن میں پھولوں کی بیل
اُونچی ہے دیواروں سے
خمیر خاک زندگی
عظیم پاک زندگی

احسن کی شاعری صرف اندوہ ورنج تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں مسرت وبہجت کا بھی بہترین امتزاج ملتا ہے۔شاعر جس اقدار کا قائل تھا اس میں اخلاق وکردار بے حد اہم تھے۔معاشرے میں اخلاقی ابتذال، ریاکاری اور مکروفریب اشخاص اور رویوں سے شدید نفرت کرتے نظر آتے ہیں۔

احسن کی شاعری ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ان کے تینوں شعری مجموعوں میں 264 غزلیں آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی غزلیں پانچ اشعار سے آگے نہ بڑھ پائی۔ذرا سوچیے کہ شاعر کا ذہن کس قدر خلاقانہ ہے کہ اپنی بات صرف 5 شعر میں جامع انداز سے بیان کردی۔احسن یوسف زئی نے تخلص احسن رکھا۔اس کو پوری غزل کائنات میں صرف ایک جگہ برتا ہے۔

لوگوں سے اُمیدیں کیا کیا رکھتے ہو
احسن صاحب کس دنیا میں رہتے ہو

احسن کی زندہ تابندہ شاعری میں اشعار کے درمیان قوسین کا استعمال بھی شعری امتیاز ہے۔اس قسم کے تجربے نہیں کے برابر رہے ہیں۔شاعر نے قوسین میں طبع آزمائی کرکے ایک مخاطبہ جاری کردیا ہے۔ شاعر کی جدت طرازی میں اپنا سانغمہ وترنم ہے۔

سب سے رشتہ ہے بے لوث میرا
(صرف اپنے ہی سر کا آنچل ہو)
جسم زنجیر، (اور تم قیدی)
روح کا گھر ہوں (صرف مقتل ہو)
پتہ شاخ سے ٹوٹا تھا
(اس نے عمر گزاری تھی)

احسن کی غزلیہ شاعری گھٹا ٹوپ اور اندھیرے سے نکلنے والی صبح کاذب ہے۔شاعر نے مہمل لفظیات وتراکیب سے اجتناب کرتے ہوئے دل کے درد کی تجسیم کی ہے۔ ان کی لغت شعری الم انگیز ہے جس میں احساس تنہائی عمیق حزن وملال کی کیفیت غالب ہے۔شاعر غم انسانیت کا نوحہ گر ہے۔

ہماری سانسیں ہماری یادیں ہر ایک پل کا حساب مانگو
تمام زخموں کے منھ کھلے ہیں سوال پوچھو جواب مانگو
رنج کا نام خوشی تھا ہی نہیں
کل جو گذرا وہ کبھی تھا ہی نہیں
شیشے کی دیواروں میں اندھوں جیسا رقص کرو
اپنا چہرہ کوئی نہ دیکھے ڈنکے چوٹ فسادی ہے
حرف حرف سناٹا لفظ لفظ طغیانی
سوچتی ہوئی دھرتی بولتا ہوا پانی
میرے جیسی تو ساری بستی ہے
کوئی میرا نہیں ہے بستی میں

احسن کی شاعری صرف اندوہ ورنج تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں مسرت وبہجت کا بھی بہترین امتزاج ملتا ہے۔شاعر جس اقدار کا قائل تھا اس میں اخلاق وکردار بے حد اہم تھے۔معاشرے میں اخلاقی ابتذال، ریاکاری اور مکروفریب اشخاص اور رویوں سے شدید نفرت کرتے نظر آتے ہیں:

ہم جو چاہیں وہ کہاں ملتا ہے
آگ مانگو تو دھواں ملتا ہے
تم نہ چاہو تو نظر بھی موہوم
آگ چاہے تو دھواں تک دیکھوں
محبتوں کو نکالو حریم ذات سے اب
چراغ راہ گذر کی طرح جلاؤ ہمیں

احسن کی غزلیں ایک حیات بخش کارنامے سے کم نہیں۔ انھوں نے غزل کو غزل کے دائرے میں رہ کر تخلیق وتحریر کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل اپنی روایت سے انحراف نہیں کرتی بلکہ روایت کے سفر کو ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ان کی غزل اپنی شعری معنویت عہد موجود میں بھی رکھتی ہے۔وہ زندگی کا کوئی فلسفہ بیان نہیں کرتی بلکہ راست بیانی سے فکر کے دھاروں کا احساس دلاتی ہے۔معنی خیزی احسن یوسف زئی کے شعری سفر کا ایک

احسن کی شعری جہات میں مختصر بحر کا اہتمام ملتا ہے۔مختصر بحر میں اچھے اور سچے شعر کہنا غیر معمولی تخلیقی عمل ہے۔ احسن نے مختصر ترین بحروں کا انتخاب کرکے سہل ممتنع کو زمین کی وسعت اور آسمان کی رفعت عطا کی ہے۔ انہوں نے مختصر بحر میں الفاظ کو خوبصورت شعری متن کا اظہار بنایا ہے۔

اہم جز ہے۔ان کا شعری سرمایہ خاموشی سے مخاطب ہے۔

تیری آنکھوں میں وہ سلیقہ ہے
گفتگو کی زبان سادہ کر

احسن یوسف زئی کے مشقِ سخن میں قطعہ گوئی کو بھی انفراد حاصل ہے۔ان کے 44 قطعات کا شعری رویہ وہی ہے جو احسن کی غزل کا ہے۔ظاہر ہے کہ قطعہ غزل کے بطن ہی سے نکلا لیکن موضوعاتی قطعہ پر صنفِ سخن کا حصہ نہیں بن سکا۔احسن کے قطعات میں عصری مسائل روانی وسلاست میں ہونے کے باعث قاری کے لیے توجہ انگیز بن گئے ہیں۔شاعری زبان قطعات میں صاف ستھری ہے۔قطعہ نویسی میں بھی احسن یوسف زئی کا نام قابلِ قدر ہے کیوں کہ شاعر نے اپنی فکری جست سے دائمی قوسِ قزح قائم کی ہے۔

دل کی باتیں ہیں کون پہچانے
اَن کہے لفظ تو خدا جانے
گفتگو میں یہ طے ہوا آخر
خامشی میں ہزار افسانے

سیکلیں موٹریں ہوائی جہاز
ہم ہیں محمود فاصلہ ہے ایاز
آگے آگے کاروانِ ہوس
پیچھے پیچھے ہے ان سنی آواز

زینہ زینہ ہوا اُترتی ہے
کاکلوں کی گھٹا اُترتی ہے
آسمانوں میں ہاتھ اُٹھائے ہوئے
وادیوں میں دعا اُترتی ہے

صبا چمن میں چلے پھول سے وفا نہ کرے
گھٹا برستی رہے شاخ کو ہرا نہ کرے
تمام ناموں کی فہرست عصر نے لکھی
ہمارا نام بھی لکھے کبھی خدا نہ کرے
رنگ بھی آنگ بھی سفید سفید
پھول بھی سنگ بھی سفید سفید
مشت بھر خاک بھی غضب کی ہے
خون کا رنگ بھی سفید سفید

احسن یوسف زئی پر گو سخن ور تھے۔انھوں نے نظم نگاری میں بھی مشق ومہارت کی تھی۔ان کی نظمیہ شاعری میں احتجاج کا رویہ ملتا ہے۔مگر وہ احتجاج ترقی پسند شعرا کی طرح چیخ وپکار کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ وہ خاموش احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ذات ہو کہ زمانہ ان کے یہاں طنز تیزی سے کام کر جاتا ہے۔لیکن یہ طنز منفی طور پر نہیں بلکہ حقیقتِ حال پر مثبت پہلو رکھتا ہے۔احسن کی نظمیں انقلاب، فلسطین، چین، رند جمہور اور مزدور انسانی کا استعاراتی اظہار ہیں۔نظم مزدور، محنت کش کی کامرانی اور ظفریابی کا پیغام دیتی ہے۔اس نظم میں شاعر نے مزدور کی محنت والی تصویر کو اُجاگر کیا ہے۔

اے تھکے ماندے مسافر ابھی مایوس نہ ہو
سخت راہوں میں ترا آخری ساتھی میں ہوں
مجھ کو مزدور سمجھ کر نہ تغافل برتو
زندگانی کی لڑائی کا سپاہی میں ہوں

احسن کی نظمیں پابند، آزاد اور نثری ہیں۔انھوں نے شاعرِ مشرق علامہ اقبال پر ایک نظم اپنے مخصوص انداز میں کہی تھی۔نظم 'اقبال' احسن کی پختگی فکر کی آئینہ دار ہے۔اس نظم کا شعری اسلوب مختلف ہے۔پوری نظم ملاحظہ کیجیے:

خون میں دوڑنے والی آواز/روح میں جھانکنے والی آنکھیں/کرچیں کرچیں دل مجروح لیے/ پارہ پارہ صدف روح لیے/کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پہ صدا/آؤ/اس سمت چلیں/ جس جگہ پہلے پہل/اپنی جڑوں کا ہمیں احساس ہوا/حرف در حرف/کسی گم شدہ کوندے کی لپک/ پائے گمراہ کو تنبیہ کو لوٹو لوٹو/نیند کے ماروں کو آگاہی کہ آنکھیں کھولو/ بات/ لاہوت کے اسرار کی بات/ ذات کے نقش طرحداری کی بات/ اندروں شعلہ کو اظہار کی بات/عشق سیال کی فن کاری کی بات/بات سورج کے اُجالے کی طرح پھیل گئی/ بند کمرے کے مکینوں کو خبر ہو نہ سکی/ بات/ جو کانوں میں رس گھول گئی/ بات/ روشن ہے/اسے دل میں اُتر جانے دو/کب تلک رات کو روکو گے گزر جانے دو

احسن یوسف زئی نے بچوں کے لیے نظمیں کہی ہیں جن کی تعداد مٹھی بھر ہے۔یہ نظمیں شاعر نے بچوں کے مزاج ومنہاج کو دیکھتے ہوئے کہی ہیں۔شاعر کا اس میں اندازِ بیان عام فہم اور دل چسپ ہے۔انھوں نے بچوں کی شاعری کے لیے سہل طرز کو سلیس زبان دی ہے۔نظم 'نئی دنیا' میں شاعر نے شاہین صفت بچوں کو بڑوں کی طرف سے سبق آموز اور مخلصانہ پیغام دیا ہے۔جب کہ نظم 'درخت' میں شاعر نے لفظیات اور مواد کو ڈرامائی بیانیہ انداز سے دو چند بنا دیا ہے۔احسن کے اطفال پر کہی ہوئی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔

یہ ترازو ہیں موسموں کا
خدائے برتر کی رحمتوں کا
درخت سے ہے ہمارا رشتہ
درخت زندہ تو ہم بھی زندہ

احسن یوسف زئی نے بچوں کے لیے نظمیں کہی ہیں جن کی تعداد مٹھی بھر ہے۔یہ نظمیں شاعر نے بچوں کے مزاج ومنہاج کو دیکھتے ہوئے کہی ہیں۔شاعر کا اس میں انداز بیان عام فہم اور دل چسپ ہے۔انھوں نے بچوں کی شاعری کے لیے سہل طرز کو سلیس زبان دی ہے۔نظم 'نئی دنیا' میں شاعر نے شاہین صفت بچوں کو بڑوں کی طرف سے سبق آموز اور مخلصانہ پیغام دیا ہے۔

احسن یوسف زئی نے شعبۂ نثر میں اپنے اتالیق محترم یعقوب عثمانی پر مضمون اور پروفیسر حمید سہروردی کی اولین کتاب 'ریت ریت لفظ' (1980) پر تبصرہ لکھا ہے۔ان کی نثر نگاری متوازن فکر اور ادبی چاشنی سے عبارت ہے۔احسن کے ادب پارے علمی واستدلالی قدر وقیمت رکھتے ہیں:

''حمید سہروردی بے معنویت اور بے ربطی کی اینٹوں سے اپنے افسانے کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔جو مکمل ہونے کے بعد اپنے وحدت تاثر میں سب سے جدا نظر آتی ہے۔اور تجریدی آرٹ کی طرح اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے مجموعے کے تاثر کو قبول کیا جائے نہ کہ اس کی اینٹ سے الگ کر کے دیکھی جائے۔''

(بہ حوالہ: تبصرہ 'ریت ریت لفظ' احسن یوسف زئی، عالم گیر ادب، اورنگ آباد دکن، ص:160)

احسن یوسف زئی ایک زیرک ترجمہ کار تھے انھوں نے پروفیسر حمید سہروردی کے افسانوں پر انگریزی میں تحریر کردہ امریکی ادیبہ Dr. Linda Wenitink کے مضمون 'حمید سہروردی کے افسانوں میں رشتوں کی نوعیت' کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔بہ قول مہدی جعفر محترمہ لنڈا وینٹنک نے مسعود اشعر، انور سجاد اور حمید سہروردی پر انگریزی میں مضامین لکھے تھے۔احسن نے محترمہ لنڈا کے مضمون کا ترجمہ اس طرح سے کیا ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔

بہر صورت ملک دکن احسن یوسف زئی کی شعری اصناف کے قلمی یگانگت اور میدانِ نثر نگاری میں زورِ قلم کو مدت مدید تک یاد رکھے گا۔بہ قول احسن:

بیتے موسم کا سوگ زندہ ہے
مرنے والا مر گیا خاموش

■

Dr. Ghazanfar Iqbal
"SAIBAN" Zubair Colony,
Hagarga Cross, Ring Road
GULBARGA - 585104,
(Karnataka), INDIA
Cell:09945015964
email:ghazanfaronnet@gmail.com

مسرور صغریٰ

کلام مومن میں تصوف اور رومانیت کا خوبصورت امتزاج

مومن کی شاعری ان کی خواہشوں کی اساس بھی ہے اور ان کی آنکھوں کا اثاثہ بھی اور یہ اثاثہ کسے عزیز نہیں ہوتا مومن کو بھی یہ اثاثہ بہت عزیز تھا، زندگی کی طرح، زندگی کے چہرے پر دہکتے مہکتے رنگوں اور ان رنگوں میں رقص کرتی خوشبو کی طرح۔ یہ بات اور ہے کہ زندگی خواہشوں خراشوں اور خیالوں سے بھی عبارت ہے، مومن کی شاعری حقیقتوں کے چہرے سے استعاروں کی نقابیں نوچ کر ان کے خد وخال کا کھردراپن افشا کر دیتی ہے اور حقیقتوں کی تہہ میں بکھری ہوئی کڑوی سچائیوں کے ذائقے سے مانوس ہونا ہی مومن کی شاعری کا اصل منصب ہے۔ مگر ان کی پرتیں اتارنے کے لیے جتنی سانسیں لازمی تھیں مومن کو میسر نہ ہو سکیں، کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن کی شاعری کی وسعتیں سوچوں کے کئی پاتال پی کر بھی تشنہ ہے جس کے سینے میں لاتعداد آفاق ہانپ رہے ہیں، جو بہت میٹھے اور ملائم ونرم ہوتے ہیں۔ مومن کی شاعری میں سانس لینے والے ادراک وحواس محدود نہیں، لامحدود ہیں اور اس لامحدود کی زد میں مومن کی شاعری کے اسرار کبھی کھلتے کبھی سمٹتے نظر آتے ہیں جہاں مومن کی شاعری کی بینائی تھک کر دم توڑ دیتی ہے وہیں سے آگے کی گرد کو آسمان سمجھ کر مومن کی شاعری کا ادراک لوٹ آتا ہے، جہاں سے مومن کی شاعری تمام عالم فانی کی سماعتوں میں خاموش ارتعاش وسناٹا پھونکنے لگتی ہے وہیں سے ان کا ادراک فنا کی چاپ تراشنے لگتا ہے، مومن کی شاعری میں بکھری ہوئی تمام کائناتیں مومن کی بینائی کی دسترس میں ہوتی ہیں اور جن کے دامن میں محدود سے لامحدود تک کے تمام فاصلے سمٹ جاتے ہیں، مومن کی شاعری میں ایک خواب آوری ہے ایک نشہ ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن خوابوں سے رشتہ توڑ کر اپنی آنکھوں کو لامحدود کی تیز اور پر اسرار روشنیوں میں دفن نہیں کرنا چاہتے۔ مومن بھی اپنی شاعری کو تجاہل عارفانہ کا مرقع بنا کر یوں پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ فراموش کردہ خوابوں وخیالوں کو بے وفا و بے مروت دوستوں کی مانند لاشعور کے تہ خانے میں حنوط کر دیتے ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی مومن کی شاعری کی چبھن آنکھوں میں گلاب کھلا دیتی ہے پھر وہی چبھن دلوں میں اپنا کرب و دکھ انڈیل کر روح تک اپنا اضطراب پیوست کر دیتی ہے، پھر ان کی شاعری کا حرف حرف صداقتوں کا صورت گر بن کر سماعتوں اور بصارتوں کے آئینہ خانے میں کرن کی طرح جگمگا اٹھتا ہے۔ مومن کی شاعری جب سماعتوں اور بصارتوں کا سفر طے کر کے آنکھوں سے روح میں اترتی ہے تو وہ لمحہ خواب وخیال کی تجسیم اور فکری نقش ونگار کی تخلیق کا لمحہ ہوتا ہے۔

مومن کی شاعری ان کے خیالوں کا اقرار نامہ اور ان کے تصورات کا نگار خانہ ہے، جس میں چھپتے ہوئے آنسوؤں کی کسک بھی ہے جاگتے ہوئے زخموں سے پھوٹتی ہوئی شعاعیں بھی ہیں اور ان کی آنکھوں میں کھلنے والے گلابوں کی باس بھی۔ ان کی شاعری کی اساس کسی بھی لمحہ رائیگاں نہیں جاتی نہ ہی بے صرفہ دھوپ اسے جلاتی ہے، ان کی شاعری میں سانس لیتے تصورات حقیقت اور حق

ہوئی سانسوں کی کرچیوں کے بے نہایت سفر میں مصروف رہتی ہے اور اسی سفر میں بارودوں اور بگولوں کے ہمراہ رقص سفر کرتے ہوئے غبار خاک سے آنکھیں ڈھانپ کر سورج کے سائے میں غروب ہوجاتی ہے۔ مومن کے شب و روز کی تمام مسافتیں اور کٹھنائیاں، تمام شہرتیں اور رسوائیاں، تمام ہنگامے اور تنہائیاں ورق ورق اور حرف حرف ان کی شاعری میں کھلتی اور کھلتی رہیں اور جس سے سارا عالم مشکبار ہوتا چلا گیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مومن کی شاعری میں موجود لمحہ یقین کی شعاعیں مسلسل تسکین و تسلی کا جہاں تلاش کرنے اور انھیں آباد کرنے میں مصروف ہیں اور اسی دوران اپنے لافانی وجود کا سراغ تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن کی شاعری سراپا نور ہے مگر کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ مسلسل اندھیروں سے نبرد آزما ہے، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن کی شاعری نے ماتمی لباس زیب تن کرلیا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ سارا عالم قہقہہ لگا رہا ہو مگر ایسا کم ہی ہوا ہے اور ایسے تاریک و تشکیک لمحوں سے چاندنی و فہم نچوڑنا ایک جاں گداز عمل ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ مومن کی شاعری میں ایسا شہر مدفون ہے جس کی خاک سے کبھی ذہن اگا کرتے تھے کبھی فہم و ادراک کی کھیتیاں ہوا کرتی تھیں۔ مومن کی شاعری میں ایک ایسا ذہن کارفرما نظر آتا ہے جو ہمیشہ دائمی امن کے لیے سرگرداں و فکرمند رہتا ہے۔ انسانی محبتوں کے تمام ترش و شیریں ذائقے مومن کی شاعری کے رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا مومن کی شاعری انسان کی عزت و توقیر پر ایمان کامل رکھتی ہے ان کی شاعری میں صحرا کی وسعت، آسمان کی بلندی اور نیل کی گہرائی ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اہل فن کے ذہنوں میں جو مخصوص تعبیرات محفوظ ہوتی ہیں وہ انھیں کو دہرانے پر مجبور ہوتے ہیں، وہ اگر اپنے بیان میں شعریت لانا بھی چاہیں گے تو وہی تعبیریں ہوں گی، جو ان کی زبانوں پر چڑھ کر منجھ چکی ہیں، مگر مومن کی شاعری اس عیب سے مبرّی ہے، مومن کے کلام میں وہ ندرت بیانی و اعجاز کلامی پائی جاتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ مومن کی شاعری میں فقط طاؤس کی خوش خرامی اور اس کے بال و پر کی رنگینی و رعنائی ہی نظروں کو خیرہ نہیں کرتی بلکہ عالم بشریت کے تمام احساسات کا دامن بھی فطرت کی فیاضیوں سے چھلکتا نظر آتا ہے۔

مشہور تذکرہ نگار ناطق لکھنوی نے مومن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''کعبۂ معنی بنا مومن کا ہر بیت الغزل'' مومن قطعی طور پر مذہبی ذہنیت کے پاسدار اور کار شریعت و حق کے پرستار تھے۔ بزرگان دین سے بلا کی عقیدت رکھتے تھے، افراد خانہ شاہ ولی اللہ کے خانوادے کے معتقد تھے اور گھر کا ماحول خاصا مذہب پرست تھا۔ شاہ عبدالعزیز کی مجلس میں شریک ہو کر ان کے وعظ یاد کرنا مومن کے خاص مشغلوں میں تھا۔ جب ذرا مزید ہوش سنبھالا تو شاہ عبدالقادر کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور شاہ اسمٰعیل کے عقیدت مندوں میں شمار ہونے لگے ان کی تحریک پر حضرت سید احمد اور بقول دیگر مولوی ولایت علی عظیم آبادی سے بیعت جہاد کی۔ اس لیے جب مومن نے شاعری کا آغاز کیا تو تصوف کا بنفشی رنگ جا بجا مومن کی شاعری میں بکھرنے لگا، مومن کے دیوان کا سب سے پہلا شعر ملاحظہ کریں۔

نہ کیوں کر مطلع دیواں ہو مطلع مہر وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشت شہادت کا

اسی وجہ سے ان کی شاعری میں مذہبی جذبات اور جوش و ولولہ کی گہما گہمی ہے۔

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرض مطلب سے بھلا کیوں کر
کہ ہے دست دعا میں گوشۂ داماں اجابت کا

یہ حقیقت ہے کہ اخلاص اور فلسفے کا غزل سے براہ راست کوئی علاقہ نہیں مگر تصوف کا یہاں یقینی گزر ہے بلکہ مختلف

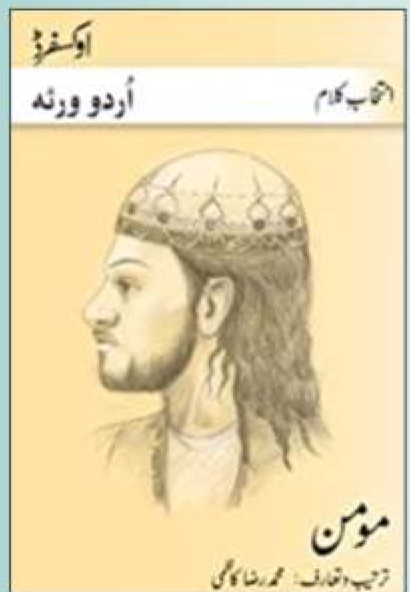

زاویوں سے اسے غزل سے زیادہ مناسبت ہے۔ صوفیہ کے نزدیک ذات حق سرچشمہ حسن ہی نہیں مصدر عشق بھی ہے اسی کے ساتھ مظاہر کا اپنی اصل کی طرف مائل ہونا بھی عین تقاضائے فطرت ہے۔ اس ضمن میں مومن کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبے کو جا مومن
صنم خانے میں کیا ہوئے گا اے گم گشتہ رہ رہ کے

جہاں مومن جیسا شاعر بلا کی عقیدت سے لبریز شعر کہتا ہے وہیں ان کے قلم سے یہ شعر بھی نکلتا ہے جس میں انھوں نے طنز کے تمام تیر سمونے کی کوشش کی ہے، کہتے ہیں:

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

محمد حسین آزاد نے مومن کی شاعری کے متعلق کہا تھا:

''شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور چمکا دیا تھا انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھا کر چند روز بعد اصلاح لینی چھوڑ دی اور کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔'' (آب حیات ص 32-424)

مومن کی شاعری میں رومانیت نے اباحیت کا رنگ اختیار کیا تو وہ بھی اپنے عروج کو پہنچ گیا مگر اس میں بھی خالص اور شفاف جذبے کا اظہار ہے۔

میں نہ کہتا تھا مصور کہ وہ ہے شعلہ عذار
دیکھ تو صفحۂ قرطاس پہ تصویر نہ کھینچ

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق

غالب نے مومن کے بعد ہی مگر ان کی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا'' یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا طبیعت اس کی معنی آفریں تھی'' ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو معنی آفرینی کے نظیر ہیں۔

مومن کی شاعری ان کے خیالوں کا اقرار نامہ اور ان کے تصورات کا نگار خانہ ہے، جس میں چبھتے ہوئے آنسوئوں کی کسک بھی ہے جاگتے ہوئے زخموں سے پھوٹتی ہوئی شعائیں بھی ہیں اور ان کی آنکھوں میں کھلنے والے گلابوں کی باس بھی۔ ان کی شاعری کی اساس کسی بھی لمحہ رائیگاں نہیں جاتی نہ ہی بے صرفہ دھو پ اسے جلاتی ہے، ان کی شاعری میں سانس لیتے تصورات حقیقت اوڑھتی ہوئی سانسوں کی کرچیوں کے بے نہایت سفر میں مصروف رہتی ہے اور اسی سفر میں بارودوں اور بگولوں کے ہمراہ رقص سفر کرتے ہوئے غبار خاک سے آنکھیں ڈھانپ کر سورج کے سائے میں غروب ہوجاتی ہے۔ مومن کے شب و روز کی تمام مسافتیں اور کٹھنائیاں، تمام شہرتیں اور رسوائیاں، تمام ہنگامے اور تنہائیاں ورق ورق اور حرف حرف ان کی شاعری میں کھلتی اور کھلتی رہیں اور جس سے سارا عالم مشکبار ہوتا چلا گیا۔

سونے نہ دیا اس نے شب وصل میں بھی کیا
ہم جاگتے ہیں طالعِ بیدار کی طرح

مومن کے حق میں ضیا بدایونی کا یہ فیصلہ کہ ''نفس غزل میں مومن اپنے تمام تر ہم عصروں پر فوقیت رکھتے ہیں حقیقت سے انتہائی قرب رکھتا ہے۔ دیکھیں ان کا یہ شعر

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

مومن خاں مومن نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انھی کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا اور اس کے دست بستہ حدود سے آگے نکل جانے کی دانستہ کوشش کبھی نہیں کی، مومن نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں، حسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ اردو زباں کے اعلیٰ اور دلنشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں جا بجا اپنے جلوے بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

بصراحت یہ کہنا لازم ہے کہ مومن، غالب اور ذوق کی ارتکازی محفل بھی خوب مشہور ہوئی، مگر غالب اور ذوق کی شاعری سے مومن کی شاعری کو باآسانی مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔

مومن کی شاعری کبھی آتش رنگ، کبھی آب آئینہ، کبھی آب ایستادہ، تو کبھی آب اندام و کبھی آب بقا کا رنگ لیے ہوئے اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ مسکراتی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات ان کی شاعری آب تیغ تو کبھی آب تلخ تو کبھی آب جوسی کیفیت رکھتی ہے۔

مومن کی شاعری میں نازک خیالی کی تعریف کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''مومن خاں مومن نزاکتِ خیال میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں''

مومن نے جس طرح اسالیب بیان میں نزاکت ولطافت پیدا کردی ہے وہ ان کی جولانی طبع کا نمونہ ہے۔

مومن خاں مومن نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انھی کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی غزل کومجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا اور اس کے دست بستہ حدود سے آگے نکل جانے کی دانستہ کوشش کبھی نہیں کی۔ مومن نے ا پنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں، حسن کی اداؤں اوراس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجا تا ہے۔ اردو زباں کے اعلیٰ اور دلنشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں جا بجا اپنے جلوے بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

مومن کا ایک مشہور شعر جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ تم میرا سارا دیوان لے لو اور اس کے عوض مجھے اپنا یہ شعر دے دو۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے تلخ آمیز شعر بعض اوقات نمک کی قتے معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل یہ تمام کیفیات و خصوصیات مومن کی شاعری میں اس لیے در آئیں کہ مومن کی شاعری میں ہفت قلزم موجیں مارتے نظر آتے ہیں تو کہیں ہفت گردوں اپنی منتہا پہ نازاں دکھائی دیتا ہے۔

مومن کی بہترین شاعری کا جب بھی ذکر ہوگا مومن کی یہ غزل صفحۂ تاریخ شاعری پر سنہرے لفظوں میں لکھی جائے گی۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں سے ہی گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ کہتے تھے باوفا جسے آپ گنتے تھے آشنا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی کبھی ان کی شاعری میں آو نیم کش کا سا اثر بھی پایا جاتا ہے کہیں اختراع اندازی بھی پائی جاتی ہے۔ اور صوفیانہ رنگ اور رومانیت بھی۔ جبکہ اب صوفیانہ شاعری آں دفتر را گاؤ خورد کی مانند ہوگئی ہے۔ مگر ان کی شاعری میں تصوف اور رومانیت نے بیک وقت جلوہ افروز ہونے کا شرف حاصل کیا ان کی شاعری میں کہیں ابتذال کا شائبہ نہیں۔ ان کی شاعری مثل فضہ ابیض ہے۔ آنے والی ہزار نسلیں ان کے فن پر ناز کرتی رہیں گی۔

مومن کا کہنا تھا کہ لوگ تیتر بازی میں مشغول رہتے ہیں، تو میں عشق بازی میں کیوں نہ مشغول رہوں آخر اس میں کیا قباحت ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ: اہل

مومن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صفحۂ ادب پر تصوف کے قلم اور رومانیت کی روشنائی سے ایسی دلنشیں شاعری کی، جس نے کبھی بہتے ہوئے آبشاروں کی شکل میں باب ادب کو سیراب کیا تو کبھی مہکتے ہوئے پھولوں کی طرح چٹختے ہوئے غنچوں کی طرح اس کی رعنائیوں میں مزید گلفشانیاں کیں۔

مذاق اور ارباب ذوق ہمیشہ جرأت کے مقابلے میں مومن کا کلام پسند کرتے رہیں گے۔

سب جانتے ہیں کہ مومن کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں برگشتگی اور نامرادی ربودگی اور خود فراموشی کا کام کیا۔ وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے۔ عجب نہیں کہ اس داؤ پیچ کے کاروبار نے ان کو تصنع آمیز اور پیچ دار باتوں کا خوگر بنا دیا ہو۔ جتنے اغلاط ان کے یہاں ہیں کسی اور کے یہاں ہوتے، تو اس کی زبان دانی اور استادی مشکوک ٹھہرتی لیکن ان پر کوئی شک نہیں کرتا اور اپنا استاد تسلیم کرتا ہے۔ ان کی انا ہی تھی کہ وہ کسی کو اپنا ہم پلہ تصور نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ علم رمل اور شطرنج کی سمت بھی خاصی توجہ دی اگر وہ صرف شاعری کی سمت اپنی توجہ مبذول کرتے تو ان کا مقام یقیناً اور بھی بلند ہوتا۔ مجاہد آزادی علامہ فضل خیر آبادی کہا کرتے تھے کہ ''مومن بھیڑیا ہے اس کو اپنی طاقت کی خبر نہیں، اگر وہ عشق و عاشقی کو چھوڑ کر علمی مشغلے میں پڑتا تو اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔''

مومن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صفحۂ ادب پر تصوف کے قلم اور رومانیت کی روشنائی سے ایسی دلنشیں شاعری کی، جس نے کبھی بہتے ہوئے آبشاروں کی شکل میں باب ادب کو سیراب کیا تو کبھی مہکتے ہوئے پھولوں کی طرح چٹختے ہوئے غنچوں کی طرح اس کی رعنائیوں میں مزید گلفشانیاں کیں۔

مومن جیسے مست ازل شاعر نے دنیائے رنگ و بو 1800 میں اپنے تمام تر صوفیانہ اور عاشقانہ مزاج کے ساتھ قدم رکھا اور تمام تر شعری معجزات کی رونمائی کے بعد 1852 میں دار فانی سے رخصت لے لی۔

■

Dr. Masroor Sughra
CM College
Darbhanga - (Bihar)
Email: masroor.sahara@gmail.com

محمد نہال افروز

تقابلی مطالعے کی اہمیت وافادیت

تقابلی مطالعے سے عالمی ادب کے کئی نئے گوشوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔اس کے ذریعے مختلف ممالک کی زبانوں کی ادبیات کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تقابلی مطالعے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تقابلی مطالعہ صرف ایک ہی زبان کے ادب یا کسی ایک فن کار تک محدود نہیں ہوتا ہے۔اس کا دائرہ ایک فن کار سے دوسرے فن کار تک،ایک ادب سے دوسرے ادب تک، ایک تحریک سے دوسری تحریک تک، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک،ایک صنف سے دوسری صنف تک اورایک زبان اورایک دور سے دوسری زبان اور دوسرے دور تک پھیلتا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعہ صرف مختلف زبانوں کے ادب کے آپسی مطالعے تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں تاریخ ،فلسفہ،مذہب، سائنس اور سیاست وغیرہ بھی شامل ہیں۔تقابلی مطالعہ کا تعلق حقیقی معنوں میں ادبی کاموں سے ہوتا ہے۔ ایسے ادبی کام جن کا تقابل ہم دوسرے ادبی کاموں سے کرتے ہیں۔ یہ دراصل مختلف ادبی کارناموں کے آپسی تعلقات کے مطالعے کا نام ہے،جس سے عالمی ادبیات میں اضافہ ہوتا ہے۔

تقابلی مطالعے کے ذریعے ادب کی کئی نئی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں،جو تنقیدی تجزیہ یا تنقیدی مطالعے سے نہیں حاصل ہوتی ہیں یا یوں کہیں کہ تقابلی مطالعے سے دو تخلیقات کے سیاق میں بہت ساری نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے، جو کسی دو تخلیقات کا الگ الگ مطالعہ کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر غالب کی فارسی کتاب 'دستنبو' اور سر سید احمد خان کی اردو کتاب 'اسباب بغاوت ہند' کو لے لیجیے۔ان دونوں کتابوں کا موضوع جنگ آزادی سے متعلق ہے اور دونوں ہی کتابیں 1858 میں منظر عام پر آئیں۔

جب ہم ان دونوں کتابوں کا الگ الگ مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی تصنیف 'دستنبو' میں جنگ آزادی کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ دستنبو مرزا غالب کا ایک مختصر سا روزنامچہ ہے،جس میں انھوں نے 1857 میں ہوئی جنگ آزادی کے خونی ہنگامے کو پیش کیا ہے۔اس روزنامچے میں غالب نے انھی واقعات کو قلمبند کیا ہے، جو خود ان پر گزرے ہیں یا جو انھوں نے اپنے دوست احباب سے زبانی سنے ہیں۔ دستنبو میں مئی 1857 سے لے کر جولائی 1858 تک کی روداد بیان کی گئی ہے۔ بقول مرزا غالب یہ وہ دور تھا جب شہر دہلی کا ذرہ ذرہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ غالب نے اس کتابچے میں اپنی زبوں حالی کا درد بیان کیا ہے۔ اجڑی ہوئی دلی کا رونا رویا ہے۔ مسلمانوں کی بدحالی پر اشک بار ہوئے ہیں۔یعنی کہ غالب نے دستنبو کو شہر دہلی کے ساتھ ساتھ اپنی اور مسلمانوں کی بربادی کا دستاویز بنا کر پیش کیا ہے،جس سے اس دور کے حالات سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔

اسی طرح جب 'اسباب بغاوت ہند' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید احمد خاں نے غدر کے اسباب کو بہت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ 1857 میں ہندوستانیوں کے ذریعے کی گئی آزادی کی ناکام کوشش ہی کو انگریزوں نے بغاوت کا نام دیا۔اس بغاوت کے انتقام میں انگریزوں نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر بے شمار ظلم کیے اور قدم قدم پر لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ سر بازار لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں، درختوں سے باندھ کر پیٹ پیٹ کر مارڈالا گیا۔لوگ گھروں میں چھپ چھپ کر رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی تقریباً آٹھ سو سالہ عظمت مٹی میں مل چکی تھی۔ مغل سلطنت کا آخری چراغ بھی گل ہو چکا تھا۔اس صورت حال میں انگریز یہ سمجھ رہے تھے کہ چونکہ مسلمانوں کا اقتدار ہندوستان سے ختم ہو چکا ہے اور اس لیے مسلمان قوم ہی غدر کا باعث بنی۔اس وجہ سے انگریزوں کا جذبۂ انتقام مسلمانوں کے خلاف زیادہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 1857 کی تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سر سید نے ان تمام واقعات کے مدنظر غدر کے اسباب کو 'اسباب بغاوت ہند' میں قلم بند کیا ہے۔

لیکن جب ہم 'دستنبو' اور 'اسباب بغاوت ہند' کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بغاوت کے اسباب اور

اس سے ہونے والے نقصانات کے علاوہ اس وقت کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کے تقابل سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ کون کون سی وجوہات تھیں، جن کے سبب ہندی عوام خاص طور سے ہندی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ یہاں پر تقابلی مطالعے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے ہمیں بغاوت کے اسباب اور اس کے بعد کی افراتفری سے بھی بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔

اسی طرح قاضی عبدالستار کے اردو افسانے 'پیتل کا گھنٹہ' اور یشپال کی ہندی کہانی 'پردہ' دونوں کا موضوع ختم ہوتی ہوئی زمین داری، حکومت، دولت اور آبا و اجداد کی عزت کو بچانے کی ناکام کوشش ہے۔ دونوں کہانیوں کے مطالعے سے قاضی انعام حسین اور چودھری پیر بخش کی مفلسی کا پردہ اٹھتا ہوا نظر آتا ہے اور قاری ان دونوں کہانیوں کے پس منظر پر غور وفکر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے 'پیتل کا گھنٹہ' میں قاضی انعام حسین کی زمین داری اور دولت کے ختم ہونے کے بعد کے حالات کو بیان کیا ہے، انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ جب ایک امیر انسان غریب ہوجاتا ہے تو وہ اپنی عزت بچانے کے لیے کون کون سی تدبیریں کرتا ہے۔ اس کوشش میں اس کی بچی ہوئی دولت کے ساتھ گھر کے قیمتی سامان بھی ختم ہوجاتے ہیں۔ باوجود اس کے وہ اپنی عزت نہیں بچا پاتا۔ ایک وقت ایسا تھا جب قاضی انعام حسین اپنی حکومت اور دولت کی وجہ سے پوری ریاست میں جانے پہچانے جاتے تھے، لیکن جب ان کے حالات خراب ہوئے تو وہ اپنے مہمانوں کی مہمان نوازی کے بھی لائق نہیں رہے۔ ایک دن ان کے یہاں ان کا ایک خاص مہمان آیا تو وہ گھبرا گئے کہ اس کی مہمان نوازی کیسے کی جائے۔ آخر کار انھیں ایک تدبیر نظر آئی اور انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی سو سال پرانی نشانی پیتل کے گھنٹے کو بیچ کر اپنے مہمان کی خاطر داری کی۔ جب وہ مہمان واپس جانے لگا تو دیکھا کہ جس گاڑی میں وہ سوار ہے اسی میں قاضی انعام حسین کا وہ پرانا پشتینی پیتل کا گھنٹہ موجود ہے، جو ان کے آبا و اجداد کی آخری نشانی تھی۔ اس سے ان کے مالی حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح یشپال نے ہندی کہانی 'پردہ' میں چودھری پیر بخش کی غریبی اور بے بسی کی داستان کو بیان کیا ہے، جن کے آبا و اجداد کا شمار کبھی ملک کی بڑی ہستیوں میں ہوتا تھا۔ چودھری پیر بخش کے دادا چنگی کے محکمے میں داروغہ تھے۔ آمدنی اچھی ہونے کی وجہ سے ایک پکا مکان بنوالیا تھا اور اپنے بیٹوں کو پڑھا لکھا کر اس لائق بنا دیا کہ وہ سرکاری نوکری کرنے لگے، جس سے محلے میں ان کے خاندان کا بڑا نام تھا۔ جب اس خاندان کی باگ ڈور چودھری پیر بخش کے ہاتھ میں آئی تو وہ اپنے آبا و اجداد کی بنائی ہوئی عزت کو نہ سنبھال سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے اخراجات بھی اچھی طرح سے پورے نہیں کر پاتے تھے۔ وہ اپنے خاندان کی عزت بچانے اور بیوی، بچوں کی خواہش پوری کرنے کے لیے محلے کے ایک آدمی خان صاحب سے قرض لیتے ہیں۔ مہنگائی کی وجہ سے دن بہ دن چودھری صاحب کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ وہ اب اپنے گھر کی عزت بچانے کے لیے گھر کے دروازے پر ایک پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ان کے گھر کے اندر کی حالت باہر کے لوگوں کو پتا نہ چلے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ ان کی حالت اور خراب ہوتی گئی۔ بیوی بچے فاقہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چودھری کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ وہ بچوں کے لیے کھانے اور کپڑے کا بھی انتظام نہیں کر پا رہے تھے تو قرض کہاں سے ادا کرتے، لیکن ایک پردہ ہی تھا جو ان کی عزت کو بچائے رکھا تھا۔ خان صاحب کے کئی بار کہنے پر بھی چودھری صاحب قرض ادا نہ کرسکے تھے۔ ایک دن خان صاحب غصے میں آکر بولے کہ ان کے پاس قرض ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں اور دروازے پر پردہ لگا رکھا ہے۔ یہ کہتے ہوئے خان صاحب نے دروازے سے پردہ کھینچ دیا۔ پردہ ہٹتے ہی چودھری پیر بخش کی خستہ حال زندگی پر پڑا پردہ بھی اتر گیا۔ یہ دیکھ کر چودھری صاحب بے سدھ ہوکر بے ہوش ہوگئے، جب ان کو ہوش آیا تو دیکھا کہ دروازے کا پردہ آنگن میں پڑا تھا۔

'پیتل کا گھنٹہ' اور 'پردہ' دونوں کہانیوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں کا موضوع ایک ہوتے ہوئے بھی بہت سی باتیں الگ ہیں۔ پیتل کے گھنٹے میں قاضی انعام حسین اپنی حکومت، دولت اور مہمان نوازی کو بچاتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور پردہ میں چودھری پیر بخش اپنے آبا و اجداد کی بنائی ہوئی عزت بچانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ قاضی انعام حسین سب کچھ ختم ہوجانے کے بعد مہمان نوازی کے لیے اپنا پشتینی پیتل کا گھنٹہ بیچ دیتے ہیں وہیں چودھری پیر بخش نے اپنی عزت بچانے کے لیے اپنی ڈیوڑھی پر پردہ لگا رکھا ہے۔ یعنی کہ قاضی انعام حسین اپنی عزت کے لیے پیتل کے گھنٹے کا سہارا لیتے ہیں تو چودھری پیر بخش پردے کا استعمال کرتے ہیں، لیکن دونوں ہی اپنی اس کوشش میں ناکام نظر آتے ہیں۔ پیتل کا گھنٹہ بیچنے سے قاضی انعام حسین اور پردہ ہٹ جانے کی وجہ سے چودھری پیر بخش کا راز فاش ہوجاتا ہے۔

اس کے علاوہ تقابلی مطالعے سے تخلیق کاروں کے نظریات کا بھی پتا چلتا ہے۔ اگر ہم کسی ایک زبان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صرف اسی زبان میں پیش کیے گئے مسائل سے واقفیت ہوتی ہے۔ جب کہ ہر زبان یا سماج کے مسائل الگ ہوسکتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر اردو اور ہندی ادب کے مسائل۔ دورِ حاضر کا ایک بڑا مسئلہ فرقہ واریت ہے۔ جب ہم دورِ حاضر کے اردو افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں فرقہ واریت یا فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر بے شمار کہانیاں ملتی ہیں، اس کے برعکس ہندی کہانیوں میں اس موضوع پر کہانیاں برائے نام ہی ملتی ہیں اور وہ کہانیاں ہندی زبان کے مسلم کہانی کاروں نے تخلیق کی ہیں۔

تقابلی مطالعے کی اہمیت وافادیت صرف زبان وادب ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تقابلی مطالعے کا دائرہ زبان وادب کے باہمی رشتے کے مطالعے کے علاوہ مختلف علوم وفنون، سماجی وسیاسی تحریکات وغیرہ کے مطالعے تک پھیلتا جاتا ہے۔ گویا یہ ادب کی فہم وفراست کا ایک نیا اور منفرد طریقہ ہے، جس سے ادب کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون کے کئی نئے پہلو کی تفہیم ہوتی ہے۔ پروفیسر محمد حسن تقابلی مطالعے یا تقابلی تنقید کو ادب کی تفہیم اور پرکھ کا ایک نیا منظر نامہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہر حال تقابلی تنقید ادب کی تفہیم اور پرکھ کا ایک نیا منظر نامہ ہے۔ یہاں مطالعہ صرف ایک شہ پارے یا کسی ایک فن کار سے شروع تو ہوتا ہے، لیکن ان پر ختم نہیں ہوتا۔ اس کے رشتے ایک ادیب سے دوسرے ادیب تک، ایک ادب سے دوسرے ادب تک اور ایک زبان اور ایک دور سے دوسری زبان اور دوسرے دور تک پھیلتے جاتے ہیں اور آخر ادب کے دائرے سے باہر مختلف علوم و فنون، تحریکات وسماجی عوامل تک پہنچ جاتے ہیں گویا پوری دنیا ایک ایسے معاشرے میں تبدیل ہوجاتی ہے جو مختلف جغرافیائی اور لسانی حصوں میں بٹی ہونے کے باوجود ایک مربوط اکائی ہے اور اس کے دل کی دھڑکنیں اور احساسات کی لہریں کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی نقطے پر آکر ضرور ملتی ہیں اور وہ نقطہ انسانی ارتقا کی مختلف سطحوں کی داخلی شخصی اور نجی شناخت فراہم کرتا ہے۔''

(محمد حسن، مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، ص 399)

درج بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہمیں تقابلی ادب سے ہوتا ہے۔ چونکہ تقابلی ادب، ادب کی تفہیم کا ایک نیا زاویہ ہے۔ اس کے ذریعے ادب کی مختلف پرتیں کھلتی ہیں، جو کسی ایک ادب کے مطالعے سے واضح نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر انتظار حسین اور نرمل ورما کی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ پڑھنے سے اردو قاری نرمل ورما کی تمام تخلیقات کا مطالعہ کرنے میں دلچسپی لے گا۔ سرسید اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مضامین کا تقابلی مطالعہ پڑھنے کے بعد اردو قارئین کے اندر ٹی ایس ایلیٹ کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے میں دلچسپی پیدا ہوگی۔ اسی طرح اردو اور بنگالی ادب کے تقابلی مطالعے سے قاری کی دلچسپی اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی ادب کا مطالعہ کرنے میں بڑھے گی۔ اس طرح تقابلی ادب سے ملک کی دیگر زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ عالمی ادب و تہذیب کی معلومات قاری کو اپنی ہی زبان میں دستیاب ہوں گی، جس سے کسی ایک زبان کا جاننے والا شخص عالمی ادب کے مختلف زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت سے بخوبی واقف ہوسکتا ہے۔

تقابلی مطالعے میں ترجمے کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ تقابلی مطالعہ اکثر ایک ہی زبان کے دو ادب اور دو ادیبوں میں ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر دو زبانوں کے درمیان یا دو زبانوں کے ادب اور دو زبانوں کے ادیبوں کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں محقق کو ترجمے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک شخص کو کئی زبانوں کا علم ہو، وہ بھی اس قدر علم کہ وہ ادب کی مکمل تفہیم کر سکے، ممکن نہیں ہے۔ ترجمے کے ذریعے صرف زبان کی سطح پر ہی انسانی علوم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ترجمہ شدہ علوم سے عالمی ادب کی مختلف ادبیات میں شامل تہذیب وثقافت، سماجی و سیاسی افکار اور تاریخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ادب کے تراجم سے دوسری قوموں کے احوال و آثار، رہن سہن اور مزاج و منہاج کے دریچے بھی کھلتے ہیں۔ تقابلی مطالعے کے لیے ان کا علم ہونا اشد ضروری ہے، جن کے بغیر ہم عالمی سطح پر ادبی و علمی سرگرمیوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ پروفیسر ابوالکلام نے اپنی کتاب 'حرفے چند' میں تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ایلبرٹ گیراڈے کی تصنیف 'مقدمۂ ادب عالم' سے ایک جملہ کوٹ کیا ہے۔ جملہ ملاحظہ ہو:

''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔''

(پروفیسر ایلبرٹ گیراڈے، مشمولہ: پروفیسر ابوالکلام، حرفے چند، ص 14)

ایلبرٹ کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔ عالمی ادب کے تصور کو سمجھنا کسی ایک فرد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے ترجمہ ہی کو وسیلہ بنانا پڑے گا۔ ویسے بھی ہندوستان زبانوں کا عجائب گھر کہا جاتا ہے اور دنیا میں تو بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ادب تخلیق کیا جاتا ہے اور ہر زبان و ادب میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی پہلو ہونا لازمی ہے۔ ہر تخلیقی فن پارے کا اپنا ایک سماجی اور تہذیبی سانچہ ہوتا ہے، جس میں وہ اپنا ادب تخلیق کرتا ہے۔ ان ساری باتوں کا علم ہونا کسی ایک آدمی کے لیے تو ممکن نہیں ہے۔ اس لیے محقق کو تقابلی مطالعے کے لیے ترجمہ شدہ مواد پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

تقابلی مطالعے کا اصل مقصدایک وسیع تناظر میں ادب کا مطالعہ کرنا ہے، جس سے کہ ادب کی تفہیم عالمی سطح پر ہو سکے۔ترجمے کے بغیر عالمی ادب کا تقابلی مطالعہ کرنا نا ممکن تو نہیں، لیکن مشکل ضرور ہے۔قدیم زمانے سے لے کر دور حاضر تک عالمی سطح پر ہونے والی علمی، سائنسی اور تکنیکی معلومات ہمیں تراجم کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ دورحاضر میں فنی اور تکنیکی دریافتیں، انکشافات اور معلومات بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ یہ دریافتیں اور معلومات ہمیں صرف ترجمے کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔

تقابل اور ترجمہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ دونوں کا تعلق عالمی ادب سے ہے۔ تقابل اور ترجمہ دونوں ہی سے ادب میں اضافہ ہوتا ہے، جس طرح ترجمے کے لیے مترجم کو متن کی زبان اور اپنی زبان دونوں پر یکساں عبور حاصل ہونا چاہیے۔ اس موضوع سے بھی طبعی مناسبت ہونی چاہیے جو متن میں موجود ہے۔ اس متن کے مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت ہونی چاہیے اور اس صنف سے بھی دلچسپی ہونی چاہیے، جس میں متن تخلیق کیا گیا ہے۔ اسی طرح تقابلی مطالعے کے لیے بھی محقق کو چاہیے کہ وہ جن دو ادب کا باہم تقابل کر رہا ہے ان دونوں کی تہذیب وثقافت پر اسے عبور ہو، جس سے وہ دونوں کی تہذیب وثقافت کی مماثلت وتضاد کو واضح کر سکے۔ اس کے لیے اسے دونوں کے موضوع سے طبعی لگاؤ بھی ہونا چاہیے، جس سے محقق کو ادبیات کے تطابق اور تخالف کو واضح کرنے میں مدد مل سکے۔

تقابلی مطالعے کا اصل مقصد ایک وسیع تناظر میں ادب کا مطالعہ کرنا ہے، جس سے کہ ادب کی تفہیم عالمی سطح پر ہو سکے۔ ترجمے کے بغیر عالمی ادب کا تقابلی مطالعہ کرنا ناممکن تو نہیں، لیکن مشکل ضرور ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر دور حاضر تک عالمی سطح پر ہونے والی علمی، سائنسی اور تکنیکی معلومات ہمیں تراجم کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ دور حاضر میں فنی اور تکنیکی دریافتیں، انکشافات اور معلومات بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ یہ دریافتیں اور معلومات ہمیں صرف ترجمے کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔

تقابلی مطالعے میں ترجمے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ جب ہم کوئی مقالہ یا کتاب لکھتے ہیں تو ہمیں کسی ایک ہی زبان میں لکھنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم اردو زبان میں اردو اور ہندی کی کسی دو تخلیقات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو اس صورت حال میں اپنی بات کی تائید، تردید اور انکشافات کے لیے جو اقتباسات کوٹ کرتے ہیں ان کو اردو میں ترجمہ کر کے ہی ہمیں اپنی تحقیق میں شامل کرنا چاہیے، کیوں کہ اس مقالے یا کتاب کے قارئین ضروری نہیں کہ اردو اور ہندی دونوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس صورت میں بھی ہمیں ترجمے ہی کا سہارا لینا ہوتا ہے۔

ترجمہ شدہ مواد سے تقابلی مطالعے میں دقتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، کیوں کہ کسی بھی ایک زبان کے مواد کو ہو بہو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ اس لیے کہ ہر زبان کا اپنا تہذیبی پس منظر، آہنگ اور مزاج ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں کا بحسن وخوبی ترجمہ کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ ترجمے کے ذریعے کسی بھی تخلیق کے واقعے، کردار، زمان ومکان، تکنیک وغیرہ کو دوسری زبان میں کسی حد تک منتقل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس تخلیق میں شامل سماجی و سیاسی اور تہذیبی وثقافتی پس منظر، آہنگ اور مزاج کو پوری طرح منتقل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ باوجود اس کے عالمی ادب کی سطح پر تقابلی مطالعے کے لیے ہمیں ترجمے ہی پر انحصار کرنا پڑے گا۔ ترجمے کے بغیر عالمی سطح پر تقابلی مطالعے کا کام ہم بخوبی انجام نہیں دے سکتے۔

■

Md Nehal Afroz
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachbowali, Hyderabad - 500032
Mob: 9032815440
Email: nehalmd6788@gmail.com

جسیم الدین

مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور دہلی یونیورسٹی

مولانا سعید احمد اکبرآبادی اپنے علم وفضل، اخلاق وسیرت، جامعیت علم وفن اور تعلیمی وتحقیقی خدمات کے لحاظ سے قدیم اور جدید علمی حلقوں میں منفرد وممتاز شناخت رکھتے ہیں۔آپ کی علمی ودینی اور تدریسی وصحافتی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔آپ نے قدیم وجدید دونوں درسگاہوں سے اکتساب فیض کیا۔ایک طرف مولانا سعید احمد اکبرآبادی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھے تو دوسری طرف مولانا نے ذاتی طور پر انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ کا مطالعہ جاری رکھا۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہندوستان کے ان گنے چنے علما میں سے تھے جنھیں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔

مولانا کا شمار برعظیم کے ان روشن خیال اور ترقی پسند علما میں ہوتا ہے، جو ہمیشہ نئی باتوں کو اپناتے اور نئی قدروں کا احترام کرتے۔اسی لیے ہر حلقہ انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، خواہ اس کا تعلق کسی بھی سیاسی ودینی مسلک سے کیوں نہ ہو۔مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز تدریس وتحقیق سے کیا، وہ سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی، مدرسہ عالیہ، کلکتہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کئی دیگر اداروں میں مدرس اور لکچرر رہے۔ ہندوستان کے علاوہ یورپ وامریکا کے اہم تعلیمی اداروں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔مولانا کے علمی اور دینی کمالات کے اعتراف میں یورپ اور امریکا کی متعدد یونیورسٹیوں نے انھیں وزیٹنگ پروفیسر کے اعزاز سے نوازا۔ 1962 میں انھیں مک گل یونیورسٹی مونٹریال (کینیڈا) میں بحیثیت مہمان پروفیسر مدعو کیا گیا۔علاوہ ازیں انھوں نے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے علوم شرقیہ کے حلقوں کو اپنے خیالات اور علمی موشگافیوں سے بھی متاثر کیا۔

مولانا کی شخصیت کثیر الجہات ہے، ظاہر ہے کہ اس مختصر سے مقالے میں ان کی تمام جہات کو اجمالاً بھی ذکر کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اس لیے اس مختصر مقالے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور دہلی یونیورسٹی کے علمی رشتے کو اجاگر کیا جائے گا اور یہ بتایا جائے گا کہ اس دانش گاہ کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔نیز یہاں آپ کے استاذ محترم کون تھے، جن کی رہنمائی نے آپ کی شخصیت کو عالمگیر بنادیا۔سب سے پہلے دانش گاہ کی بات کی جائے گی۔ پھر بات ہوگی آپ کے استاذ محترم شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن دہلوی کی، پھر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی۔

دہلی یونیورسٹی ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، جب اس کی تاسیس عمل میں آئی، اس وقت دہلی میں صرف تین کالجز تھے، سینٹ اسٹیفن کالج، ہندو کالج اور رامجس کالج۔سینٹ اسٹیفن کالج کی تاسیس 1881 میں ہوئی۔ ہندو کالج کی بنیاد 1899 میں پڑی اور رامجس کالج کی بنیاد 1917 میں رکھی گئی۔اب دہلی یونیورسٹی کے دو بڑے کیمپس ہیں، ایک ساؤتھ کیمپس اور دوسرا نارتھ کیمپس، دونوں کیمپسز کے متعدد کالجز کے علاوہ پوری دہلی میں 73 کالجز ہیں، علاوہ ازیں میڈیکل کالجز بھی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے کالجز کی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم میں وہ کالجز شامل ہیں، جو مکمل طور پر دہلی یونیورسٹی کے ماتحت ہیں، دوسری قسم ان کالجز کی ہے، جو صرف دہلی یونیورسٹی سے منسوب ہیں، لیکن ان کے اپنے اختیارات ہیں اور تیسری قسم میں وہ کالجز داخل ہیں جو یونیورسٹی کی تاسیس سے پہلے قائم ہوئے، ان کا انتظام وانصرام کالج کونسل اور یونیورسٹی کے قوانین کے تحت انجام پاتا ہے۔ 24 کالجز ساؤتھ کیمپس میں واقع ہیں، جب کہ باقی کالج نارتھ کیمپس اور دہلی کے مختلف مقامات پر قائم ہیں۔

سینٹ اسٹیفن کالج کا قیام دہلی یونیورسٹی کی تاسیس سے پہلے ہوا، لیکن یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد اس کالج کو دہلی یونیورسٹی کے تحت کر دیا گیا، البتہ اس کے کچھ مخصوص اختیارات ہیں، جو دہلی یونیورسٹی سے علاحدہ ہیں۔سینٹ اسٹیفن کالج میں جہاں دیگر زبانوں کے شعبے تھے، وہیں عربی وفارسی کا شعبہ بھی تھا، لیکن دہلی یونیورسٹی میں ضم ہونے کے بعد اس کالج میں عربی وفارسی میں داخلے کا سلسلہ موقوف ہوگیا، جب کہ اردو کا شعبہ بدستور قائم رہا، لیکن پروفیسر ولی اختر استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر شمیم احمد استاذ شعبۂ اردو سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی یونیورسٹی کی سعی پیہم اور جہد مسلسل کے بعد گزشتہ تین برسوں سے سینٹ اسٹیفن کالج میں عربی وفارسی میں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور اڈوانسڈ ڈپلوما میں داخلے ہو رہے ہیں، جو یقیناً خوش آئند قدم ہے۔فی الحال یہاں عربی وفارسی میں سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کے طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، یہاں ڈاکٹر مجیب اختر استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر ظفیر الدین شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی بحیثیت استاذ

اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسی کالج کے شعبۂ عربی وفارسی سے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے استاذ شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن منسلک تھے۔ اس شعبے میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں، ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں جنوری 1932 میں 'شمس العلما' کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا، یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسی سال مولوی ولایت حسین اسسٹنٹ مولوی عربک کالج، مدرسہ بنگال شمس العلما کے خطاب سے نوازے گئے۔

مولوی عبدالرحمٰن پروفیسر عربی وفارسی سینٹ اسٹیفن کالج دہلی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے فیلو تھے۔ آپ نے کئی سال تک ایم، او، ایل فارسی کے دوسرے پرچے کے صدر ممتحن کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

یہ بیان کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ایم، او، ایل فارسی کے پہلے پرچے کے صدر ممتحن ڈاکٹر سر محمد اقبال تیسرے پرچے کے قاضی فضل حق گورنمنٹ کالج لاہور، چوتھے پرچے کے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور اور پانچویں اور چھٹے پرچے کے مولوی محمد شفیع پروفیسر اورینٹل کالج لاہور تھے۔

دسمبر 1939 کے آخری ہفتے میں دہلی میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام 'آل انڈیا اردو کانفرنس' منعقد ہوئی، جو نہایت کامیاب رہی، اس میں کثیر تعداد میں مندوبین، اراکین اور اردو کے شائقین نے شرکت کی۔ شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن اس کانفرنس کے روح رواں تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور کانفرنس کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر نے اپنے مطبوعہ خطاب میں پوری مضبوطی کے ساتھ کہا کہ اردو کے لیے کام کرنا ملک کے لیے کام کرنا ہے، کیونکہ یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہ کانفرنس اردو کے احیا کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے اردو کے حوالے سے مختصر وجامع گفتگو میں عثمانیہ یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں کی اردو کے احیا کے لیے کی گئی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں تعلیمی ادارے مفید کام کررہے ہیں۔ متعدد ممتاز شخصیات جیسے مسٹر گاندھی، پنڈت جوہرلال نہرو، مسٹر اکبر حیدری، سرتیج بہادر سپرو وغیرہ کے کئی پیغامات موصول ہوئے ہیں۔

دہلی کے چیف کمشنر نے اردو ریکارڈوں کی ایک نمائش کا افتتاح کیا۔ دیگر قراردادوں کے علاوہ کانفرنس نے شمالی ہند کی یونیورسٹیوں پر زور دیا کہ وہ اردو کو اپنا ذریعہ تعلیم بنائیں۔

یہ تھے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے استاذ محترم شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن۔ جنھوں نے 1934 میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو خط لکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی آئیں اور عربی میں ایم اے کریں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن کی آواز پر لبیک کہا اور کالج میں ایم اے عربک میں آپ نے داخلہ لے لیا۔ ایم اے میں آپ نے امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرکے اپنے استاذ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ دوسال بعد 1936 میں جب آپ کے استاذ محترم شمس العلما عبدالرحمٰن ریٹائرڈ ہوگئے تو آپ کو ہی شعبے کا استاذ بنایا گیا اور جب دہلی یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو کا شعبہ شروع کیا گیا، تو آپ کو ان تینوں شعبوں کا صدر مقرر کیا گیا۔ یہاں آپ نے چھ سال تک تدریس کے فرائض انجام دیے، اسی کالج میں آپ کے زمانۂ تدریس میں پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاءالحق آپ کے شاگرد تھے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے قدیم وجدید دونوں قسم کی درسگاہوں سے نہ صرف اکتساب فیض کیا، بلکہ انھیں دونوں قسم کے اداروں میں درس وتدریس کا بھی زریں موقع بھی ملا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے جہاں محدث العصر علامہ انورشاہ کشمیری، مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا مفتی اعزاز علی، مولانا حسین احمد مدنی جیسی جبال العلم شخصیات سے قرآن وحدیث اور عربی زبان وادب سیکھا، وہیں دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ ماہر سرمارس گویر، وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی کی قیادت میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن سے عربی ادبیات پڑھی اور پھر یہیں تدریسی خدمات پر بھی مامور ہوگئے۔ اسی لیے مولانا کی ذات وشخصیت قدیم وجدید علوم وافکار کا حسین امتزاج تھی۔ آپ قدیم علوم کے ساتھ علوم جدیدہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور دونوں کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے زندگی کو کنویں کے اندر سے نہیں، بلکہ کائنات کی وسعتوں میں رہ کر دیکھا۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی علمی لیاقت کے ساتھ اعلی اخلاقی اقدار اور مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے، جس وقت وہ سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کررہے تھے، تو کسی نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے عربی سے کیوں ایم اے کرنا پسند کیا، ہندوستان میں اس مضمون کے شعبے بہت کم ہیں، نوکری مشکل سے ملے گی۔ تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے جواب دیا کہ: 'کیا پورے ہندوستان میں ایک جگہ بھی عربی کی نہیں نکلے گی؟' سوال کرنے والے نے کہا: 'کیوں نہیں'۔ تب مولانا نے کہا: 'اگر ایک جگہ بھی کہیں نکلے گی تو میں اپنے آپ کو اس لائق بناؤں گا کہ اس جگہ پر صرف میرا ہی تقرر ہو'۔ چناں چہ ایم اے کا امتحان پاس کرتے ہی وہ سینٹ اسٹیفن کالج میں میں لکچرر مقرر ہوگئے۔ یہ جذبہ اور محنت اگر مسلم طلبہ میں پیدا ہوجائے تو ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا میں ان کو اپنا حق حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، کیونکہ تعصب لیاقت کے آگے بے اثر ہوجاتا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مذہبی تنگ نظری اور علاقائی عصبیت سے حد درجہ بے زار تھے، دارالعلوم دیوبند سے تعلق اور حنفی مسلک پر عامل ہونے کے باوجود اس مسلک کے دوسرے علما سے یکسر مختلف تھے۔ بہ وقت ضرورت حنفی مسلک پر بھی اپنی انفرادی رائے کا بے دریغ اظہار کرتے، یا اس سے اختلاف رائے ظاہر کرنے میں کسی طرح کے لیت ولعل سے کام نہیں لیتے۔ مولانا اکبرآبادی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دور جدید کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ کر اسلامی تعلیمات کو ان کے مطابق ڈھالنے کے قائل تھے، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ علما کی تین قسمیں ہوتی ہیں: ایک قدامت پسند، دوسری ترقی پسند اور تیسری آزاد خیال۔ مولانا کا شمار ترقی پسند علما میں ہوتا تھا، وہ اجتہاد کو دور حاضر کی ضرورت سمجھتے تھے۔ مولانا کے اندر نئے حالات کے مطابق نئی راہیں پیدا کرنے کا احساس وشعور اور مجتہدانہ بصیرت موجود تھی۔ اس خوبی نے آپ کو ہر دو طبقہ میں یکساں مقبول بنادیا تھا۔

مراجع

- ماہنامہ برہان، جون 1985
- ڈاکٹر عقیلہ: جامعہ دلی واسہاماتہا فی الادب العربی
- محمد حنیف شاہد، شمس العلما: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، مارچ 2006
- Islamic Culture ,Vol 14,1940
- اسرار احمد، 'چند یادیں، چند باتیں' مشمولہ میثاق، جلد 34، شمارہ 8، مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی، لاہور اگست 1985
- نسیم احمد (سابق وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ) مولانا سعید احمد اکبرآبادی: احوال وآثار، ص: 11، ط: شعبۂ سنی دینیات اے ایم یو 2005

■

Dr. Jaseemuddin
R-234/A, 3rd Floor, Jogabai
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9711484126

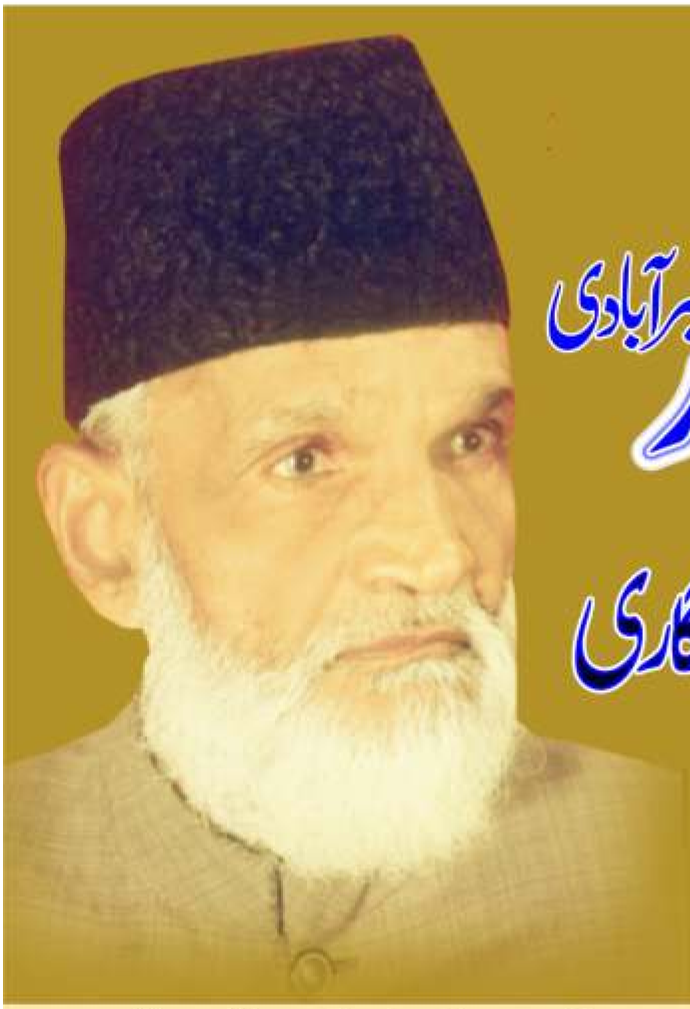

فاروق اعظم قاسمی

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی مکتوب نگاری

مولانا سعید احمد اکبر آبادی دیو بند کے فاضل، ممتاز عالم دین، منجھے ہوئے صحافی، مورخ، خطیب اور مفکر و دانشور تھے۔ مولانا اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبان میں تقریر کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ اللہ نے قلم کی بیش بہا دولت سے بھی نوازا تھا۔ تین سال (1943-1946) کے وقفے کے ساتھ 1938-1985 تک مشہور زمانہ ماہنامہ 'برہان' دہلی کے مدیر رہے۔ مولانا پیشے سے معلم تھے، درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی ان کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ انھوں نے برہان کی چوالیس سالہ ادارت میں اپنے وقیع اداریوں کے ساتھ سیکڑوں بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین و مقالات بھی تحریر فرمائے، شخصی مضامین اور تبصرے بھی لکھے۔ اسی کے ساتھ مختلف موضوعات پر تقریباً بیس کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔ مختلف رسائل وجرائد میں منتشر مولانا کے سیکڑوں مقالات کو اگر یکجا کیا جائے تو ان کے بھی کئی مجموعے بن سکتے ہیں۔

خط نگاری کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ عربی خط نگاری کا سراغ بھی ماقبل اسلام مل جاتا ہے۔ فارسی میں بھی نامہ نویسی کی تاریخ قدیم ہے؛ بلکہ فارسی خط نگاری ہی کی راہ سے اردو خط نگاری کا چشمہ پھوٹا۔

سردست اردو خط نگاری کے آغاز وارتقا پر مختصر گفتگو مقصود ہے۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود اردو خطوط کے ایک قدیم مخطوطے کے حوالے سے خواجہ احمد فاروقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو خط نگاری کی تاریخ کا نقطۂ آغاز 1762 ہے۔[1] اسی کے ساتھ فاروقی صاحب اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ خطوط ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہیں۔ لکھتے ہیں: ''ادبی اعتبار سے یہ خطوط زیادہ اہم نہیں ہیں...... ان کی قدامت البتہ اہم ہے''۔[2]

مکتوباتی ادب کے معروف نقاد پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا خط 1803 میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں: ''ان (آرزو) کی تلاش وتحقیق کی رو سے اردو کا پہلا خط 1803 میں لکھا گیا جس کی مکتوب نگار فقیرہ بیگم اور مکتوب الیہ مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت بہادر ظفری دہلوی (1818-1859) تلمیذ میر تھے۔''[3]

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں اردو خط نویسی کی تاریخ اور آغاز وابتدا کا ایک حد تک علم ہو جاتا ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ خالص ادبی حوالے سے یا آسان نثر کی رو سے خطوط غالب نے جو انقلاب برپا کیا اس سے قطعاً انکار کی گنجائش نہیں۔

ابتدائی دور میں خط لکھنے کے بعد اسے منظر عام پر لانے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ دو افراد کے درمیان خط میں بہت سی راز ونیاز کی باتیں ہوتی تھیں، لیکن خط میں جب ذات کے ساتھ اجتماع بھی داخل ہوا تو اس کو افادۂ عام کے لیے اشاعت وطباعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ پروفیسر محمد علی اثر کی حالیہ تحقیق کے مطابق خطوط کا پہلا مجموعہ 'مہر غالب' 1862 میں منظر عام پر آیا۔ جس کے مرتب عبد الغفور سرور تھے۔[4]

اس کے بعد بیسویں صدی کے نصف اول تک یہ سلسلہ بڑے زور وشور سے چلتا رہا۔ آغاز میں کسی معروف شخصیت کے متعدد خطوط کو جمع کرنے کا رواج تھا، پھر کسی ایک معروف یا غیر معروف شاعر وادیب کے نام مشاہیر کے خطوط کو مرتب کرنے کی بنیاد پڑی اور ساتھ ہی شخص واحد کے مختلف حضرات کے نام مکتوباتی مجموعے بھی شائع ہونے لگے، اس کے بعد تو رسالوں میں بھی مشاہیر اہل علم وادب کے قابل ذکر خطوط کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا بلکہ آج جو اخبارات ورسائل میں مراسلاتی کالم کا رواج ہے ممکن ہے اسی کے زیر اثر شروع ہوا ہو۔

خطوط کی جمع وترتیب اور مکتوباتی ادب کو ایک سمت عطا کرنے میں لاہور کے محمد طفیل مرحوم کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ 'نقوش' کا مکاتیب نمبر دو جلدوں میں اور نقوش ہی کا خطوط نمبر تین جلدوں میں ہزاروں صفحات پر مشتمل اردو خطوط کا بیش بہا خزانہ ہے۔

رجب علی بیگ سے اقبال تک مکتوباتی ادب کا ایک سنہری دور دکھائی دیتا ہے، اس کے بعد جوں جوں جدید ذرائع ووسائل اور مواصلاتی نظام نے ترقی کی رفتار تیز کی؛ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا، دوریاں گھٹنے اور فاصلے سمٹنے لگے تو خط وکتابت کا یہ کاغذی نظام بھی ماند پڑ گیا، مگر گزشتہ بیس پچیس برسوں سے بڑی برق رفتاری کے ساتھ اس میں اضمحلال پیدا ہوا ہے اور مکتوباتی عمل کے زیر اثر قوت فکر وادب میں جو جلا پیدا ہوتی تھی اس کا سوتا خشک ہو کر رہ گیا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مختلف مقامات میں مختلف مناصب پر فائز رہے لیکن دو پلیٹ فارم انتہائی قابل ذکر ہیں۔ ایک ندوۃ المصنفین دہلی اور دوسرے مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ۔علی گڑھ میں 1959 سے 1972 تک شعبۂ دینیات سے وابستہ رہے اور 1938 سے اپنی وفات (1985) تک ندوۃ المصنفین بطور خاص اس کے ترجمان اور مشہور زمانہ رسالہ 'برہان' کی ادارت سے جڑے رہے۔ 43 سے 46 تک تین سال کے وقفے کے ساتھ چوالیس برسوں تک برہان سے مولانا کا جسم و جان کا رشتہ رہا۔ یہ دونوں ایسے پلیٹ فارم تھے کہ مولانا کی سیکڑوں لوگوں سے مراسلت رہی ہوگی جو ایک مستقل تحقیق کا موضوع ہے۔ اُس زمانے میں مشاہیر کے خطوط کی رسائل میں اشاعت کا عام رواج تھا لیکن اس کے برعکس برہان میں اس کا اہتمام نہیں تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے ایک بہت اہم خط کو شائع کرتے ہوئے ایک نوٹ میں لکھا ہے: 'برہان' اور اس کے مضامین سے متعلق دفتر میں اور مجھ کو یہاں آئے دن خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں لیکن کبھی کوئی خط شائع نہیں کیا جاتا۔''5 اس اقتباس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنے یا دوسروں کے خطوط کی حفاظت کا کوئی خاص اہتمام مولانا اکبر آبادی کے یہاں نہیں تھا۔

مولانا کی مراست علامہ سید مناظر احسن گیلانی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا عبد الماجد دریابادی، ضیاء احمد بدایونی، بیٹی ریحانہ، پروفیسر عبد العلی (انگریزی خط)، شورش کاشمیری، مولانا علی میاں ندوی اور سید صباح الدین عبد الرحمٰن وغیرہ سے ہوئی ہے۔ درجنوں مجموعہ ہائے خطوط کو چھاننے کے بعد ان ہی ناموں تک رسائی ہو پائی ہے جن سے مولانا کے مکاتبت کا ثبوت ملتا ہے یا ان کے خطوط مولانا کے نام ملتے ہیں۔ مفتی ظفیر الدین مفتاحی کے نام 21 خطوط، مفتی عتیق الرحمٰن کے نام چھ خطوط، بیٹی کے نام ایک خط، ضیا احمد

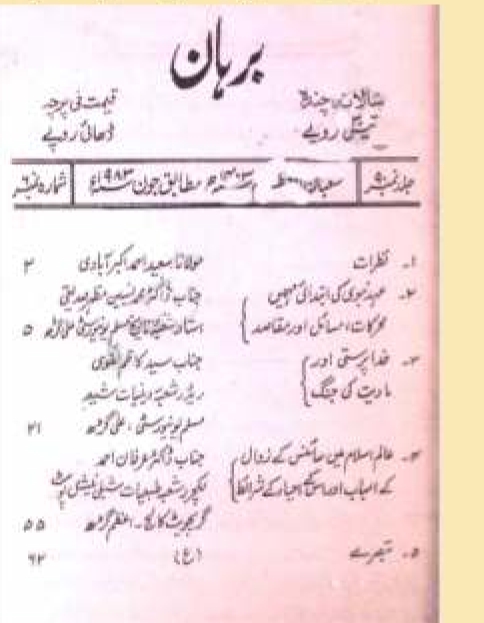
برہان

قیمت فی پرچہ
ڈھائی روپے

1. نظرات — مولانا سعید احمد اکبر آبادی
5. تبصرے

بدایونی کے نام ایک خط، پروفیسر عبد العلی کے نام ایک خط ہے۔ علامہ گیلانی، علی میاں، سید صباح الدین عبد الرحمٰن وغیرہ سے بھی اکبر آبادی کی مراسلت کا ثبوت ملتا ہے اور مکتوبات ماجدی جلد سوم میں مولانا اکبر آبادی کے نام مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے 76 خطوط درج ہیں لیکن اکبر آبادی کے نام دریابادی کسی ایک خط کا اب تک سراغ نہیں لگ پایا ہے۔

موضوعاتی حوالے سے ان خطوط پر اگر گفتگو کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تمام خطوط کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ مفتی ظفیر صاحب کے نام خطوط مختلف علمی موضوعات پر تبادلۂ خیال پر مشتمل ہیں، ان خطوط میں مولانا اپنے ایک علم دوست کی تربیت و رہنمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی علم پروری اور خرد نوازی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ 15 دسمبر 1954 کے اپنے ایک خط میں مولانا تحریر فرماتے ہیں: '' برہان میں آپ کے جو مقالات نکلتے ہیں وہ پڑھتے ہیں اور انھیں کو پڑھ کر میں اس فکر میں ہوں کہ آپ کے لیے معاشی اطمینان کی کوئی راہ اللہ پیدا کر دے تاکہ آپ اپنے ذوق کے مطابق اطمینان سے تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں۔ ماشاءاللہ آپ خوب کام کر رہے ہیں۔ آپ سے بڑی توقعات ہیں۔''6

ان خطوط میں اس رنگ کو بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک بڑے کو ایک چھوٹے کی ہمت افزائی، ذہن سازی اور تربیت کیسے کی جانی چاہیے۔ اسی طرح مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے نام چھ خطوط ہیں جو اکبر آبادی نے اپنے بیرونی ممالک کے دورے کے دوران لکھے تھے۔ یہ دراصل برہان کے نظرات میں سات حصوں میں علی الترتیب شائع ہوئے تھے۔ اکتوبر 1962، فروری تا مئی 1963، اپریل 1973 اور ستمبر 1981 تک۔ چونکہ دیگر رسائل کی طرح برہان میں خطوط کی اشاعت کا معمول نہیں تھا اس لیے مفتی صاحب کے بھی مکمل خط رسالے کے حوالے نہیں کیے بلکہ ان کے یہاں اس موقعے سے ایک جھجک سی نظر آتی ہے۔ بلکہ اکبر آبادی کے خطوط بھی اس لیے شائع کر رہے ہیں تاکہ بغیر کسی فصل کے قارئین برہان سے ان کا ربط قائم رہے۔

یہ سب سے پہلا خط ہے اور غالباً اکبر آبادی ابھی کناڈا کے ایک پر رونق شہر مونٹریال پہنچے ہی ہیں لیکن وہاں کے انتظام و انصرام اور اعلیٰ رہائش سے مولانا بہت متاثر ہوئے اور صحیح معنوں میں انھیں صحت، حسن اور جوانی کا مفہوم اب سمجھ میں آیا ہے۔ اولاً مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی علالت پر افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے اور بروقت ماہر ڈاکٹر سے تشخیص کرا لینے کی تاکید کر رہے ہیں۔ مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''یہاں آکر پتہ چلا کہ صحت، حسن اور جوانی کیا چیز ہے جسے دیکھیے سرخ و سفید، شگفتہ و شاداب، تندرست و توانا، آب و ہوا بہترین، غذائیں اعلیٰ اور خالص، نہ مچھر نہ مکھی نہ مٹی نہ دھواں نہ گرد و غبار، نہ کہیں غلاظت نہ گندگی، ہر چیز ٹیپ ٹاپ اور صاف ستھری، زندگی کا معیار اتنا اونچا ہے کہ یونیورسٹی کا ایک ایک طالب علم بھی اپنے کمرے میں ٹیلی فون، ریڈیو سٹ، ریفریجریٹر، برقی چولھے، ہیٹر اور صوفہ سِٹ رکھتا ہے اور اس کے غسل خانے میں بیک وقت سرد و گرم پانی کے نل ہوتے ہیں، بڑی بڑی کاروں کا کوئی حد و حساب اور شمار ہی نہیں ہے۔ چپراسی، بیرا، خانساماں اور مزدور وقلی کا کہیں وجود نہیں ہر شخص اپنا کام خود کرتا ہے، یونیورسٹی میں چائے کی ایک پیالی بھی درکار ہوتی ہے تو بڑے سے بڑا پروفیسر خود کھانے کے کمرے میں جا کر چائے بنائے گا اور خود پیالی دھو دھا اور کپڑے سے پونچھ کر الماری میں رکھے گا۔''7

دوسرا خط بطور اداریے کے درج ہے حالانکہ مولانا اکبر آبادی نے واپسی پر مستقل سفرنامہ تحریر کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے تاہم مفتی صاحب اس خط کو اس لیے شامل 'نظرات' کر رہے ہیں کہ اس میں ترکی کے ایک اہم گوشے کا تذکرہ ہے۔ مولانا کو ترکی کی مغربی خاکستر میں اسلامیت کی تڑپتی ہوئی بے چین چنگاری نظر آ رہی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: ''ایک مرتبہ اپنے ہوٹل سے نکل رہا تھا کہ اچانک ایک 'جوڑے' کا سامنا ہوا، مرد اور عورت دونوں جوان، فرنگی صورت اور فرنگی لباس، چہرہ مہرہ اور لباس کی یکسانیت کے باعث یہاں محض دیکھ کر پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کس مذہب اور کس ملک کا آدمی ہے۔ بہرحال مسلمان ہونے کا خیال تو ہوتا ہی نہیں۔''8 بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا جس انسٹی ٹیوٹ میں گئے تھے وہیں وہ جوان بھی ریسرچ اسسٹنٹ ہے، اسی انسٹی ٹیوٹ کے ایک پروفیسر رشیدی نے سعودی عرب کی اجازت سے انڈونیشیا کے لیے حج کی ایک فلم تیار کی تھی۔ اسے دیکھنے کا پروگرام بنا، سارے طلبہ و اساتذہ موجود تھے، انھیں میں وہ نوجوان یعنی ڈاکٹر طوغ اور ان کی اہلیہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ جوں ہی مدینہ کے گنبدِ خضرا کا منظر سامنے آیا دونوں سے ضبط نہ ہو سکا اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لگ گئی، جی تو میرا بھی بھر آیا اور ایک میں ہی کیا، ہر مسلمان مرد اور عورت، لڑکا اور لڑکی ہر ایک پر رقت طاری ہوگئی، مگر ان کا تو حال ہی کچھ اور تھا، زبان، الفاظ اور آنکھیں آنسوؤں کے ذریعے درود و سلام کا نذرانہ پیش کر رہی تھیں۔''9

مصطفیٰ کمال اتاترک کے بعد ایک بار پھر بڑی تیزی سے اسلام ترکی میں زندہ ہو رہا تھا۔ اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑ رہا تھا۔ مساجد، اسکول و کالج اور یونیورسٹیوں میں بھی مذہبی وسماجی بیداری پیدا ہو رہی تھی اور لطف کی بات یہ کہ ان تمام سرگرمیوں میں نوجوانوں کا حصہ زیادہ تھا۔ یہ قصہ پچپن سال پہلے کا ہے اور ترکی کے بارے میں مولانا نے جو خواب دیکھا تھا آج وہ سچ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

کناڈا سے ہی ایک دوسرا طویل خط مولانا اکبرآبادی نے لکھا جو برہان (مارچ 1963) کے چھ صفحات پر محیط ہے۔ اس خط کا عنوان 'کناڈا کے مسلمان' بھی درج ہے جو شاید مفتی صاحب کا خود کا اضافہ ہے۔ اس خط میں کناڈا کے مسلمانوں کے تہذیبی، معاشی، تعلیمی اور دینی احوال کا قدرے تفصیلی بیان ہے۔ مونٹریال کناڈا کا سب سے قابل ذکر اور خوب صورت شہر ہے، یہاں کی دو اہم یونیورسٹیوں میں ایک مک گل یونیورسٹی ہے۔ اسی سے مولانا کی عارضی وابستگی تھی۔ اُس وقت وہاں عرب، ترکی، افریقہ اور پاکستان و ہندوستان سے مہاجر مسلمانوں کی تعداد ڈھائی سو تھی۔ یہ مسلمان تقریباً اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور سرکاری وغیر سرکاری اچھے مناصب پر فائز ہیں اور خوش حال ہیں۔ خود یہاں کے اصل باشندے بھی مسلمان ہو رہے ہیں۔ کناڈا کی بے تعصب اور آزاد سوسائٹی کے بارے میں مولانا رقم طراز ہیں: ''چونکہ یہاں کی سوسائٹی آزاد اور خوش حال ہے اس لیے کوئی کسی قسم کے دباؤ یا لالچ سے تو مسلمان ہوتا نہیں ہے۔ جو اسلام قبول کرتا ہے دل سے کرتا ہے اور بڑی حد تک اعمال وافعال کے اعتبار سے مسلمان ہوتا ہے، پھر بڑی بات یہ ہے کہ اس کے خاندان والے یا اس کے دوست احباب اس سے کوئی تعصب نہیں برتتے۔''[10]

یہاں مسلمانوں کو اپنے اسلام پر فخر ہے اور وہ کسی طرح بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہیں۔ مولانا نے اس کے تین اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

یہاں اب تک کوئی مسجد نہیں ہے لیکن اس کی تیاری ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی تمام دینی ضروریات اسلامک سنٹر سے انجام دی جاتی ہیں، جمعہ کی نماز انسٹی ٹیوٹ کے کامن روم میں ہوتی ہے اور عید اگر اتوار کو پڑ جائے تو گرجا والے بخوشی اپنا گرجا نماز کے لیے دے دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد تو نہیں البتہ یہ چھوٹی سی جماعت تمام مسالک بلکہ شیعہ وسنی سب کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ رمضان میں ہفتے میں دو بار تراویح کی نماز ہو جاتی ہے وہ بھی برضاء ورغبت کوئی اپنا گھر اس اہم فریضے کی ادائیگی کے لیے پیش کر دے تب۔ یہاں کی آبادی چونکہ پھیلی ہوئی ہے اس لیے لوگ بیس بیس پچیس پچیس کلو میٹر سے کاروں کے ذریعے اس اجتماع میں شرکت کرنے چلے آتے ہیں۔

اپریل 1963 کے نظرات میں درج مکتوب کا عنوان 'عید' ہے۔ اس خط میں دراصل مغربی ماحول میں مشرقی مہاجرین کی عید کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ مسجد کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک گرجا میں نمازِ عید کا انتظام کیا گیا، اسلامک سنٹر کے ذریعے یہ طے پایا کہ امامت ڈاکٹر رشیدی اور خطبہ مولانا اکبرآبادی دیں گے۔ فقراء ومساکین کے نہ ہونے کی بنا پر فطرہ کی تمام رقوم کو سنٹر ہی میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ نماز رشیدی صاحب نے اور خطبہ مولانا نے انگریزی زبان میں دیا۔ ان کے خطبے کا اردو ترجمہ بھی یہاں مذکور ہے۔ خطبے میں انھوں نے مسلمانوں کو ان کی دینی اور تبلیغی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا۔ ختم نبوت کے بعد کارِ نبوت کو آگے بڑھانے اور ساری دنیا میں پھیلانے کا کام اب ہمارے کاندھوں پر ہے۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی باتوں کی مزید تشریح کی ہے۔ نماز وخطبہ جس کی فلم بنائی گئی تھی اسے شام کو فرانسیسی شعبے سے اور دوسرے دن انگریزی سیکشن میں ٹیلی ویژن پر نشر کیا گیا پھر تقریباً تین صفحات میں پٹنہ کے اپنے ایک مخلص میزبان حبیب اللہ خان صاحب اور ان کے امریکی نژاد اور انتہائی قابل داماد عبدالرحمٰن کی خوبی، اخلاص، محبت اور ان کی دینی حمیت وکیفیت کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ مولانا اپنے خط کے اخیر میں لکھتے ہیں: ''اس سے مقصد یہ دکھانا ہے کہ خدا جنھیں توفیق عطا فرماتا ہے وہ کافرانہ ماحول وفضا میں رہتے ہوئے بھی احکام الٰہی کی پابندی کرتے اور دین کی عزت وآبرو رکھتے ہیں اور جنھیں توفیق نہیں ہوتی وہ بلدہ حرام وامین میں بھی رہتے سہتے ہتکِ حُرمات وشعائر کرتے ہیں اور درحقیقت اگر کوئی غور کر لے تو یہ خود بہت بڑا سبق ہے۔''[11]

کناڈا ہی سے مئی 1963 کے ایک خط میں مولانا نے خالص اپنی علمی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ متعلقہ انسٹی ٹیوٹ بڑی اہمیت کا حامل تھا اس لیے کہ وہاں مختلف ممالک کے نامور اہل فضل وکمال آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا اکبرآبادی کی بہت سے اہلِ علم ودانش سے ملاقاتیں رہیں لیکن دو مستشرق علما کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ پروفیسر جوزف شاخت اور پروفیسر فلپ کے حتی۔ اول الذکر کی 'اسلامی فقہ کے مآخذ' اور دوسرے کی 'تاریخ عرب' مشہور عالم کتاب ہے۔ مولانا ان دونوں کے علم وتحقیق کے تو قائل تھے ہی لیکن ان کے اخلاق واطوار، سادہ زندگی، سادہ لباس وخوراک، وقار وسنجیدگی اور اصول پسندی سے بہت متاثر ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''اصول پسندی اور ڈسپلن کے لیے ہر جگہ مشہور ہیں مگر طبیعت کے بے حد سادہ اور مزاج کے بڑے شگفتہ اور بے تکلف ہیں، ایک پرانا سا سوٹ نیلے رنگ کا پہنے ہوئے تھے جو معلوم نہیں کب سے استری کے لمس سے محروم تھا، پاؤں میں بوٹ بھی بغیر پالش کے تھے، پاس ہی میز پر ان کا چمڑہ کا تھیلا رکھا ہوا تھا جو صورت حال سے کہہ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے پروفیسر کی ملکیت ہے جو 'خوردن برائے زیستن' پر ایمان رکھتا ہے۔ ان کی اس سادگی کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا اور فوراً عربی کا وہ مشہور مقولہ یاد آیا کہ " العلم لا یعطیك بعضه حتی لا تعطیه کللك."[12]

مولانا پروفیسر شاخت کی حدیث پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے اس لیے دورانِ گفتگو ان کی ایک غلطی کی طرف توجہ دلائی تو پروفیسر نے بڑی خندہ پیشانی سے سوال سن کر اسے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ رخصت ہوتے وقت بڑے پُرتپاک انداز میں ملاقات کرتے ہوئے مولانا سے وعدہ لیا کہ جب بھی وہ نیویارک آئیں ان سے ضرور ملیں کیوں کہ اس وقت وہ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔

اسی طرح پرنسٹن یونیورسٹی میں مولانا کی ملاقات پروفیسر حتی سے ہوئی جہاں پہلے ہی سے قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کے دو استاذ پروفیسر پطروس عبدالملک اور مصطفیٰ زیادہ اور ایک ملایا کے پروفیسر محمد محی الدین تشریف فرما تھے۔ یہ تینوں عربی بولنے والے تو تھے ہی حتی بھی چونکہ عربی النسل تھے اس لیے وہ بھی اس پر قادر تھے۔ موضوع گفتگو عربی زبان کا جدید وقدیم ادب ورجحانات اور عرب نیشنلزم تھا۔ جب مولانا رخصت ہونے لگے تو حتی نے ان سے کہا: ''آپ ابھی واپس ہو رہے ہیں اس کا بڑا افسوس ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کا یہاں قیام ذرا اور ہوتا تو ہم لوگ آپ سے استفادہ کرتے۔ میں نے کہا: آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ میں تو آپ کا معنوی شاگرد ہوں کیونکہ آپ کی کتاب پڑھ کر میں نے ایم، اے کا امتحان دیا ہے۔''[13]

ملایا کے پروفیسر محی الدین شیخ الہند کے ایک ملایا شاگرد شیخ احمد خراسانی کے شاگرد نکل آئے اور ان کے دو اور بھائی بھی فاضل دیوبند تھے، پھر کیا تھا ان کا دوستانہ مزید خوشگوار ہو گیا اور نیویارک سے مونٹریال، مونٹریال سے لندن تک ہم رکابی رہی۔

جنوبی افریقہ ڈربن سے مولانا نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے نام دو خط اور تحریر کیے ہیں۔ پہلے خط میں جہاز کے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے کچھ دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔ دراصل مولانا کا یہ سفر کوئی علمی یا ادبی نہیں تھا لیکن ان کی آمد کی خبر سن کر بہت سے قدرشناسوں کی ملاقاتوں کا

سلسلہ چل پڑا اور کئی جگہوں پہ انھیں خطاب بھی کرنا پڑا۔ اس خط میں مولانا نے افریقہ کے حسن، موسم کی خوشگواری، صفائی ستھرائی اور اشیائے خورد ونوش کی تعریف کی ہے۔ حسنِ اتفاق سے رمضان بھی شروع ہوگیا ہے اور تراویح بھی جاری ہے۔ اسی طرح خط میں مولانا اکبرآبادی نے اپنی مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کا ذکر کیا ہے اور وہاں کی انتظامیہ کے ایک فیصلے پر افسوس کا اظہار بھی۔ اپنے میزبان کی بھی بڑی تعریف کی ہے جنھوں نے ان کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی۔[14]

24 ستمبر 1962 کے ایک خط بنام بیٹی ریحانہ بھی کناڈا سے لکھا جس کا پورا حصہ میرے سامنے نہیں ہے، تاہم جو بھی ہے اس میں مولانا نے وہاں کی تہذیب اور بے تصنع زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، یوروپ کے علم اور صاحبِ علم کی قدر شناسی کو یوں بیان کیا ہے:

''یہ لوگ ہندوستانی کی بڑی عزت کرتے ہیں اور پھر پروفیسر کا خاص طور پر ان کے وہاں بڑا اونچا مقام ہے اس لیے مجھے جو ملتا ہے بڑی عزت ومحبت سے ملتا ہے۔ کھانے پینے اور رہنے کا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام ہے؛ البتہ میری اپنی زبان اردو چھٹتی جاتی ہے۔ جمعہ کی نماز میں ہندوستانی اور پاکستانی مل جاتے ہیں تو بس ان سے اردو میں بات کر کے جی خوش کر لیتا ہوں۔''

علی گڑھ سے 23 اگست 1960 کا لکھا مولانا کا ایک مختصر خط ضیاء احمد بدایونی کے نام ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ٔ فارسی کے پروفیسر تھے۔ اس میں انگلینڈ سے جاری ایک تبلیغی پرچے کا ذکر کیا جا رہا ہے اور اس میں مکتوب الیہ کی ایک نظم کی اشاعت کی اطلاع دی جا رہی ہے۔[15]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر عبد العلی جن کا وطن بھوپال تھا، کو بھی مولانا نے ایک خط لکھا اور وہ بھی انگریزی زبان میں۔ خط کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ یا تو مولانا کا کوئی شاگرد ہے یا عزیز ہے۔ اس سے معذرت بھی کر رہے ہیں، اس کی ہمت افزائی بھی کر رہے ہیں اور دعائیں بھی ڈھیر ساری دے رہے ہیں۔[16]

ایک عمدہ نثر کی علامت یہ ہے کہ وہ غیر مبہم، واضح، اور رواں ہو۔ بے ساختگی بھی نثر کا ایک اہم وصف ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جملہ نثری اصناف میں خط نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں سب سے زیادہ بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ خط نگاری کی بنیادی خصوصیت بے ساختگی ہے اس لیے کہ خط گفتگو ہی کی تحریری شکل ہے۔ اسی کو غالب کی

میرے قلم کا ایک خاص انداز ہے جس میں تحلیل و تجزیۂ نفسی کے ساتھ سنجیدگی اور غیر جانبداری بھی ہوتی ہے ... یوں ہونے کو تو میں خالص دیوبندی ہوں ، کٹر حنفی ہوں، سیاست میں بالکل کانگریسی ہوں لیکن تحریر کے وقت محض طالب علم ہوتا ہوں اور دماغ سے ہر قسم کی عصبیت کو باہر نکال دیتا ہوں ، اسی وجہ سے میری تحریر میں اثر ہوتا ہے اور موافق و مخالف دونوں اس کو پڑھتے ہیں ... دھڑے بندی ایک قلم کی سب سے بڑی کمزوری ہے ۔ میں ہمیشہ اس آلودگی سے اس کو پاک رکھتا ہوں

زبان میں مکالمت کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان بنیادی خصوصیات سے کوئی خط خالی ہو تو اسے خط نہیں مضمون کہا جائے گا۔ مولانا اکبرآبادی کی خط نگاری کو اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے اکثر خطوط ان اصولوں پر کھرے اترتے ہیں تاہم بعض خطوط اپنی طوالت کی وجہ سے مقالے کی سرحد چھونے لگتے ہیں۔ مثلاً مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے نام خطوط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو کوئی مقالہ پڑھ رہے ہیں یا خودنوشت سوانح۔ اس کے باوجود اکبرآبادی کی نثر آبشاری اور رواں دواں ہے۔ وہ بہت ہی نپے تلے انداز میں اپنی بات کہنے کے عادی ہیں۔ مولانا کا لہجہ علمی اور سادہ ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ دیتے ہیں۔ علمی ناطرفداری بھی ان کے قلم کا خاصہ ہے۔ انھوں نے خود اپنے طرزِ نگارش کے بارے کہا ہے:

''میرے قلم کا ایک خاص انداز ہے جس میں تحلیل وتجزیہ نفسی کے ساتھ سنجیدگی اور غیر جانبداری بھی ہوتی ہے... یوں ہونے کو تو میں خالص دیوبندی ہوں، کٹر حنفی ہوں، سیاست میں بالکل کانگریسی ہوں لیکن تحریر کے وقت محض طالب علم ہوتا ہوں اور دماغ سے ہر قسم کی عصبیت کو باہر نکال دیتا ہوں، اسی وجہ سے میری تحریر میں اثر ہوتا ہے اور موافق ومخالف دونوں اس کو پڑھتے ہیں... دھڑے بندی ایک قلم کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں ہمیشہ اس آلودگی سے اس کو پاک رکھتا ہوں''۔[17]

ان سطور سے مولانا کے قلم کی بے تعصبی، حق گوئی اور نثری خوبیوں کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ ان کے قلم کے ان ہی امتیازات کی بنا پر ہر حلقے میں ان کی تحریر مقبول اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ اس وقت راقم کے سامنے مولانا کے محض تیس خطوط ہیں جو 'مشتے نمونہ از خروارے' ہیں اور ان کی مکتوب نگاری کی تفہیم کے لیے کافی ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی جملہ تحریریں ادبیت سے بھرپور ہیں لیکن افسوس کہ اردو ادب میں تیسرے چوتھے درجے کے لکھنے والوں کو ادبی تاریخ کا حصہ بنایا جاتا ہے، انھیں تمغوں سے نوازا جاتا ہے اور ان کی جھوٹی عظمتوں کے گیت گائے جاتے ہیں لیکن اکبرآبادی جیسے اول درجے کے لکھنے والوں کا دور دور تک ادبی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جب کہ انھوں نے چالیس برسوں تک ایک شہرۂ آفاق علمی، دینی اور ادبی رسالے 'برہان' کی ادارت کی، سفر نامہ تحریر کیا، خطوط لکھے، شبلی کی سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے 'صدیق اکبرؓ' اور 'عثمان ذوالنورینؓ' جیسی شاہکار تصانیف یادگار چھوڑیں۔

مذکورہ بالا سطور سے راقم کا مقصد یہی ہے کہ مولانا اکبرآبادی جیسے اردو زبان وادب کے اساطین کو لسانی و ادبی تاریخ کا حصہ بنایا جانا چاہیے تاکہ ہم اپنا فرض اور قرض بھی ادا کرسکیں اور ہماری ادبی تاریخ مزید صحت مند و صحت بخش بن سکے۔

حواشی:

1. مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخ ارتقا، ص ص: 55-54
2. مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخی ارتقا، ص ص: 57-56
3. مکتوباتی ادب، بریلی، ناشر ومصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی (2010) ص: 115
4. مکاتیب مشاہیر، پروفیسر محمد اثر (2013) ص: 28
5. ماہنامہ 'برہان' دہلی، جنوری 1950
6. مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلات، مرتب: محمد ظفیر الدین مفتاحی، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز نئی دہلی (1977) ص: 212
7. ماہنامہ 'برہان' دہلی، اکتوبر 1962
8. ماہنامہ 'برہان' دہلی، فروری 1963
9. ماہنامہ 'برہان' دہلی، فروری 1963
10. ماہنامہ 'برہان' دہلی، مارچ 1963
11. ماہنامہ 'برہان' دہلی، مارچ 1963
12. ماہنامہ 'برہان' دہلی، مئی 1963
13. ماہنامہ 'برہان' دہلی، مئی 1963
14. ماہنامہ 'برہان' دہلی، ستمبر 1981
15. مکتوبات: مرتب کے نام معاصر کے خطوط، مرتب: ضیاء احمد بدایونی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (1967) ص: 101
16. مولانا سعید احمد اکبرآبادی: احوال وآثار، مرتب: ڈاکٹر مسعود عالم قاسمی، شعبہ سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (2005) ص: 13-14
17. مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلات، ص: 218

■

Dr. Farooq Azam Qasmi
Mashki Pur, Jamalpur
Khagaria - (Bihar)

عبدالباری قاسمی

پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی
شخص و عکس

پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی بیسویں صدی کے ایک جید عالم دین اور جہاں دیدہ شخص تھے، وہ جہاں علوم دینیہ پر گہری نگاہ اور دسترس رکھتے تھے وہیں علوم عصریہ کو گرفت میں لے رکھا تھا، قدیم وجدید دونوں ہی علوم پر درک اور عبور حاصل تھا، فکرو خیال کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے بس اتنی بات کافی ہے کہ اس زمانے میں جب علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان کافی گہری کھائی نظر آتی تھی، باہمی تعلقات اچھے نہیں تھے اس زمانے میں بھی انھوں نے ایسی ڈگر اور راہ اپنائی کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی اور صدر شعبہ دینیات بھی رہے اور دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ بھی، اس وقت کے علمائے دیوبند میں سب سے منفرد نظریہ رکھنے والے دانشور تھے، کسی ادارہ کو کیسے ترقیات کے منازل طے کرائے جاتے ہیں اس کا بھی ملکہ تھا تو بے باک صحافت کے ذریعہ ملک اور قوم وملت کو آئینہ دکھانے کا ہنر بھی بلا کا تھا، حق کو حق اور غلط کو غلط کہنے کی ایسی صلاحیت اور ہمت رکھتے تھے کہ خواہ اپنا ہو یا پرایا، عالم ہو یا دانشور، سبھی کی غلطیوں کی نشاندہی بلا جھجک اور بے باک طریقے پر کیا کرتے تھے، ان کے زمانہ ادارت میں پورے برصغیر میں ماہنامہ برہان کا کوئی ثانی رسالہ نہیں تھا، زبان بھی صاف وسلیس اور اسلوب میں بھی پختگی اور ندرت ان کو اگر ادیب کی صف میں رکھا جائے تو بڑے ادیب، دانشوروں کے ترازو میں تولا جائے تو دانشور، علما کے صف میں یکتا اور صحافی کے صف میں انصاف پسند اور صحافتی رموز و اصول سے آشنا صحافی اور پروفیسروں کے صف میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔

اور ایسا اس لیے بھی ہوا کہ ان کی تعلیم ہی ایسے ماحول میں ہوئی کہ بڑے سلیقے اور قرینے سے تراشا اور نکھارا گیا دارالعلوم دیوبند میں بھی ان کو جید علما اور صلحا سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا اور سینٹ اسٹیفن کالج میں بھی ان کو جوہر شناس اساتذہ ملے جنھوں نے انھیں ایک تجربہ کار جوہری کی طرح تراشا اور سنوارا جس کے نتیجے میں ایسے آفتاب وماہتاب بنے کہ پوری دنیا میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی روشنی سے دنیا کو منور کر رہے ہیں۔ یورپی ممالک میں بھی اور برصغیر میں بھی بڑے بڑے دانشوران کے شاگرد ہوئے بلکہ پڑوسی ملک کے سابق حکمراں جنرل ضیاء الحق بھی ان کے شاگرد تھے اس کا اعتراف جنرل ضیاء الحق نے انتقال کے بعد اپنے تعزیتی مکتوب میں بھی کیا ہے۔

پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی پیدائش نومبر 1908 میں اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی، اسی مناسبت سے اکبرآبادی کہلاتے ہیں۔ ورنہ اصل آبائی وطن بچھرایوں ضلع مرادآباد ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے والد ماجد کا نام ابرار حسین تھا، ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے، معالج کی حیثیت سے ہی آگرہ میں تعینات تھے۔

سعید احمد اکبرآبادی کے والد صاحب ایک تعلیم یافتہ شخص تھے اس لیے انھوں نے ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست بھی بہت ہی عمدہ کیا، سعید اکبرآبادی کی بسم اللہ کی رسم ایک مجذوب مزاج بزرگ میاں محمد افضل نے کرائی، اس کے بعد بنیادی عربی اور فارسی کی تعلیم ان کے گھر پر ہی ہوئی، ابتدائی تعلیم کے لیے ان کے والد نے دیوبند کے ایک عالم دین مولانا خورشید علی، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کی تعلیم اور ابتدائی علوم عصریہ کی تعلیم کے لیے ماسٹر مکٹ بہاری لال اور صرف ونحو کی تعلیم کے لیے مولانا غلام نور کا انتخاب کیا، ان حضرات سے سعید احمد اکبرآبادی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور عربی درجات کے اعتبار سے کافیہ اور قدوری تک کی تعلیم مکمل کی۔ آج مدارس کی جس طرح نصاب بندی ہے اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ عربی سوم تک کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔

ابتدائی عربی کی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد متوسط عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کے والد ماجد ڈاکٹر ابرار حسین صاحب نے سعید احمد اکبرآبادی کو مرادآباد کے مشہور تعلیمی ادارہ مدرسہ امدادیہ میں داخل کرایا اور ان کو کسی طرح کی وہاں دشواری نہ ہو اس لیے مکان کرایہ پر لے کر ان کی والدہ ماجدہ شمس النسا اور چھوٹی بہن قبول فاطمہ کو بھی ان کے ساتھ وہیں منتقل کر دیا، سعید احمد اکبرآبادی نے یہاں شرح جامی اور شرح وقایہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ یہاں ان کے اہم اساتذہ مولانا سید مرتضیٰ حسین چاندپوری، مولانا اسحاق کانپوری اور مولانا حنیف امروہوی وغیرہ تھے۔ سعید احمد اکبرآبادی کے

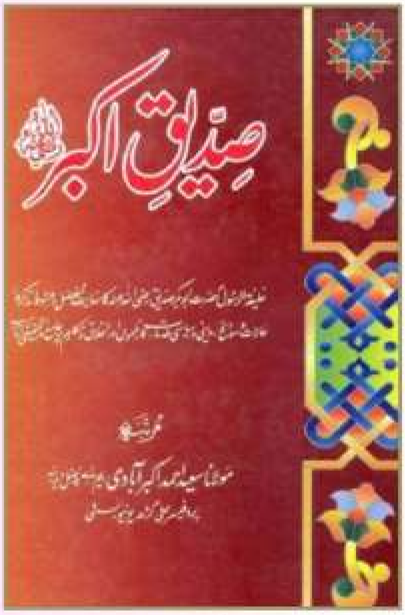

مطابق یہ 1921یا1922 کی بات ہے۔

مرادآباد میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے اہم استاد صدر مدرس مولانا مرتضی حسن چاندپوری تھے ،اسی سال وہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے اس لیے ان کے والد نے بھی انہیں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کرانے کا فیصلہ کر لیا اور مرادآباد کی طرح دیوبند میں بھی محلّہ شاہ ابولمعالی میں کمرہ کرایہ پر لے کر ان کو ٹھہرایا گیااور دیوبند میں ابتدائی دور باہر ہی گزرا ،اسی دور میں ان کے والد دیوبند تشریف لائے تو مولانا حبیب الرحمان عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبندنے کہا:ڈاکٹر صاحب! آپ فرزند کو تعلیم دلانے لائے ہیں یانوابی کرانے اس وقت ان کے والد نے ایک سال کی اجازت لی اور ایک سال بعد دارالاقامہ میں ہی منتقل کر دیااس وقت سعیداکبرآبادی کی رہائش دارالعلوم کے سینئر استادمولاناسیدسراج رشیدی کے ساتھ تھی ،اس وقت عمر13یا 14 سال تھی۔اس کے بعد سے 1925 فراغت دورہ حدیث تک احاطہ دارلعلوم میں ہی قیام رہا۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ کے اہم اساتذہ میں علامہ انورشاہ کشمیری، مفتی عزیزالرحمن عثانی ،مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ،مفتی اعزازعلی اورمولاناحسین احمد مدنی وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کی عصری تعلیم کا سلسلہ تو ایام طفولیت میں ہی شروع ہوگیا تھامگر دارالعلوم سے فراغت کے بعد 1928 میں ڈابھیل گجرات میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے تھے وہاں تین سال قیام کے بعدمدرسہ عالیہ فتح پوری میں استادمقرر ہوئے اب دوبارہ شوق ہوا کہ باضابطہ کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے کراعلی تعلیم حاصل کرنا چاہیے اسی کے پیش نظر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پرائیویٹ داخلہ لیا اوریہیں سے 1934 میں بی اے کی تعلیم مکمل کی ،اس کے بعد شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن کی دعوت پر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی یونیورسٹی میں ایم اے عربی میں داخلہ لیا اور 1936 میں ایم اے عربی مکمل کرنے کے بعداسی کالج سے ایم اے انگریزی کی بھی تعلیم مکمل کی اورحسن اتفاق ایسا ہوا کہ ادھر ان کی تعلیم مکمل ہوئی ادھر استاد محترم مولوی عبدالرحمٰن سبکدوش ہوگئے جس کے نتیجے میں آپ شعبے کے استادمقرر ہو گئے۔

باضابطہ تدریسی سفر کی ابتدا تو ڈابھیل گجرات اور عالیہ فتح پوری سے ہوچکی تھی مگر ایم اے سے فراغت کے بعد 1940-41 کے تعلیمی سیشن میں سینٹ اسٹیفن کالج میں عربی کے استادمقرر ہوئے اور جب دہلی یونیورسٹی میں عربی ،فارسی اوراردو کے مشترکہ شعبے کی بنیادرکھی گئی تو سعیداکبرآبادی ہی پہلے صدر بنائے گئے ،یہاں چھ سال تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد 1947 میں مرادآباد چلے گئے ،اسی درمیان ابوالکلام آزاد کی تحریک پر آپ کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر کیا گیا ،1959 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کرنل بشیر حسن زیدی کی دعوت پر بحثیت ریڈر اےایم یوتشریف لائے اورسنی دینیات کے صدر کے ساتھ ساتھ فیکلٹی کے ڈین بھی مقرر کیے گئے۔

1962 میں میک گل یونیورسٹی کینیڈا نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے لکچر دینے کے لیے مدعو کیا ،اس سفر میں آپ نے امریکہ ،برطانیہ اور چند اسلامی ممالک کا دورہ کیا۔ 1972 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے اور جامعہ ہمدرددہلی کے تحقیقی ادارہ سے وابستہ ہوئے۔ 1978 میں کالی کٹ یونیوروسٹی مالابار نے وزیٹنگ پروفیسر منتخب کیا یہاں ایک سال تک خدمات انجام دینے کے بعد 1979 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے اور ایک سال تدریسی فرائض انجام دیے۔ 25دسمبر 1982 میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکیڈمی کا قیام عمل میں آیاتو پہلا ڈائرکٹر آپ کو ہی بنایا گیااوراس وقت سے لے کروفات تک اسی عہدے پرجلوہ افروز رہے۔

1985 میں دیوبند میں ہی طبیعت خراب ہوئی اور اس عرصہ میں چھٹی بھی تھی اس لیے لاہور بیٹی کے یہاں تشریف لے گئے وہیں 24 مئی 1985 کو افطار کے وقت وضو کے لیے غسل خانہ تشریف لے گئے ،وہیں سے داماد کو آواز دی جنہیں مونا کہتے تھے انھوں نے لاکر بستر پر لٹایا مگر چندلمحہ میں ہی روح پرواز کرچکی تھی۔

26مارچ 1975 کوعربی زبان میں نمایاں خدمات انجام دینے کی وجہ سے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا، اس کے علاوہ دیگر انجمنوں اور اداروں کی طرف سے بھی انھیں اعزازات اوراکرامات سے نوازا گیا۔

سعیداکبرآبادی ایک دانشور اور روشن خیال مفکر و مصنف تھے انھوں نے تقریباً پچاس سال تک تدریسی، تعلیمی، تصنیفی اور صحافتی خدمات انجام دیں، انھوں نے مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر ایک درجن سے زاید کتابیں تحریر کیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ غیر معمولی پذیرائی حاصل کی؛ بلکہ متعدد کتابیں جامعات میں داخل نصاب بھی کی گئیں، آپ نے 1938 میں اپنے ہم عصر علما کے ساتھ مل کر'ندوۃ المصنفین' کے نام سے تصنیفی ادارہ قائم کیا، اسی کے زیر اہتمام مشہور رسالہ برہان جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر بھی بنے۔آپ کی تقریباً 20 تصانیف ہیں جن میں اہم صدیق اکبر،عثمان ذوالنورین، غلامان اسلام، اسلام میں غلامی کی حقیقت ،مولانا عبیداللہ سندھی اوران کے ناقد، مسلمانوں کا عروج وزوال، وحی الٰہی، فہم قرآن، خطبات اقبال پر ایک نظراور نفثۃ المصدراور ہندوستان کی شرعی حیثیت وغیرہ ہیں۔

سعیداکبرآبادی کی نثر میں سادگی ،سلاست، شگفتگی ،توانائی ،علمیت اور استدلالیت دیکھنے کو ملتی ہے، جس موضوع کو جیسے اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں ،آپ نے متعدد موضوعات پر کتابیں ،مقالات اور مضامین لکھے ہر ایک میں جداگانہ کیفیت ہے ،قاری کو باندھنے پر عبور حاصل تھا کیسا ہی بورکن موضوع اور مضمون ہو بور نہیں ہونے

سعید اکبر آبادی کی نثر میں سادگی ,سلاست, شگفتگی ,توانائی ,علمیت اور استدلالیت دیکھنے کو ملتی ہے, جس موضوع کو جیسے اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں ,آپ نے متعدد موضوعات پر کتابیں ,مقالات اور مضامین لکھے ہر ایک میں جداگانہ کیفیت ہے ,قاری کو باندھنے پر عبور حاصل تھا کیسا ہی بورکن موضوع اور مضمون ہو بور نہیں ہونے دیتے, مولانا اپنے اسلوب پر شبلی اور داغ کا اثر بتاتے ہیں مگر ان کی نثر کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں متعدد صاحب اسلوب ادبا کے اسالیب کے اثرات ہیں,اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سعید اکبر آبادی کے یہاں شبلی کے علمی ,داغ کے عوامی اسلوب کے ساتھ ساتھ کثیر لسانی اسالیب کے بھی گہرے اثرات ہیں.

دیتے، مولانا اپنے اسلوب پر شبلی اور داغ کا اثر بتاتے ہیں مگر ان کی نثر کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں متعدد صاحب اسلوب ادبا کے اسالیب کے اثرات ہیں، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سعید اکبرآبادی کے یہاں شبلی کے علمی، داغ کے عوامی اسلوب کے ساتھ ساتھ کثیر لسانی اسالیب کے بھی گہرے اثرات ہیں۔

سعید اکبرآبادی ایک اچھے مکتوب نگار بھی تھے، خطوط میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو خطوط کو مکتوباتی ادب میں اعلیٰ مقام پر جلوہ افروز کرتی ہے، خطوط میں آپ کا لہجہ علمی اور سادہ ہے، بے ساختگی، بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں مختصر الفاظ میں بڑے سے بڑے موضوع کو آسانی سے سمیٹ لیتے ہیں، اگر آپ کے خطوط کو شمار کرنے کی کوشش کی جائے تو سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے مگر خطوط کی حفاظت کا سلسلہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے خطوط ضائع ہوگئے اس کے باوجود جو موجود ہیں ان سے ہی ان کی علمی وادبی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، زیادہ تر ان کی مراسلت جن مشاہیر اور اہل علم سے رہی ان میں سے چند نام یہ ہیں: عبدالماجد دریابادی، مناظر احسن گیلانی، ضیا احمد بدایونی، شورش کاشمیری، عتیق الرحمٰن عثمانی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، سید سلیمان ندوی، پروفیسر عبدالعلی، مولوی عبدالرحمٰن اور علی میاں ندوی وغیرہ۔

سعید اکبرآبادی اعلی درجہ کے مبصر بھی تھے، 1938 میں سید طفیل کی کتاب 'مسلمانوں کے روشن مستقبل' پر تبصرہ کرکے تبصرہ نگاری کا آغاز کیا، تقریباً 45 سال یہ سلسلہ جاری رہا، سعید احمد اکبرآبادی نے برہان میں مختلف موضوعات کی کتابوں پر بہت ہی عمدہ اور گراں قدر تبصرے لکھے اور جو محسوس کیا بلاجھجک تحریر کیا کسی کی کوئی رعایت کی اور نہ ہی مکمل مداحی کا معاملہ کیا، ان کے تبصرے کی تعداد سیکڑوں ہے، محمد تقی میر از جمیل جالبی والے تبصرہ میں میر کے متعدد اشعار کی نشاندہی کی ہے اور جالبی صاحب کو بہت سے مشورے دیے ہیں اس کے علاوہ، غالب مدح وقدح کی روشنی میں، لغات گجری، مکاتیب گیلانی، سیرت رسول کریم، بزم تیموریہ، دکھنی (قدیم اردو)، اور پولیٹکس اینڈ سوسائٹی وغیرہ کتابوں پر لکھے گئے تبصرے بہت ہی عمدہ ہیں جن کو شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

سعید احمد اکبرآبادی ایک اچھے سوانح نگار بھی تھے، سوانح نگاری میں ان کا انداز بالکل شبلی جیسا ہے، جس طرح شبلی نے الفاروق تحریر کیا اسی طرح سعید اکبرآبادی نے صدیق اکبر اور عثمان ذی النورین، اس کے علاوہ مشاہیر

سعید اکبرآبادی ایک ماہر اقبالیات بھی تھے ,آپ نے اقبالیات کے اس گوشے کو واضح کیا جس پر کسی بھی ادیب اور دانشور نے توجہ نہیں دی تھی وہ ہے اقبال کی مذہبی فکر, اس میں اسلامی فلسفہ کے حوالے سے بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے, اقبالیات پر چند مضامین کے علاوہ آپ کی بہت ہی عمدہ کتاب ہے 'خطبات اقبال پر ایک نظر' اس کتاب میں سعید اکبر آبادی نے اقبالیات کی اس جہت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ بہت ہی عمدہ محاکمہ بھی کیا ہے۔

علما و دانشوران کی وفات پر برہان میں بھی بہت سی سوانحی تحریریں لکھیں وہ بہت ہی عمدہ اور لاجواب ہیں۔

مولانا اکبرآبادی نے عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے جنوبی افریقہ، برطانیہ، مصر، سعودی عرب، ایران اور پاکستان وغیرہ درجنوں ممالک کے اسفار کیے، آپ کا مطالعہ وسیع وعریض اور مشاہدہ عمیق تھا، ایک جہاں دیدہ شخص اور دانشور تھے آپ نے اپنے علمی اسفار کی روداد کو قلم بند کرکے سفرنامہ کی شکل میں پیش کیا وہ کسی نایاب تحفہ سے کم نہیں، پہلا سفرنامہ حج بیت اللہ، دوسرا نینی تال کا سفر، تیسرا دیار غرب کے مشاہدات وتاثرات یہ امریکہ اور یورپ کا سفرنامہ ہے، چوتھا قاہرہ میں پہلی اسلامی کانفرنس، پانچواں بنگلور میں ایک اہم سیمینار، چھٹا ایران میں چندروز، ساتواں جاپان میں چندروز یہ تو چندا ہم سفرنامے ہیں اس کے علاوہ بھی پاکستان، کلکتہ، میسور اور دیگر مقامات کے متعدد سفرنامے ہیں، آپ کے اکثر اسفار علمی، ادبی اور مذہبی مذاکرات پر مبنی ہیں مگر تاریخی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی ہر اعتبار سے معلومات کا خزانہ ہیں، ان سفرناموں میں احساسات، نظریات اور تاثرات اس طرح شامل ہیں کہ اسے ان کی ذات کا بیانیہ کہا جاسکتا ہے، سفرنامہ میں زبان وبیان اور اسلوب بھی بہت عمدہ ہے، آپ کے بیشتر سفرنامے برہان میں شائع ہوئے ہیں۔

سب سے زیادہ جس چیز نے سعید اکبرآبادی کو شہرت دوام عطا کیا وہ ان کی اداریہ نگاری ہے وہ 1938 سے 1985 کے درمیان تقریباً 44 سال ماہنامہ 'برہان' کے مدیر رہے اس عرصے میں وقیع اداریے اور بیش قیمت شذرات ومضامین تحریر کیے، آپ کا اداریہ نظرات کے عنوان سے ہوتا تھا درمیان میں تین سال 1943 سے 1946 کے عرصے میں انقطاع بھی رہا مگر دوبارہ پھر اسی آب وتاب کے ساتھ اداریے تحریر کیے جیسے پہلے کرتے تھے، آپ نظرات کے عنوان سے اپنے اداریے میں مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرتے تھے، آپ کے اہم اداریوں میں ترقی پسند تحریک اور اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مسئلہ اردو زبان وغیرہ ہیں آپ کے اداریوں کی سب سے اہم خصوصیت بے باکی اور حق بیانی ہے، کسی بھی موضوع پر بہت ہی کھل کر اظہار کرتے ہیں۔

سعید اکبرآبادی ایک ماہر اقبالیات بھی تھے، آپ نے اقبالیات کے اس گوشے کو واضح کیا جس پر کسی بھی ادیب اور دانشور نے توجہ نہیں دی تھی وہ ہے اقبال کی مذہبی فکر، اس میں اسلامی فلسفہ کے حوالے سے بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے، اقبالیات پر چند مضامین کے علاوہ آپ کی بہت ہی عمدہ کتاب ہے 'خطبات اقبال پر ایک نظر' اس کتاب میں سعید اکبرآبادی نے اقبالیات کی اس جہت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ بہت ہی عمدہ محاکمہ بھی کیا ہے۔

قرآن فہمی پر بھی سعید اکبرآبادی نے خاص توجہ دی اور متعدد تحقیقی مقالات اور کتابیں تحریر کیں جن میں 'وحی الہٰی'، الصابئون، الامیون، وغیرہ بہت ہی اہم ہیں، قرآن فہمی کے حوالے سے آپ نے بہت سی ایسی باتیں بھی تحریر کی ہیں جو پہلے کسی نے نہیں لکھی۔

سعید اکبرآبادی ایک مایہ ناز فقیہ اور متبحر عالم دین بھی تھے، آپ کا فقہی توسع، بالغ نظری اور مذہبی امور میں اعتدال اور توازن بہت ہی اہم اور نمایاں پہلو ہے، آپ نے فیملی پلاننگ، طلاق، پردہ، انشورنس، بینکنگ نظام اور مشینی ذبیحہ وغیرہ حساس فقہی مسائل کو نہایت معتدل انداز سے حل کیا ہے۔ اس سے ان کی فقہی بصیرت اور درک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام سعید احمد اکبرآبادی دانشور عالم، روشن خیال مفکر، باکمال مصنف اور صاحب قلم تھے، آپ جہاں کامیاب مدرس رہے وہیں قلم وقرطاس سے بھی بیش بہا خدمات انجام دیں، اپنے انہیں خدمات کی وجہ سے علمی اور ادبی دنیا میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔

■

Abdul Bari
C-145/1 Ground Floor
Tayyab Lane,Shaheen Bagh,Jamia Nagar
Okhla New Delhi-110025
Mob.: 9871523432
EmaiL: abariqasmi13@gmail.com

حقانی القاسمی

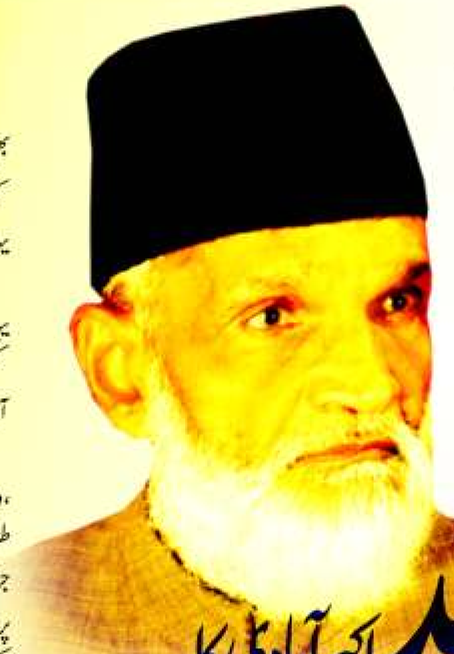

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا اسلوبِ نگارش

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (8 نومبر 1908 – 24 مئی 1985) کا نثری اسلوب علامہ شبلی نعمانی اور داغ دہلوی کے اسالیب کا مرکب یا امتزاج ہے، مولانا نے مشہور تصنیفی ادارہ ندوۃ المصنفین کے مقتدر ماہوار رسالہ 'برہان' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''میرا اسلوب بنیادی طور پر سب سے زیادہ منت کش احسان شبلی اور داغ کا ہے، جنھیں میں نے بڑی افراط سے پڑھا اور ذہنی سرور حاصل کیا ہے''۔

ان کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے، تو شبلی کے اسلوب میں جو وضاحت، سادگی، سلاست اور جمالیاتی طرز ہے اور داغ کی زبان میں جو سلاست، صفائی، رنگینی، شوخی، چلبلاہٹ، چٹخارہ اور پیچیدہ ترکیبوں سے گریز ہے، وہ خوش بیانی اور زبان کا جو حسن ہے، وہی عناصر کم وبیش مولانا اکبر آبادی کے ہاں ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ایک طرف جہاں شبلی کی علمی زبان سے اپنا رشتہ جوڑا ہے، وہیں داغ دہلوی کی شستہ وشائستہ عوامی زبان سے بھی ان کا تعلق ہے، ان دونوں کے اسلوبی خصائص کے ساتھ، تباین بھی ہے جو ہر ادیب کی زبان واسلوب کا لازمہ ہوتا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند کے اسلوب میں شبلی جیسے جمالیاتی نثر نگار اور داغ جیسے البیلے اور طرح دار شاعر کے اسلوبی خصائص کے کتنے عناصر ہیں، ان کا تجزیہ بہت دشوار ہے، یہاں ایک سوال بڑا اہم ہے کہ مولانا کے لسانی اسلوب کی تشکیل میں کون سے عوامل کارفرما رہے ہیں؟ ان کے عہد اور ماحول کا ان پر کتنا اثر پڑا ہے اور ثانوی زبانوں نے ان کے اسلوب کی تشکیل میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ جہاں تک ان کے عہد اور ماحول کا تعلق ہے تو مولانا سعید اکبر آبادی کے بقول'' ان کی تعمیر وتشکیل کے دو مراحل ہیں، ایک مرحلے میں ان کا مکمل ماحول شعری تھا اور دوسرے میں علمی اور دینی''۔ جہاں تک ان کے عہد کا تعلق ہے، تو جس زمانے میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی، وہ اردو نثر کا ارتقائی عہد تھا اور ان کا تعلق جس معاشرت سے تھا، وہاں اسلامی اور انگریزی دونوں طرح کی تعلیم رائج تھی۔ مولانا سعید اکبر آبادی نے بھی دینی اور عصری تعلیم سے کسب فیض کیا تھا۔ پہلے انھوں نے مدرسہ امدادیہ مراد آباد اور پھر دارالعلوم دیوبند میں علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جیسے مشاہیر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی، منشی، ادیب، فاضل کے امتحانات دیے۔ دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد انگریزی ادب میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھیں تعلیم اور تدریس کے دوران دونوں دھاراؤں سے جڑنے کے مواقع ملے۔ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں اردو وعربی کے پروفیسر رہے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ میک گل یونیورسٹی کناڈا میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ سنی دینیات کے صدر اور تھیالوجی فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔ اس طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا دینی عصری دونوں حلقوں سے گہرا رشتہ تھا اور اسی وجہ سے ان کے اندر نظریاتی کشادگی اور وسعت بھی تھی اور کئی زبانوں اور ادبیات کا گہرا مطالعہ بھی تھا۔ وہ کثیر اللسان (Polyglot) فرد تھے، اس لیے ان کے یہاں کثیر لسانی اسالیب کا اثر نظر آتا ہے۔

ان کی تحریروں میں علمائے مدارس دینیہ کی طرح یبوست اور خشکی نہیں، بلکہ شگفتگی اور برجستگی ہے، جمالیاتی کشش، صفائی، سادگی اور سلاست ہے، خطیبانہ رنگ و آہنگ بھی ہے، کہیں کہیں شان وشکوہ اور بلند آہنگی بھی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو اسلوب اختیار کیا، وہ علم و ادب کا حسین امتزاج تھا، ان کی زبان علما کی طرح ثقیل یا ادق نہیں تھی، انھوں نے اپنے اسلوب میں جزالت کو قائم رکھا اور شگفتگی کو بھی۔ اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر آل احمد سرور کی بھی رائے ہے کہ ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی گہرے علم کے ساتھ ایک شگفتہ اسلوب بھی رکھتے ہیں'' (پیش لفظ، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، مصنفہ سعید احمد اکبر آبادی، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر، 1983) ان کا ہر جملہ اپنی قوت کا احساس دلاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں دلنشیں پیرایہ ہے اور دل پذیر اظہار و بیان، قاری کو کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا، شبلی کی طرح سعید احمد اکبر آبادی کی نثر میں بھی وہی جمالیاتی زیر و بم اور کیف وکم ہے۔ ان کی نثر میں بھی وہی حرکت و حرارت اور جمالیاتی حس و لطافت ہے جو شبلی کا خاصہ ہے۔ ان کی زبان جامد اور منجمد نہیں اور نہ ہی خشک و بے جان ہے۔ ہر لفظ میں ایک قوت مضمر ہے، جس سے صرف لفظوں کو ہی زندگی نہیں ملتی؛ بلکہ خیال وفکر کو بھی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ مولانا کی تحریروں میں آگہی کی روشنی کے ساتھ اظہار کی توانائی اور تابندگی ہے۔ شبلی کی طرح ان کی ادبی تحریروں میں معروضیت اور قوتِ استدلال بھی ہے۔ حالی کے ایک شعر کے حوالے سے ان کی تفہیم ادب اور قوتِ تعبیر وتشریح کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''آج کل بعض ادبی رسائل وجرائد میں مولانا حالی کے ایک شعر سے متعلق بڑی دلچسپ بحث چل رہی ہے، شعر یہ ہے۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

گفتگو اس میں ہے کہ پہلے مصرع میں جو 'پیروی مغربی' ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟ ایک گروہ جس میں بعض یونیورسٹیوں کے مشہور اساتذۂ اردو اور بعض مشہور ادیب شامل ہیں۔ ان کو اس پر اصرار ہے کہ 'پیروی مغرب' سے مراد مغرب کی پیروی ہے اور اس طرح گویا مولانا حالی اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ اب مشرقی اور ایشیائی شاعری کے طرز کہن کو چھوڑ کر مغرب کے طرز شاعری کی

پیروی کرنی چاہیے لیکن دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ 'مغربی' فارسی کا ایک مشہور صوفی شاعر ہے جس کا تذکرہ مولانا جامی نے نفحات الانس میں اور محمد عوفی نے لباب الالباب میں کیا ہے۔ مولانا حالی کی مراد یہی شاعر ہے۔''

(نظرات: ماہنامہ 'برہان'، جولائی 1946)

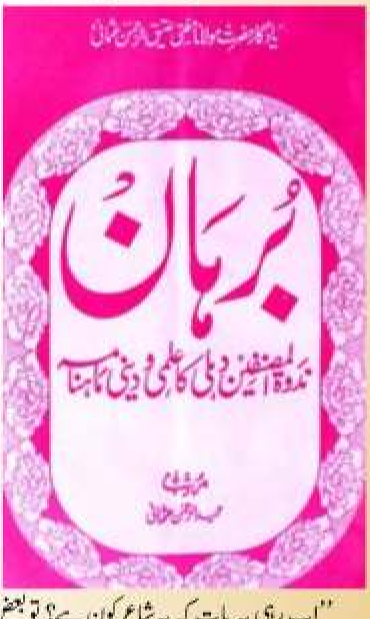

''اب رہی یہ بات کہ یہ شاعر کون ہے؟ تو بعض ارباب علم وادب کا خیال ہے کہ یہ شیخ محمد شیریں تبریزی ہے جو اپنا تخلص مغربی کرتا تھا۔ مولانا حالی کے اس سے تاثر کی وجہ یہ ہے کہ مغربی کا کلام زیادہ تر عارفانہ اور صوفیانہ ہوتا ہے اس بنا پر مولانا حالی کی مراد یہ ہے کہ اب عشق مجازی کے بکھیڑوں سے منہ موڑ کر معرفتِ حقیقی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں مغربی کا طرز اختیار کرنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال درست اور صحیح ہو لیکن مغربی کے لفظ کو سنتے ہی سب سے پہلے ہمارا جو انتقال ذہنی ہوا وہ ابنِ زیدون کی طرف ہوا۔ ابن زیدون عربی کا مشہور شاعر ہے۔ اندلس کا رہنے والا تھا اور اس کی شہرت زیادہ تر اندلس کے مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے ہی ہے۔ اندلس کو عام طور پر مغربی کہا ہی جاتا ہے۔ مولانا حالی ایسے فاضل سے یہ بعید ہے کہ انھوں نے ابن زیدون کا مرثیۂ اندلس نہ پڑھا ہو اور پڑھ کر اس سے غیر معمولی طور پر متاثر نہ ہوئے ہوں۔ اس بنا پر عجیب نہیں مولانا حالی کی مراد یہ ہو کہ اب مصحفی و میر کا زمانہ نہیں ہے جس میں گل وبلبل اور خد و کاکل کی حکایتیں ہوتی تھیں بلکہ قوم پر ایک عام ادبار طاری ہے اس لیے ابن زیدون کی طرح قوم کا مرثیہ پڑھنا اور اس کی حالتِ زبوں کا ماتم کرنا چاہیے۔'' (نظرات: ماہنامہ 'برہان'، جولائی 1946)

مولانا نے استدلال کے ساتھ لکھا ہے کہ پیروی مغربی کی ترکیب ترکیب اضافی ہے نہ کہ توصیفی۔ اگر اس سے مراد مغرب کی پیروی لی جائے تو اس صورت میں ترکیب توصیفی ہونی چاہیے۔ اور حالی کو یہ شعر اس طرح لکھنا چاہیے۔

آؤ نہ حالی اب کریں مغرب کی پیروی
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اور دوسری بات یہ کہ اگر 'مغربی' سے مراد طرز مغربی ہے تو مصحفی اور میر سے مراد طرزِ مشرقی لینا ہوگا جب کہ یہاں ایسا ہے نہیں۔ انھوں نے اپنے اس خیال کی توثیق و تصویب شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی اور پرنسپل مدرسہ عالیہ کے ذریعے بھی یوں کرائی ہے کہ ''ان کے نزدیک پیروی سے پیروے طرزِ مغرب مراد رکھنا یا مراد لینا محل ہے۔''

مولانا سعید اکبرآبادی عالم بھی تھے اور ادیب بھی، ان کا موضوع تاریخ ہو یا سوانح، علمیت کے ساتھ ادبیت کی آمیزش ضرور رہتی ہے۔ سوانح میں عموماً اطلاعی اسلوب یا بیانیہ انداز اختیار کیا جاتا ہے، مولانا نے بھی سوانحی تصانیف میں اسی طرز کو اختیار کیا ہے، ان کے یہاں زبان کے تخلیقی اور جمالیاتی استعمال کے ساتھ ساتھ اس کا علمی اور اطلاعاتی استعمال بھی ملتا ہے۔

مولانا کی جتنی تصانیف ہیں فہم قرآن (ندوۃ المصنفین، دہلی 1940)، وحی الٰہی (ندوۃ المصنفین، دہلی 1941)، عثمان ذوالنورین (ندوۃ المصنفین، دہلی 1983)، اسلام میں غلامی کی حقیقت (ندوۃ المصنفین، دہلی 1939)، مسلمانوں کا عروج وزوال یہ سب علمی مباحث و مسائل سے متعلق ہیں، اور اہم کتابیں ہیں جن پر ڈاکٹر عبدالوارث خان نے اپنی کتاب 'اسلامی علوم میں ندوۃ المصنفین کی خدمات' (اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی 1999) میں عمدہ تبصرہ اور تعارف کرایا ہے۔ اس طرح کی علمی تصنیفات میں زبان کے تخلیقی استعمال کے بجائے ترسیلی استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے مولانا نے ان میں تخلیقیت کے بجائے ترسیلیت پر زیادہ زور دیا ہے اور ان کے یہاں لسانی مہارت کے ساتھ ساتھ ترسیلی مہارت بھی نظر آتی ہے، انھوں نے مروجہ لسانی شکلوں سے انحراف نہیں کیا ہے، ان کے جملوں کی نحوی ترکیب بالکل وہی ہے، جو اردو نثر کا بنیادی اسلوب ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا طرز نگارش بہت خوب ہے۔ ان کی تحریروں میں کئی اہم نثر نگاروں کے اثرات اور عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کا طرز تحریر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملتا جلتا نظر آتا ہے، تو کہیں علامہ نیاز فتح پوری کے اسلوب سے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بچوں سے اتنی طویل مدت کے لیے جدا ہونے کا پہلا اتفاق تھا، اس لیے طبیعت متاثر تھی، مگر 47 عیسوی میں آزادی کے صدقے میں میرے سر پر جو قیامت گذری ہے، اس نے ڈھیٹ بنادیا ہے اور اب زندگی کا کوئی حادثہ حادثہ نہیں معلوم ہوتا، پھر مولانا حالی کا یہ شعر بھی یاد تھا کہ:

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
بہلتے بہلتے بہل جائے گی

اس کے علاوہ عربی کے یہ شعر اکثر پڑھتا تھا:

لایمنعك خفض العیش في دعة
نزوع نفس إلى أهل وأوطان
قلقي بکل بلاد إن حللت بها
أهلا بأهل وجیرانا بجیران

اس عبارت پر ابوالکلام آزاد کے 'غبارِ خاطر' کا گمان ہوتا ہے، وہی اندازِ بیاں، اردو اور عربی اشعار کا ویسا ہی استعمال۔

مولوی ابوالمکارم، محمد عبدالبصیر صاحب عتیقی آزاد سیوہاروی کی وفات حسرت آیات پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کتنی عمدگی سے عربی کا یہ شعر لکھا ہے:

''موت سب کو آنی ہے، کسی کو اس سے مفر نہیں، آج وہ کل ہماری باری ہے، یہاں کا شب و روز کا مشاہدہ ہے۔

من لم یمت عبطة یمت هرما
للموت کاس والمرء ذائقها

(برہان، مئی 1941)

عربی کی طرح فارسی اشعار کا بھی نہایت برمحل اور موزوں استعمال کرکے جملوں میں کتنی خوبصورتی اور قوت پیدا کردی ہے:

''آہ، اے خدا آج آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں، اور قلب کیا محسوس کررہا ہے کہ صفاتِ کمال عزم ہمت، جوشِ عمل، خوداعتمادی، عقل وفہم اور عزت نفس غیروں میں موجود ہے اور خود تیرے نام لیواؤں کا دامن ان سے تہی ہے۔ ہمارا جو قدم اٹھتا ہے غلط ہوتا ہے، جو بات ہماری زبان سے نکلتی ہے وہ محض جذبات انگیز ہوتی ہے۔ عمل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ قومیں بن رہی ہیں اور ہم بگڑ رہے ہیں، اغیار پار ہے ہیں اور ہم کھو رہے ہیں۔

اے بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل
نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را

(نظرات، برہان، جنوری 1947)

گاندھی جی کی وفات پر لکھتے ہوئے علامہ نیاز فتح پوری کے اسلوب میں بہتے نظر آتے ہیں۔ وہی ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) جو نیاز فتح پوری کا اسلوبی امتیاز ہے۔ نیاز فتح پوری کے اسلوب کے

حوالے سے مرزا خلیل احمد بیگ نے نظریاتی تنقید میں بہت عمدہ بحث کی ہے اور مولانا سعید اکبرآبادی کی تحریروں میں متوازی ساختیے کی تلاش میں میں نے اسی کتاب سے رہنمائی حاصل کی ہے۔

مولانا سعید اکبرآبادی نے بھی اسی طرح متوازی ساختیے ترتیب دیے ہیں، جس سے بیان میں زور پیدا ہوگیا ہے۔ اس نثر میں آہنگ بھی ہے اور موسیقیت بھی:

''وادریغا کہ وہ عدم تشدد کا دیوتا جس نے سخت سے سخت اشتعال کی حالت میں بھی کبھی اپنے دشمن پر انگلی نہیں اٹھائی، امن و عافیت کا وہ منادو داعی، جس نے شدید غیظ و غضب کے موقع پر بھی اپنے مخالف کے لیے کوئی دل آزار گلہ زبان سے نہیں نکالا، وہ انسانیت کا علمبردار حقیقی، جو تعصب و تنگ نظری کے جذبات کی فراوانی کے عالم میں بھی ایک کوہ استقامت اور صبر و تحمل کی چٹان بنا اپنے مقام پر کھڑا رہا، مذہب و اخلاق کا وہ پیکرِ زریں، جس نے حیوانیت و درندگی کے بحران عظیم میں اپنے قدم کو ایک لمحے کے لیے جادۂ مستقیم سے متزلزل نہیں ہونے دیا اور حق و صداقت کا وہ پجاری، جو کذب و افترا اور دروغ و باطل کی بلاانگیز موجوں میں بھی صحتِ فکر و عمل اور راست کرداری و راست گفتاری کی کشتی کو طوفان زدگی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا، آہ بصد آہ! کہ 30 رجنوری 1948 کی شام کو خود اس کے ایک ہم وطن و ہم ملک نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور اس کے نحیف و نزار جسم کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر ہندوستان کی پیشانی پر ایسا بدنما داغ لگا دیا، جو کبھی مٹائے نہ مٹے گا''۔ (آہ لعل شب چراغ ہند، ماہنامہ برہان دہلی، مارچ 1948) یہاں عدم تشدد کا دیوتا امن و عافیت کا وہ منادو داعی، مذہب و اخلاق کا وہ پیکر زریں، حق و صداقت کا وہ پجاری ساختی متوازیت کے عمدہ نمونے ہیں)

مولانا نے اپنی تحریروں میں عطفی مرکبات و ترادفات کا بھی بہت ہی خوب صورت استعمال کیا ہے، جس سے ان کے بیان میں حسن پیدا ہوگیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں: ''کفر و شرک کے مضبوط قلعے، مفتوح و سرنگوں ہوکر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے''۔ یہاں کفر و شرک، مفتوح و سرنگوں اور حق و صداقت مرکبات عطفی (Conjuctive Compound) ہیں۔ اسی سیاق و سباق میں یہ جملے بھی ملاحظہ فرمائیں:

''آہ وہ ہندوستانِ جنت نشان، جو کل تک اتفاق و رواداری کا سرسبز و شاداب چمن تھا، آج سرتا سر خارستانِ عداوت و منافرت بنا ہوا ہے۔'' (نظرات، برہان، جون 1948)

یہاں اتفاق و رواداری، عداوت و منافقت، عطفی مرکبات ہیں۔

اسی طرح انھوں نے اپنی تحریروں میں تجنیسِ صوتی کا بھی خوب صورت استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں''۔ اس جملے میں ترغیب و ترہیب کا استعمال کیا گیا ہے، اس میں صوتی حسن اور موسیقیت ہے کہ ایک ہی آواز سے دونوں مرکب اجزا کا آغاز و اختتام ہوا ہے۔ اسی طرح ان کی بیشتر تحریروں میں عطفی مرکبات اور کبھی کبھی مختلف المعانی متضاد مرکبات کا بھی استعمال ملتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے پاس الفاظ کا بیش بہا ذخیرہ تھا اور ان لفظوں کے موزوں استعمال کا ہنر بھی۔

مولانا اکبرآبادی نے اپنے لہجے کو پرزور بنانے کے لیے بھی مترادفات کا استعمال کیا ہے۔ زبان کے ساتھ ان کا تفاعل بہت مربوط اور مضبوط ہے، اس طرح دیکھا جائے، تو مولانا نے مختلف اسالیب کا استعمال کیا ہے۔ ان کی نثر تعبیری اظہار کی ایک خوب صورت شکل ہے۔ ان کے بعض تحقیقی و علمی موضوعات میں بھی چاشنی اور دل نشینی ہے، اظہار کا حسن اور بیان کی لطافت ہے۔

ان کا ہر جملہ نپا تلا ہے، کہیں بھی اکھڑا ہوا یا ناہموار لفظ نہیں ملتا، مولانا شبلی نعمانی کی طرح انتخاب الفاظ اور جملوں کی ساخت میں حسن تناسب کا خیال رکھا ہے۔ شگفتگی بیان کے ساتھ مولانا نے ادائے مطلب پر خاص طور پر توجہ مرکوز کی ہے، مگر کہیں کہیں ان کی نثر اَغلق نہ سہی، عسیر الفہم ضرور ہوگئی ہے۔ یہاں ان پر عربی و فارسی پس منظر کا زیادہ اثر نظر آتا ہے اور اس طرح کی تحریروں میں وہ علما کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کی نثر اتنی سادہ نہیں رہ جاتی کہ ہر کسی کی سمجھ میں آسکے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''ان کی تمام اخلاقی و روحانی برتریوں اور بزرگیوں کا دارومدار صرف ایک کتاب مبین کے تعامل پر ہے''۔ اور دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے؟''۔ یہاں تعامل، مدلول مطابقی اور التزامی ایسے الفاظ ہیں، جو ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔

مولانا کی تحریر میں کہیں کہیں ادبیت سے زیادہ علمیت حاوی ہوگئی ہے۔ شاید موقع و محل کی مناسبت سے ان کا طرزِ تحریر بالکل بدل جاتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ مخاطب کے اعتبار سے بھی ان کا طرزِ تخاطب تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ قاری محمد طیب پر لکھتے ہوئے یوں گوہر فشانی کرتے ہیں:

''وادریغا! دودمانِ قاسمی کا لعلِ شب چراغ گل ہوگیا، چمن زار دارالعلوم دیوبند کا گلِ سرسبد مرگ کی بادِ صرصر سے نذرِ خزاں ہوگیا، بزمِ علم و وقار کی شمع فروزاں بجھ گئی، حسنِ بیان و خطابت کے ایوان میں زلزلہ آگیا، مسندِ وعظ و مصطبہ ارشاد و ہدایت بے رونق ہوگئے''۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا ایک طرزِ تحریر تو یہ ہے، دوسری طرف جب سفرنامہ لکھتے ہیں، تو ان کی تحریر میں حد درجہ شگفتگی اور روانی نظر آتی ہے۔ دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات کے عنوان سے جو انھوں نے سفرنامہ لکھا ہے، اس کی زبان بالکل الگ ہے، اس میں انھوں نے صنفی لوازمہ کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور اپنے مخاطب کا بھی کہ وہ سفرنامہ صرف خواص کے لیے نہیں؛ بلکہ عوام کے لیے بھی ہے۔ اس باب میں ان کا رویہ میر تقی میر سے مختلف تھا، جنھوں نے کہا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

مولانا نے اپنی تحریر میں عوام و خواص دونوں کا خیال رکھا ہے۔ ذرا سفرنامہ کا یہ اقتباس دیکھیے، یہ محسوس ہی نہیں ہوگا کہ کسی عظیم مفکر اور دانشور عالمِ دین نے لکھا ہوگا، اس میں ان کے ذہن اور زبان دونوں کی شگفتگی نظر آئے گی:

''جہاز میں دل جوئی اور تسکینِ خاطر کے بظاہر تمام اسباب موجود ہوتے ہیں، عمدہ فضا اور صاف ستھرا ماحول، لطیف کھانے، مفرح اور مسکن مشروبات، خاطر تواضع اور خدمت کے لیے نک سک سے درست ایئر ہوسٹس کہ اگر آپ کے چہرے پر ذرا بھی تغص اور اضمحلال و علالت کے آثار ملیں، تو ہمہ تن التفات ہوکر آپ سے پوچھے گی: آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟''۔

مولانا اکبرآبادی کا اسلوب کہیں سلیس سادہ، کہیں سلیس رنگین، کہیں شگفتگی، تو کہیں کہیں ذرا سی ثقالت بھی لیے ہوئے ہے، شوکتِ الفاظ بھی ہے اور توازن بھی اور بے ساختگی و سادگی بھی، مگر ان کی شخصیت کی طرح ان کی تحریر میں نہ الجھاؤ ہے، نہ ژولیدگی، نہ ہی پیچیدگی۔ ان کی ذہنی ساخت سے ان کی لسانی ساخت کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ جس طرح ان کے خیال میں تابندگی ہے، اسی طرح اظہار میں بھی توانائی ہے۔ مولانا کی تحریر میں تاثیر و قوت بھی ہے اور یہ قوت بغیر ریاضت کے نصیب نہیں ہوتی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ریاضت کی بہت سی منزلوں سے گزرے، تب انھیں شبلی کا ساز ورِ بیان میسر ہوا اور داغ کا سا وہ طرزِ گفتار و حسنِ بیان، جس کے بارے میں خود داغ معجز بیاں کا کہنا تھا۔

داغ کے ہی دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

■

Haqqani Al-Qasmi
Mob.:9891726444
Email: haqqanialqasmi@gmail.com

اردو فکشن میں راوی اور بیانیہ کی نوعیتیں

انجم پروین

فکشن کی اساس کسی نہ کسی واقعے پر ہوتی ہے۔ واقعے کے وجود کے بغیر فکشن کی تعمیر ناممکنات میں سے ہے۔ فکشن میں بیان ہونے والا واقعہ ازخود معرض وجود میں نہیں آتا، بلکہ اس کی ترسیل کے لیے کسی ذریعہ یا آلۂ کار کی ضرورت درکار ہوتی ہے جو تکلمی یا تحریری زبان میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر کوئی بھی متن زبان اور بیان کے بغیر تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ایک لاحقہ ہے گوئی (تکلمی) اور دوسرا لاحقہ ہے نگاری (تحریری)۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جن اصناف کا تعلق بنیادی طور پر کہنے اور سننے سنانے سے ہے، ان میں گوئی کا لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً داستان گوئی، مرثیہ گوئی، غزل گوئی وغیرہ۔ گرچہ ان کا بنیادی تعلق گویائی سے ہے لیکن ان کی پیش کش اور تحفیظ (Presentation & (Documentation کے لیے تحریر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو اصناف نگارش کے ضمن میں آتی ہیں وہ لکھنے والی ہوتی ہیں اور لکھنے کے بعد انھیں پڑھا جاتا ہے۔ یہیں سے بیانیہ (Narration) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ بیانیہ دونوں طرح کی اصناف کا بنیادی عنصر ہے۔ فکشن کی اصطلاح میں قصہ بیان کرنے والے کو 'راوی' کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

''افسانہ چاہے واقعے کا اظہار کرے یا کردار کا، یا دونوں چیزوں کا، یا چاہے وہ کسی سماجی حقیقت کو بیان کرے یا نفسیاتی نکات کی گہرائیاں کریدے، وہ بیان یعنی Narration کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ بیانیہ اس کے لیے ہاتھ پاؤں کا کام کرتا ہے۔ اگر افسانے میں سراسر مکالمہ ہے یا صرف خود کلامی ہے تو بھی افسانہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں کسی واقعے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ ہم واقعات کی ترتیب کو الٹ پلٹ دیں، یا واقعے کی طرف اشارہ کریں، اسے بیان نہ کریں، یا صرف فرض کر لیں کہ کوئی واقعہ یا واقعات رونما ہو چکے ہیں اور ہمارے افسانے میں اب جو کچھ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے، وہ ان واقعات ماضیہ کی وجہ سے ہے، لیکن بیانیہ کسی نہ کسی شکل میں ہمارے ساتھ رہتا ہے، اور جب بیانیہ کا وجود افسانے کی شرط ٹھہرا تو بیان کنندہ یعنی راوی کا وجود بھی افسانے کی شرط ٹھہرتا ہے۔'' (افسانے کی حمایت میں، ص 54)

معلوم یہ ہوا کہ فکشن کسی بھی قسم کا ہو اور کسی بھی فارم میں ہو اس کے بیان کے لیے فکشن نگار ایک راوی (جو فنکار کا قائم مقام ہوتا ہے) خلق کرتا ہے۔ جو اپنی زبان میں واقعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال قائم ہو سکتا ہے کہ آخر مصنف/ فکشن نگار کو راوی کی ضرورت کیوں کر پیش آتی ہے؟ چونکہ انسانی زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے اور عام انسانی رویوں میں تضاد پایا جاتا ہے، بلکہ انسان کے ظاہر و باطن میں بھی اختلاف رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اب جب کہ افسانے میں بلکہ ناول میں ایک سے زائد کردار ہوتے ہیں اور سب کے مزاج، رویے اور عادات و اطوار ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں یا پھر کوئی ایک شخص بھی مختلف حالات و واقعات میں کئی صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ کسی صدمے یا واقعے کے زیر اثر یا پھر کسی سے محبت، نفرت، رقابت اور عداوت کی بنا پر اس کی شخصیت تغیر پذیر ہو سکتی ہے۔

ایک صورت حال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی کردار عادات و اطوار کے لحاظ سے بد ہو، یا عمر دراز ہو اور اس کا فعل اس کی عمر اور مرتبے کے برعکس ہو۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کردار کا ظاہر اس کے باطن کے برعکس ہو۔ مذکورہ تمام صورتوں میں یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ متضاد افعال و اعمال، اخلاقی غیر اخلاقی امور کو کیسے ایک مصنف کی ذات سے منسوب کیا جا سکتا ہے، جبکہ اس کی حیثیت ایک خلاق، ذہین اور باشعور فرد کے طور پر متصور کی جاتی ہے۔ لہٰذا مصنف کو راوی سے علیحدہ کرنے کے لیے اس امر پر زور دیا گیا کہ فکشن میں مصنف جو کچھ تحریر کرے اس کے بیان کے لیے ایک راوی خلق کرے گا جو مصنف سے منفرد شخصیت کا حامل ہوگا۔ فکشن کی اصطلاح میں وہ تصنیفی راوی (Authorial/Implied Narrator) کہا جاتا ہے۔ راوی کی تھیوری اور اس کی اقسام پر، وین سی بوتھ (Wayne C. Booth) کی مشہور کتاب فکشن کی شعریات (The Rhetoric of Fiction) ہے اس میں بوتھ نے Implied Narrator (تصنیفی راوی) لفظ کا استعمال کیا ہے۔ جسے وہ مصنف کا وجودِ ثانی (Second Self) کہتا ہے۔ فکشن میں راوی کی تخلیق دراصل کہانی بیان کرنے کا ایک ایسا حربہ (Tool) ہے جسے فکشن نگار اپنی ذات سے علیحدہ کر کے استعمال کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ راوی کس نوعیت کا ہوگا؟ مصنف اس کا انتخاب کہانی یا واقعہ کی قسم یا نوعیت کے اعتبار سے کرتا ہے یا نہیں؟ قاضی افضال حسین راوی کی نوعیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''ہر نوع کے بیانیہ میں ایک بیان کرنے والا لازماً ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح واقعے کی نوعیت رقسم کے اعتبار سے بیانیہ کی لسانی صفات بدل جاتی ہیں اسی طرح واقعہ کے بیان کی نوعیت بدل جانے سے راوی کی صفات و کردار بدل جاتا ہے.......... اور بیانیہ کے اوصاف و امتیازات اسی 'راوی' کے نقطۂ نظر اور اس کی ترجیحات سے براہ راست مربوط ہوتے ہیں۔''

(واقعہ، راوی اور بیانیہ، مشمولہ رسالہ تنقید، ص 198,199)

لہٰذا ہر واقعہ اور اس کے تناظر کا بیان کنندہ راوی ہوتا ہے۔ بیانیہ کا نقطۂ نظر راوی سے منسلک ہوتا ہے۔ کسی متن کی تفہیم کے دوران اس بات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے

کہ واقعہ کس کی زبان سے بیان کیا جارہا ہے۔ اگر واقعہ 'میں' کے ذریعے واحد متکلم کے صیغے یا 'ہم' کے ذریعے جمع متکلم کے صیغے میں بیان ہورہا ہے تو وہ متکلم یا حاضر راوی (First Person Narrator) کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عصمت چغتائی کا افسانہ 'لحاف' ضمیر صیغۂ واحد متکلم 'میں' کے ذریعے بیان ہوا ہے۔ اس کے برعکس جب کہانی 'وہ' کے ذریعے واحد غائب کے صیغے میں بیان کی جائے یعنی بیان کنندہ قاری کے سامنے ظاہر نہ ہو، اس کی ذات کو متصور کرلیا جائے کہ کوئی ایسا شخص واقعات بیان کر رہا ہے جسے بذات خود تمام واقعات کا علم ہے، تو اسے غائب راوی یا ہمہ بیں راوی (Omniscient / Omnipresent Narrator) کہا جاتا ہے۔ جیسے منٹو کا افسانہ 'دھواں' ضمیر 'وہ' کے ذریعے واحد غائب کے صیغے میں لکھا گیا ہے۔ کبھی کبھی کہانی یا واقعہ بیک وقت 'میں' اور 'وہ' کے صیغے میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ عموماً فکشن میں کہانی یا واقعہ کی ترسیل کے لیے دو اقسام کے راوی تخلیق کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

''یہ دونوں (میں، وہ) صیغے اپنی اصل میں لسانی ہیں، یعنی کسی کہانی کو بیان کرنے کے وہ پیرائے ہیں جو زبان میں موجود ہیں۔ ان پر کسی ایک شخص کا اجارہ نہیں ہو سکتا، یہ بلاتفریق مذہب وملت، صنف ونسل، ہر ایک کو اپنی یا دوسروں کی بات سچی یا جھوٹی، افسانوی یا حقیقی ہر طرح کی بات کہنے کا یکساں موقع دیتے ہیں۔ مصنف انھیں اختیار کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان پر مصنف کا گمان نہیں کیا جانا چاہیے۔''

(بیانیات کی اصطلاحات: وضاحتی فرہنگ، مشمولہ بیانیات مرتبہ قاضی افضال حسین، ص 268)

ان دونوں کے علاوہ راوی کی ایک اور قسم سامنے آتی ہے۔ جب ناول یا افسانے کا کوئی کردار واقعہ بیان کرے تو وہ بھی اس کا راوی کہا جائے گا۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ مصنف اپنے اصل نام کے ساتھ خود ناول یا افسانے میں کردار کی حیثیت سے داخل ہو جائے اور بطور راوی کہانی بیان کرے۔ وہاں بھی وہ مصنف نہیں بلکہ راوی یا ایک کردار سمجھا جائے گا۔ ان دونوں صورتوں میں راوی کے وہی اوصاف و امتیازات ہوں گے جو واحد غائب اور متکلم کے لیے لازمی قرار دیے گئے ہیں۔ اس نوع کی کئی مثالیں اردو فکشن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً: ناول امراؤ جان ادا میں رسوا بحیثیت کردار اس میں شامل ہے، وہ صرف مرزا محمد ہادی رسوا ہیں امراؤ جان ادا کا مصنف نہیں ہے۔ اسی طرح منٹو کا افسانہ 'بابو گوپی ناتھ' میں منٹو نے اپنے اصل نام کے ساتھ ایک کردار ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسد محمد خاں کے افسانوں میں بھی اسی نوع کے کردار دیکھے جا سکتے ہیں۔ جب اس طرح کی تحریروں کا محاکمہ کیا جاتا ہے تو فکشن کی رسمیات اور تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ فکشن کے اصول وضوابط اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ انھیں کسی حقیقی کردار یا حقیقی واقعہ پر مبنی بیانیہ کے بجائے فکشن کے متن کو ذہن میں رکھ کر پڑھنے اور اس کی تعبیر و تفہیم کرنے کی کوشش کی۔ اس قسم کے راوی کے حوالے سے قاضی افضال حسین اپنے مضمون 'واقعہ، راوی اور بیانیہ' میں لکھتے ہیں:

''ماہرین بیانیات اس بات پر متفق ہیں کہ 'متن کا مصنف/ مرتب اور اس کا 'راوی' خواہ وہ مصنف خود ہی کیوں نہ ہو، ایک ہی شخص نہیں ہوتے، بلکہ متن میں واقعہ تعمیر کرتے ہوئے مصنف 'راوی' میں منقلب ہو جاتا ہے اور اس پر بھی محاکمے (Evaluation) کے وہی اصول جاری ہو جاتے ہیں جو کسی دوسری نوع کے راوی کے لیے معیار تصور کیے جاتے ہیں۔''

(رسالہ تنقید، ششماہی، علی گڑھ، ص 200)

متکلم راوی 'میں' کے صیغے میں کہانی بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس کی کچھ حدود متعین ہیں۔ افسانے میں وہ بطور مرکزی کردار موجود ہوسکتا ہے۔ یعنی وہ کردار بھی ہے اور راوی بھی کیوں کہ تمام روئداد وہ خود بیان کر رہا ہوتا ہے۔ منٹو کا افسانہ 'سڑک کے کنارے' اس کی بہترین مثال ہے۔ دوسری صورت میں وہ راوی کہانی کا مرکزی کردار نہ ہو کر ضمنی کردار کی حیثیت سے مرکزی کردار کے واقعات بیان کرتا ہے۔ یعنی کہانی کے واقعاتی تسلسل میں اس کا کوئی رول نہیں ہوتا۔ یہاں ان ناقدوں کے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں، کہ اگر کہانی راوی متکلم کے ذریعے بیان ہوگی تو اس میں 'میں' ایک کردار کے طور پر لازماً شامل ہوگا اور وہ خود اپنی کہانی بیان کر رہا ہوگا۔ یہ نظریہ اس لیے درست نہیں ہے کہ ہر چند کہ متکلم راوی کے وسیلے سے بیان کردہ کہانی پر اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ لامحالہ متکلم کی کہانی ہی ہوگی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کئی کہانیوں میں متکلم محض راوی ہوتا ہے جو کہانی کے بیانیاتی سلسلے کو تو مہمیز کرتا ہے لیکن واقعاتی تفاعل میں اس کا رول نہیں ہوتا۔ غلام عباس کا 'سرخ جلوس' سے معنون افسانہ مکمل طور پر متکلم راوی بیان کرتا ہے۔ وہ کہانی میں موجود بھی ہوتا ہے البتہ کہانی کے تحرک میں اس کا کردار غیر اہم سا ہے۔ اس میں راوی صرف انھی واقعات کی تفصیل بیان کرتا ہے جن کا اس نے خود معائنہ ومشاہدہ کیا ہے۔ گویا مذکورہ دونوں صورتوں میں یہ راوی صرف انھی وقوعوں کو بیان کرنے کا اہل ہوگا جن میں وہ خود شامل رہا ہے یا پھر ان واقعات کا وہ عینی شاہد ہے۔ جس کی بہترین مثال کرشن چندر کا افسانہ 'کالو بھنگی' ہے جو اسی نوعیت کے راوی پر مشتمل ہے۔ متکلم راوی اپنی جانب سے کوئی بات یا رائے دیتا ہو یا ایسے واقعہ کی ترجمانی کرتا ہو جس کا اسے مطلق علم نہیں یا کسی واقعے کے متعلق اپنا قیاس یا قیافہ استعمال کرے تو ایسے حالات میں اس کی حیثیت مشتبہ ہو جائے گی۔ اس کے تدارک کے لیے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''اگر حاضر راوی کسی ایسی بات کو بیان کرنا چاہے جو اس کے براہ راست علم میں نہیں ہے تو وہ کسی کردار کو اس واقعے کا عینی شاہد بنا کر پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کردار سے اپنی ملاقات کس طرح کرائے اور پھر اس سے اپنی گفتگو کا رخ اس طرف موڑے کہ وہ بات معرض بیان میں آجائے۔''

(افسانے کی حمایت میں، ص 55)

ہر چند کہ غائب کے صیغے میں راوی کرداروں کے حالات، عادات، مزاج اور دیگر اشیا کو غیر جانبداری سے کہانی میں بیان کرتا ہے۔ لیکن بسا اوقات غائب راوی بھی کہانی میں تبصرے، اصلاحیں، نصیحتیں اور آرا پیش کر کے مداخلت کر بیٹھتا ہے۔ ابتدائی دور کے ناولوں بالخصوص نذیر احمد، سرشار اور ابتدائی خواتین ناول نگاروں کے یہاں راوی نیز مصنف کی بھی مداخلت دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی دوسری مثال میں پریم چند کے معروف افسانے 'کفن' کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ افسانہ غائب راوی

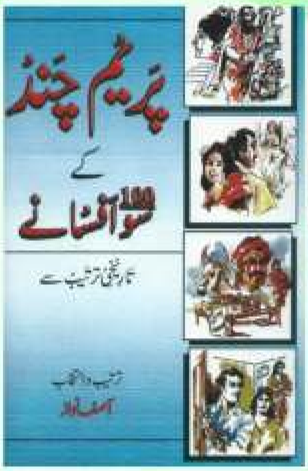

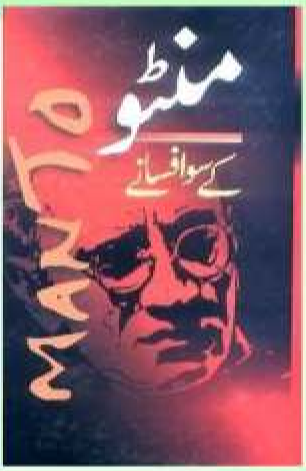

کے صیغے میں بیان ہوا ہے لیکن کئی جگہوں پر راوی کی مداخلت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

تاہم کچھ معاملات میں غائب راوی متکلم راوی پر فوقیت رکھتا ہے۔ واحد غائب راوی کچھ اس انداز سے کہانی بیان کرتا ہے کہ کہانی تو بتدریج آگے بڑھتی رہتی ہے تاہم وہ ایک ہی مقام پہ کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک خاموش تماشائی کے مانند ساحل پر کھڑا ہوتا ہے اور وہیں سے سمندر میں اٹھنے والی لہروں کی تڑپ اور تموج کی کیفیات کو بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے اور بیان کرتا ہے، لیکن خود سمندر میں نہیں اترتا، یعنی وہ اپنے آپ کو کہانی اور واقعات سے علیحدہ رکھتا ہے۔ غائب راوی والے متن میں تمام کردار، ان کے احوال، کوائف یہاں تک کہ باطنی کیفیات، احساسات ان کی سوچ تک سب ہمہ داں راوی کے وسیلے سے دریافت کیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ متنوع صفات کا حامل راوی سمجھا جاتا ہے اور اس کی پیش کردہ معلومات کو من و عن قبول کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بیان کردہ واقعات محتاج شہادت تصدیق نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں اس کے لیے متکلم راوی کی طرح زمان و مکان کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ واقعات خواہ کسی بھی زمان و مکان پر رونما ہوئے ہوں وہ ان سب پر یکساں گرفت رکھتا ہے۔ اس کے بیان کردہ واقعات کو چیلینج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اس کا نام ہمہ بیں / ہمہ داں راوی ہے۔ اسے فکشن میں دیگر راویوں میں سب سے زیادہ قابل یقین راوی (Reliable Narrator) کہا جاتا ہے۔ غائب اور متکلم دونوں راویوں کے دائرۂ کار کے ضمن میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''غائب راوی والا افسانہ بہ یک وقت لیکن مختلف جگہوں میں ہونے والے، یا ایک جگہ پر لیکن مختلف اوقات میں ہونے والے واقعات کے بیان پر قادر ہوتا ہے...... حاضر راوی والے افسانے میں وقت کا تعین ذرا سختی سے کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ قرین قیاس نہیں کہ وہ شخص جو خود واقعات کو بیان کر رہا ہے، اس بات کو بھول جائے کہ پچھلے واقعے یا حادثے کو کتنا عرصہ ہوا ہے، غائب راوی کو وقت کے تعین میں آزادی یا نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے مثلاً وہ یہ کہہ کر کام چلا لیتا ہے: گزشتہ واقعے کو کچھ عرصے یا چند ہفتے یا کئی سال گزر گئے وغیرہ۔ حاضر راوی اس طرح کی گول مول بات نہیں کہہ سکتا۔ (ایضاً، ص 57)

اردو فکشن میں بیشتر فن پارے غائب راوی کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہمہ داں راوی کے تعلق سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں مصنف اسے اتنی آزادی سے استعمال کرتا ہے وہیں اس کی بے جا آزادی پر قدغن بھی لگاتا رہتا ہے تاکہ وہ اس قدر آزاد نہ ہو جائے کہ فن پارہ کی واقعیت اور تاثر کو مجروح کر بیٹھے۔

راوی اور بیانیہ کے ذیل میں نقطۂ نظر (Point of View) کی اصطلاح وضع کی گئی۔ یعنی بیانیہ میں کوئی متن، راوی کے نقطۂ نظر سے مرتب ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پرسی لبوک (Percy Lubbock) نے اپنی کتاب The Craft of Fiction میں نقطۂ نظر کا تصور پیش کیا ہے۔ اس سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ راوی کہانی یا واقعات کے بیان میں کیا موقف / طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ کہانی میں خود شامل ہے یا کہانی سے خود کو باہر رکھتا ہے۔ آیا وہ صرف اپنی سوچ یا تجربہ بیان کر رہا ہے یا کرداروں کی سوچ اور ان کے خیال کی ترجمانی کر رہا ہے۔ یا مصنف کا نقطۂ نظر حاوی ہے۔ یہاں مصنف کی تخلیقی ذہانت قابل دید ہوتی ہے کہ وہ کس کے نقطۂ نظر سے متن کی تعمیر کرتا ہے۔ اس معاملہ میں قاری کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے، اسے دوران قرأت فن پارہ میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ راوی جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ کس کے نقطۂ نظر سے بیان کیا جا رہا ہے۔ جدید فکشن میں خواہ راوی (متکلم، غائب، کردار راوی) کوئی بھی ہو وہ جو کہانی بیان کرتا ہے اسے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے منتخب کردہ لفظیات میں بیان کرتا ہے۔ راوی کے مشاہدے اور بیان کے لیے اب Point of view کی جگہ ارتکاز نظر (Foca lization) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ، منظر یا روداد کے حوالے سے متعدد اور متنوع تناظر سامنے آ سکتے ہیں، جو متن کے تعین قدر کو زیادہ بامعنی بنا سکتے ہیں۔ اب تجزیہ نگار اس بات پر زیادہ توجہ صرف کر رہے ہیں کہ کس نے دیکھا اور کس انداز، زاویے سے دیکھا۔ اس طرح شاہد و مشہود کے مابین تعلق کی نوعیت کو واضح کرنا مقصد ہوتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال منٹو کا مشہور افسانہ 'بابو گوپی ناتھ' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا راوی ایک ہی واقعے کو تین مختلف زاویوں سے بیان کرتا ہے جسے اس کے علاوہ افسانے کے دو اور کردار مختلف نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ سب کے دیکھنے کا نظریہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ کرشن چندر کے افسانے 'ان داتا' میں بھی یہی ارتکاز نظر کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی کردار، واقعہ، مسئلہ Three Dimentional ہو جاتا ہے۔ ممتاز شیریں اس حوالے سے لکھتی ہیں:

''...ایک ہی چیز کی مختلف زاویوں سے کئی تصاویر لی جاتی ہیں۔ کئی زاویوں سے دکھانے پر اس چیز کے مکمل خط و خال ابھر آتے ہیں اور یہ شبیہ تصویر سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔ فوٹو یا تصویر یا چپٹے کاغذ پر کسی چیز کا صحیح نقش اور اس کی لمبائی چوڑائی تو دکھا سکتی ہے لیکن ابھار پیدا نہیں کر سکتی۔ لیکن بُت میں لمبائی چوڑائی کے علاوہ موٹائی بھی آ سکتی ہے اور گولائی بھی، اور اس طرح وہ چیز اصل سے قریب تر ہو جاتی ہے اور فن کار اگر افسانے یا ناول میں کسی واقعے، مسئلے، کردار یا انسانی زندگی پر کئی زاویوں سے روشنی ڈال کر شبیہ پیش کرے تو وہ مصور سے آگے بڑھ کر بت تراش بن جاتا ہے اور ہیئت Three Dimentional نکل آتی ہے، یعنی وہ مسئلے پر مختلف ذرائع سے شواہد حاصل کر کے روشنی ڈالتا ہے۔''

(ناول اور افسانے میں تکنیک کا تنوع، مشمولہ رسالہ تنقید، ص 36)

واقعہ خارجی ہو یا داخلی بذات خود اس وقت تک معنی برآمد نہیں کر سکتا جب تک اس کا اظہار نہ کیا جائے، اس میں معنی کی دریافت بیانیہ کی وساطت سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ گویا واقعہ بیان کا محتاج ہوتا ہے۔ اور راوی، واقعے اور بیان کے مابین ایک لسانی ذریعہ/ ترسیل (میڈیم) کی حیثیت سے نمو دار ہوتا ہے۔ اس کے بیان سے واقعہ کا بیانیہ سماجی، معاشرتی فکری غرض کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اور وہ جو صورت اختیار کرتا ہے اس کے نتیجے میں راوی کا نقطۂ نظر وضع ہوتا جاتا ہے، جس کی روشنی میں وہ واقعہ کو جس زاویے سے دیکھتا اور تجربہ کرتا ہے اپنی ترجیحات سے آمیز کر کے بیان کر دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ناول 'باغ' ہے۔

مرنے والے وہاں کی عوام کے لیے دشمن ہیں کیونکہ وہ مقبوضہ کشمیر میں عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں اور طرح طرح سے ستاتے ہیں۔ وہاں کی عوام (مجاہدین) چھپ چھپا کر یا دھوکہ دھڑی سے ان کو قتل کر کے اپنا انتقام لیتے ہیں۔ قاری بھی یہی سمجھتا ہے لیکن راوی نے جس طرح ان کے قتل کی روداد بیان کی ہے۔ اس سے ناول کے کردار اسد، ریاض اور خود قاری پر خوف و دہشت اور استعجابی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں، اب دونوں کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ قاری کو یکا یک ریاض اور اس کے ساتھی ظالم اور مرنے والے مظلوم لگنے لگتے ہیں۔ راوی قاری کا نظریہ بدل دیتا ہے۔ ان کی اچانک اور بے رحم موت، اس کے دل میں ترحم و ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ قتل کا موضوع دیگر فن پاروں میں بھی بیان ہوا ہوگا لیکن ان کی اثر انگیزی ان کے بیان کے سبب منعکس ہوگی نہ کہ واقعے کے سبب۔ اسی طرح خواہ کوئی بھی واقعہ ہو یا صورت حال، اس کی تعبیر، معنی خیزی یا اسباب وعلل سب راوی کے بیان سے ہی تشکیل پائیں گے۔

راوی کی ترجیحات میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کہیں پہ کوئی منظر کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے، کبھی دو یا دو سے زائد متضاد خیالات کو یکجا کرتے ہوئے اور کبھی تائیدی دلائل پیش (Justify) کرتے ہوئے متن میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ناول 'نادار لوگ' کا بیانیہ گرچہ ہمہ ہیں راوی کی زبان میں تشکیل پاتا ہے۔ راوی ناول کے ایک کردار سرفراز کی ذہنی کیفیات، اس کے خواب، خیالات کی رو اور وہ کیا سوچ رہا ہے ان تمام عناصر کو باہم متحد کرنے اور بامعنی بنانے کے لیے آگے آتا ہے اور ناول کے دیگر کرداروں کے حوالے سے یا خود اس کی اپنی زندگی کے تئیں جو جو خیال سرفراز کے ذہن کے پردے پر نمودار ہوتا ہے راوی قاری کو اپنی استعداد کے مطابق بتاتا جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے قاری خود کردار کے ہمراہ ہو اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہو۔ اس طرح کہانی سرفراز کے ذہن سے نکل کر وسعت اختیار کرنے لگتی ہے۔ جیسے سطح سمندر میں کنکر پھینکنے سے متعدد لہریں دائرہ در دائرہ دور تلک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن بوقت ضرورت ہی یہ Applied Author خود راوی میں اس لیے منقلب ہوتا ہے کہ موضوع کے مطابق مواد کے ساتھ ساتھ اپنی معلومات کو بھی بیان کر سکے۔ مثلاً اقتباس ملاحظہ ہو:

"ملک کے بٹوارہ کا موقع آن پہنچا تھا۔ سال چڑھا تو افواہیں پھیلنی شروع ہوئیں کہ آبادی کی ادل بدل شروع ہو چکی ہے۔ پھر فساد اور مار دھاڑ کی کہانیاں کانوں تک پہنچنے لگیں۔ کیسر سنگھ والا میں اگرچہ مسلمانوں کا ایک ہی گھرانہ تھا اور اس میں بھی اب فقط چند فرد رہ گئے تھے، مگر جدی پشتی رہائش کے مقام پر ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

یعقوب اعوان کو ایک پل کے لیے بھی اس بات کا گمان نہ ہوا کہ وہ نقل مکانی کرے، یہاں تک کہ جلسے جلوس اور نعرے امرتسر کے شہر سے نکل کر نواح کے قصبوں اور گاؤں میں سرایت کر آئے۔ پھر کچی سڑکوں پر ہجرت کرتے ہوئے بدحال قافلے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو آتے ہوئے نظر آنے شروع ہوئے۔ عورتوں بچوں کی چیخ و پکار اور انسانی خون کے نظاروں نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ اس ہوا نے آگ کے شعلے بھڑکائے جو خون اور آہ و بکا، کے طوفان میں شامل ہو گئے۔۔۔۔ دن چڑھنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ اعوانوں کا کنبہ اپنے گاؤں کی حدود سے نکل گیا۔ سورج ایک ہاتھ اوپر آ چکا تھا جب وہ زینب کے باپ کے گھر پہنچے۔"

(نادار لوگ، ص 66,70)

یہاں تقسیم ہند، فسادات، بلوائیوں کی ہنگامہ آرائی، اسی میں سرفراز کے خاندان کی ہجرت اور دیگر جزئیات کو راوی اپنے بقدر مشاہدہ بیان کرتا ہے۔ اس طویل اقتباس میں کئی اہم باتوں کی جانب اشارہ ہے، جو پورے ناول کو معنوی جہات عطا کرتا ہے۔ اس میں تقسیم اور بٹوارہ کا دلدوز سانحہ پوشیدہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرفراز کا گھرانہ مہاجر ہے، جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے۔ اس کا اثبات ناول کے اختتام پر ہوتا ہے کہ یہی مہاجرت سرفراز اور اس کے بھائی اعجاز کو کن کن صعوبتوں سے دوچار کرتی ہے۔ راوی کا یہ تفصیلات بیان کر دینا یہاں ناگزیر ثابت ہوتا ہے۔ قاری ان تمام اسباب و نتائج کا بہ آسانی ادراک حاصل کر لیتا ہے کہ کیوں سرفراز کو فوجی خدمات سے معطل کر دیا جاتا ہے اور کیوں اس کے بھائی اعجاز پر خفیہ اداروں کی جانب سے تشدد کیا جاتا ہے۔ سب کا سرا راوی کی ابتدائی معلومات میں پیوست ہوتا ہے۔ یوں راوی کا بیانیہ ناول کی فنی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

راوی کے حوالے سے ایک بات یہ ہے کہ راوی خواہ متکلم ہو یا غائب کہانی اور واقعات کی نوعیتوں اور تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ہی تخلیق کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کے انتخاب یا تشکیل میں جنس، عمر، تعلیم، زبان، ثقافتی، سماجی و معاشرتی معیار و اقدار وغیرہ کا خاص خیال کیا جاتا ہے۔ راوی کے فرق اور اس کے مناسب انتخاب پر ممتاز شیریں نے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

افسانے کے بیان میں صیغہ اور تذکیر و تانیث (عورت کی زبانی، مرد کی زبانی) کا فرق بہ ظاہر معمولی دکھائی دیتا ہے، لیکن اس سے تاثر میں بہت زیادہ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے افسانوں کے لیے جن میں مصنف اپنے آپ کو کرداروں اور ماحول سے الگ رکھ کر غیر جانب دارانہ طور پر نقشہ کھینچتا ہے، صیغۂ غائب اور ان ڈائرکٹ نریشن موزوں ہے۔ یا اگر مصنف خود ایک طبقہ سے تعلق رکھتا ہو اور ایک دوسرے طبقے کی زندگی کا نقشہ کھینچ رہا ہو تو صیغہ غائب استعمال کرنا پڑتا ہے۔ صیغہ متکلم میں بیان کرنے سے جذباتی اثر زیادہ ہوتا ہے۔ بعض افسانوں میں مواد اور موضوع ایسا ہوتا ہے کہ مرد کی زبانی کہے جانے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو عورت کی زبان سے پیدا ہو سکتی ہے۔

(ناول اور افسانے میں تکنیک کا تنوع۔ مشمولہ رسالہ تنقید، ص 14)

مذکورہ اقتباس کی توثیق کے لیے متعدد افسانوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن میں بیانیہ کی مکمل اور فطری ترسیل کے لیے راوی کی جنس، عمر اور لیاقت کا انتخاب مواد اور موضوع کے لحاظ اور مناسبت سے کیا گیا ہے۔ جیسے عصمت کے افسانے 'لحاف' میں ہم جنسی کے میلان کو پیش کرنے کے لیے ایک کم سن راوی کا انتخاب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کم سن راوی کی زبان میں افسانہ فحش ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ جو کچھ وہ بیان کرتی ہے اس میں معصومانہ انداز اظہار اور جنسی افعال سے اس کی نیم لا علمی بیانیہ کو اثر انگیز بنا دیتی ہے۔ انتظار حسین نے عصمت کے راوی کے انتخاب کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا تھا:

میرے خیال میں تو عصمت نے صحیح انداز بیان اختیار کیا۔ کہنے والا بالغ ہوتا تو یہ چیز گھناؤنی ہو جاتی۔ بچوں کی زبان سے یہ ہم تک پہنچ گئی اور اس میں عریانی نہیں رہی۔"

(سمپوزیم اردو افسانہ، نقوش، افسانہ نمبر، لاہور، ص 39)

گزشتہ بیانات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ فکشن کا بیانیہ اپنے راوی کے اوصاف اور اس کے نقطۂ نظر سے متصل ہوتا ہے۔ موضوع و مواد خود اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ اسے کس کے نقطۂ نظر اور کس کی زبان سے بیان کیا جائے۔ یہی بیانیہ راوی کی صفات اور امتیازات کی دریافت میں قاری کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہر فکشن نگار مذکورہ نظری مباحث کی متعدد جہات کو اپنی تخلیقات میں برتنے کی کوشش کرتا ہے۔

■

Dr. Anjum Parveen
Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
anjumparveen1491@gmail.com

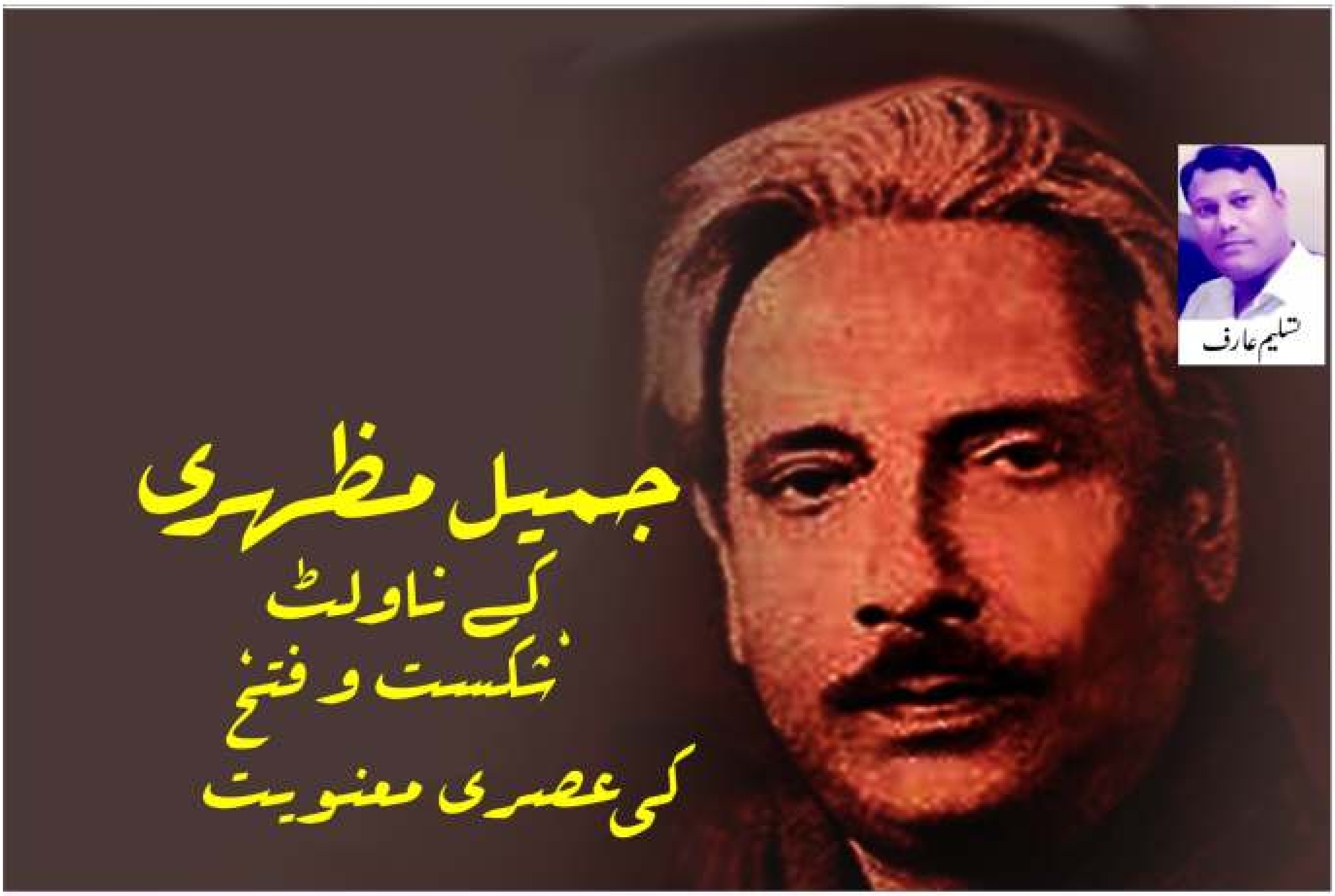

تسلیم عارف

جمیل مظہری کے ناولٹ 'شکست و فتح' کی عصری معنویت

برِصغیر میں اردو ادب کے حوالے سے بنگال کے جن ادبا و شعرا کا نام احترام سے لیا جاتا ہے، ان میں جمیل مظہری ایک اہم نام ہے۔ بنگال کا ذکر یہاں اس لیے ناگزیر ٹھہرا کہ جمیل مظہری نے خود اپنی بعض تحریروں میں اعتراف کیا ہے کہ ان کا شعور اسی زرخیز مٹی میں بالیدہ ہوا۔ انھوں نے شعر و ادب کی مختلف اصناف سے شغف رکھا لیکن بطور شاعر وہ مقبول ہوئے۔ نثری ادب میں مختلف اصناف میں بھی توجہ صرف کی۔ انشائیے اور خاکے بھی انھوں نے لکھے لیکن فن افسانہ نگاری میں وہ سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے بعض افسانے اہم سمجھے گئے۔ ایک طویل افسانہ بہ عنوان 'فرض کی قربان گاہ پر' تخلیق کیا، جسے بعد میں بطور ناولٹ 'شکست و فتح' کے عنوان سے مقبولیت حاصل ہوئی۔

'شکست و فتح' میں جمیل مظہری نے داستان عشق کو شگفتہ و دلفریب بیانیہ میں تخلیق کیا ہے۔ ناولٹ میں تین اہم کردار ہیں: حامد، محمود اور سلیمہ۔ ان کرداروں میں سلیمہ کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور یہ شروع سے آخر تک پورے ناولٹ پر چھائی ہوئی ہے۔ دراصل یہ بیانیہ کی راوی ہے۔ جمیل مظہری کا کمال ہنرمندی یہ بھی ہے کہ انھوں نے سلیمہ کو تمام کرداروں پر فوقیت دی ہے۔ تمثیلی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ دریا کا ساحل بھی ہے اور موجوں کا تلاطم بھی کہ موجوں کو قابو میں رکھنے کا کام ساحل ہی انجام دیتا ہے۔

حامد، محمود اور سلیمہ ایک ایسے گھرانے کے افراد ہیں، جہاں مشرقی تہذیب کی پاسداری کی جاتی ہے، جہاں لڑکیوں کو اپنے منتخب لڑکے سے شادی کرنے کا رواج نہیں جہاں کے لڑکے اپنی پسند سے اپنے والدین کو آشنا کراتے ہوئے سو بار سوچتے ہیں اور ان کی پسند پر والدین کی جانب سے منفی جواب ملتا ہے تو انھیں اپنے انتخاب کے لیے باغیانہ رویہ اختیار کرنے کی بھی ہمت نہیں۔ تبھی تو جب محمود اپنی والدہ سے اپنے اور سلیمہ کے رشتے کی بات کرتا ہے تو اس کی ماں یہ کہہ کر کہ "توبہ کرے چھوکرے! سلیمہ تجھ سے عمر میں کئی مہینے بڑی ہے۔" اس کی محبت کے مچلتے جذبات کو یکلخت دبا دیتی ہے۔

محمود اور سلیمہ کی داستان عشق کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ یعنی عاشق اور معشوق کے درمیان رقیب کا آجانا۔ یہاں بھی وہی ہوا۔ حامد (محمود کا سگا بھائی) رقیب بن کر محمود اور سلیمہ کے درمیان حائل ہوجاتا ہے اور سلیمہ سے اس کی شادی ہوجاتی ہے۔ محمود کو سلیمہ سے شکایت عمر بھر رہتی ہے کہ اس نے خود سپردگی کیوں کردی؟ اس نے اپنی محبت کو بچانے کے لیے کوئی جدوجہد کیوں نہیں کی؟ گھر والوں اور والدین کی خوشیوں کے لیے اپنے ارمانوں کا خون کیوں کیا؟ محمود کا تقاضا عشق اور سلیمہ کا تہذیبِ عشق پہ اصرار ہی فنکار کی وسیع النظری کی عمدہ مثال ہے۔

بہر حال سلیمہ اور حامد کی شادی ہوجاتی ہے۔ حامد، سلیمہ کو پاکر بے حد خوش رہتا ہے لیکن سلیمہ کے دل سے محمود کی یاد ختم نہیں ہوتی۔ سلیمہ کو ہر لحہ یہ احساس رہتا ہے کہ وہ اب بھی ایک محبوبہ کی زندگی جی رہی ہے۔ بیوی بننے میں اس کے جذبات، اس کی معاونت نہیں کر رہے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"ابر گھر کر آئے، برسے اور برس کر کھل گئے لیکن برف کے وہ تودے جو میرے دل کے گرد جمے ہوئے تھے، نہ پگھلنا تھے، نہ پگھلے۔ جھوٹ کیوں بولوں، میرا جسم رہنے کو رہا حامد کے پہلو میں لیکن تصورات محمود کی آغوش کا خواب دیکھا کیے۔ یہ تھا میری ازدواجی زندگی کا پہلا سال۔" (ص 17)

آخر ایک دن سلیمہ اپنے وفور جذبات پر قابو پالیتی ہے اور اپنے اندر کی محبوبہ کو مار ڈالتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ صرف حامد کی بیوی بن جائے۔ تن سے بھی اور من سے بھی۔ محمود کی نظروں سے دور بہت دور اور اپنے رفیق سفر کی نظروں کے قریب سے قریب رہنے کے لیے وہ اپنے شوہر کو کلکتہ چلنے پر آمادہ کرلیتی ہے تاکہ اسے بیوی اور محبوبہ کی دوہری زندگی جینے سے چھٹکارہ مل سکے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"کون کہتا ہے کہ عقل جنون پر فتح نہیں پاسکتی اور عشق کے جذبات فرض کے احساس کے ماتحت مغلوب نہیں کیے جاسکتے۔ میں نے خود انھیں ایک حد تک مغلوب

کیا ہے اور حالات اگر میرے ناموافق نہ ہوتے تو شاید پوری طرح مغلوب کر لیتی۔ میں کلکتہ پہنچ کر محمود اور اس کی محبت کو بھولنے لگی ...... زنجیروں کو پوجتی رہی، تمناؤں کو بہلاتی رہی۔'' (ص 40)

سلیمہ کا اپنے جنون پر قابو پانا اس بات کی علامت ہے کہ مشرقی روایت کی پاس دار لڑکیاں چند ثانیے کے لیے بھلے ہی بہک جائیں لیکن جلد ہی راہ راست پر آجاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے بالخصوص مشرقی تہذیب میں محبت یا عشق کو 'نوجوانی کی حسین بھول یا خطا' سمجھا جاتا ہے اور جب خطا کا احساس انسان کو ہوجائے تو اسے پشیمانی سے کوئی حرج نہیں ہوتا۔ سلیمہ بھی محمود سے دور، دوسرے شہر کا رُخ اسی لیے کرتی ہے کہ اسے مشرقی آداب و لحاظ ہر لمحہ کچوکے لگاتے ہیں۔

سلیمہ کی جدائی محمود کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اپنے غم غلط کرنے اور سلیمہ کی یاد کو اپنے دل سے رفع کرنے کے لیے محمود ان گلیاروں میں جا پہنچتا ہے، جسے بازارِ حسن کہا جاتا ہے۔ یہاں وہ ثریا نام کی عورت کے پہلو میں سکون تلاش کرتا ہے لیکن اسے ناکامی ملتی ہے۔ ثریا کے بعد پروین، محمود کی زندگی میں آتی ہے لیکن یہ دونوں ہی عورتیں سلیمہ کی جگہ نہیں لے پاتیں۔ سلیمہ کو جب اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ محمود اس کی یاد سے چھٹکارہ پانے کے لیے ایک غیر مہذب عورت کا سہارا لے رہا ہے تو وہ اُسے ایک خط لکھتی ہے اور مشورہ دیتی ہے کہ جلد از جلد وہ اپنی زندگی کا شریک سفر ڈھونڈ لے۔ وہ محمود کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ جس راہ پر چل رہا ہے، وہ راہ اُسے آسودگی بہم نہیں پہنچا سکتی بلکہ تاریک غار میں ڈھکیل دے گی۔

''محمود! اپنی زندگی کی قدر کرو — یہ گنوانے کی چیز نہیں۔ اس کے ایک جائز استعمال سے لاکھوں انسانوں کی قسمتیں بدل سکتے ہو —'' (ص 109)

علامہ جمیل مظہری چونکہ بنیادی طور پر ایک معتبر شاعر ہیں اور شاعری کی بیشتر اصناف میں انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے، اس لیے ناولٹ لکھتے وقت بھی ان کا قلم تغزل کی چاشنی میں ڈوبا ہے۔ 'شکست و فتح' میں قاری کی دلچسپی کے کئی سامان ہیں، جن میں سب سے اہم اس کے مکالمے ہیں۔ کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے نہ صرف لطف سے بھرپور ہیں بلکہ ان میں فلسفیانہ فکر و نظر بھی ملتی ہے۔ فکر و فلسفہ اور لطف سے بھرپور چند مکالمے ملاحظہ فرمائیں:

1. ''بات یہ ہے کہ یہ سب تمہاری شاعرانہ خوش فکری ہے۔ تم روح کی ترکیب میں خواہ مخواہ جنسیت کو شامل کر کے غلط بنیاد پر غلط تصور قائم کرتے ہو۔''

2. ''جب بربادی کی یہ پہلی منزل بآسانی طے ہوگئی تو یہاں سے دوسری منزل کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔''

3. ''شادی معاشرتی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ایک ٹھیکہ ہے۔ ایک مفاہمت ہے، ایک معاہدہ ہے، جیسا کہ عام طور پر دو فریقوں میں ہوا کرتا ہے۔''

4. ''حامد کی مداخلت نے واقعی ہمیں وہ کھیل کھیلنے نہ دیا، جسے ہم جوان ہو کر بھی کھیلنا چاہتے تھے۔''

5. سلیمہ تمھیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے تو بھاوج بنا کے پیار کر لینا۔ بھائی ہی کی تو چیز ہے، کوئی غیر تھوڑے ہی لیے جاتا ہے۔''

6. ''شادی نام ہے معاشرتی قیود کی سنہری زنجیروں کا۔''

7. ''متمدن دنیا نے اصولی حیثیت سے اس کی ہستی کو مرد سے جداگانہ کوئی مستقل چیز کبھی تسلیم نہ کیا۔ اس کا جواب یہ کہ عورت تخلیق ہوئی مرد کی دلچسپی کے لیے — مرد، عورت کے لیے نہیں بنا........''

8. 'محمود نے میرے ارادہ کو تاڑ کر گردن بڑھائی اور مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا لیکن آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ قصور سرزد ہوگیا جس کے بعد ہونٹوں کو تو کنوارا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تھا میرا پہلا اور آخری گناہ.......''

'شکست و فتح' کا موضوع عشق و محبت اور ہجر کا احاطہ کرتا ہے لیکن کرداروں اور مکالمے کی چستی اور زبان و بیان کی سحر انگیزی نے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ ناولٹ نگار نے محض تین کرداروں کی روشنی میں اپنی وسعت نظری کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے یہ عشق پہ مبنی عام کہانی ہے لیکن جمیل مظہری جیسے مفکر ادیب اتنی سی بات کہنے کے لیے ناولٹ قلم بند نہیں کرتے۔ اس کے لیے ان کی نظمیں ہی کافی تھیں۔ دراصل انھوں نے حسن، خیر اور صداقت کے تحت افکار و خیالات کے لیے در وا کیے ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب و ثقافت کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ جس عہد میں ناولٹ تحریر کیا جا رہا تھا، اس وقت تک بیرونی تہذیب و ثقافت، شرقی تہذیب و ثقافت پر حاوی ہو رہی تھی۔ ولایتی لباس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے اذہان کی بھی نقالی کی جا رہی تھی۔ جمیل مظہری، اکبرالہ آبادی کی طرح انگریزیت کے کٹر مخالف نہیں تھے لیکن بالخصوص خواتین کے تعلق سے ان کا مزاج مشرقی ثقافت سے ہم آہنگ تھا، ورنہ سلیمہ کا کردار کسی اور شکل میں پیش کرنے کے لیے وہ آزاد تھے بلکہ ناولٹ کے بعض مقامات پر محمود کے ذہن کو اس جانب موڑا بھی ہے۔ مثلاً یہ طنزیہ جملے:

''کاش ہم تم یوروپ کے آزاد ممالک میں جنم لیے ہوتے، ہندوستان غلام ہے اس لیے یہاں کے ہر رواج میں غلامی کا تخیل ہے۔ یہ بدبخت فطرت کو بھی بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔''

چونکہ انھوں نے اپنی تہذیب، اپنی ثقافت میں حسن، خیر اور صداقت کا رمز دیکھا، اسی لیے جذبۂ عشق کے فطری تقاضے پر قدغن لگاتے ہوئے سلیمہ کی زبانی کہلواتے ہیں:

''ایک کے ساتھ بے وفائی کرنا بہت سے لوگوں کے ساتھ بے وفائی کرنے سے بہتر ہے۔ ماں کے ساتھ بے وفائی، باپ کے ساتھ بے وفائی، کنبے کے ساتھ بے وفائی، خاندان کے ساتھ بے وفائی، معاشرت و قانون کے ساتھ بے وفائی.....اور صرف تمہارے ساتھ وفا۔''

درج بالا اقتباس ہی جمیل مظہری کا پُر اثر اظہاریہ ہے۔ ناولٹ نگار نے سلیمہ کے کردار کو مشرقی تہذیب کے ایک خوبصورت پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ جدید معاشرے میں بھی یہ ایک زندہ کردار ہے۔ برصغیر کی تہذیب و ثقافت کے تقاضے کو پورا کرتا ہوا یہ کردار عصر حاضر کے چند ناول نگاروں کے لیے بھی ایک آئینہ ہے۔ عصر حاضر میں تعلیم یافتہ خواتین کی ذہنی وسعت نظری کے تناظر میں سلیمہ کا کردار اس لیے زیادہ قابل قبول ہے کہ معاشرہ جتنا بھی ترقی یافتہ ہوجائے لیکن معاشرے میں ہر کنبے، ہر خاندان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس میں بکھراؤ نہ ہو۔ آئندہ نسلوں کے روشن مستقبل کنبے اور خاندان کی سلامت پر ہی منحصر ہے۔ جمیل مظہری نے ایک ایسا کردار خلق کیا جس کی ضرورت عصر جدید میں زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ 'شکست و فتح' جیسا فکری و معنوی ناولٹ عصری تقاضے کو بھی پورا کرتا ہے اور اسلوب کی ندرت بیانی کی وجہ سے ادب میں آج بھی قابل مطالعہ ہے۔

'شکست و فتح' بھلے ہی سجاد ظہیر کی 'لندن کی ایک رات' یا بیدی کی 'ایک چادر میلی سی' کی سطح کی تصنیف نہ ہو لیکن اس کی عصری معنویت سے کسی بھی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں زیر تذکرہ ناولٹ کو جمیل مظہری کے بعد کے فکشن نگاروں کے لیے منافعِ مستمرہ کی چیز سمجھتا ہوں۔

■

Dr. Tasleem Arif
Asstt. Professor, Deptt. of Urdu
Kidderpore College,
2 & 3, Pitambar Sircar Lane, Kolkata - 700023
Mobile: 9339116285, 7003350449
e-mail : tasleemdtp@rediffmail.com

محمد جابر حمزہ

مسز عبد القادر کے تحیر خیز افسانے

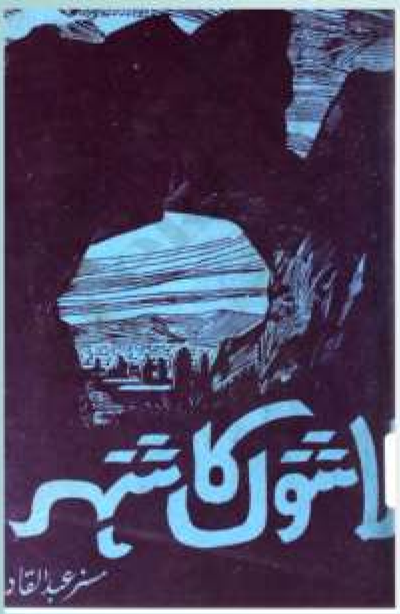

1857 کے انقلاب میں ناکامی نے ملک گیر سطح پر محاسبے اور غور و فکر کے عمل کا آغاز کیا۔ سرسید نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریزوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ غدر 1857 انگریز حکمرانوں کی غلط حکمت عملیوں اور طریق کار کا نتیجہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی سرسید نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ انگریزوں کے مد مقابل ان کی شکست کا ایک اہم سبب جدید تعلیم اور نئی سائنسی ایجادات و دریافت سے ان کی لاعلمی و بے نیازی تھی۔ سرسید کی اس آواز نے اثر کیا اور مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے انگریزی زبان سیکھی اور جدید تعلیم کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے۔ ان حضرات نے سرسید کے شانہ بشانہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لیے بھی جد و جہد کی۔ ان میں سے کچھ سرسید سے چند امور میں اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن جدید تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں سرسید کو ان کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی۔ سرسید کی اس تعلیمی تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے مردوں نے جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی تحصیل کی اور اس کے بعد اپنے گھر کی خواتین کو بھی اس کے مواقع فراہم کیے۔ سرسید کی کاوشوں سے جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا اس نے مسلم معاشرے کی علمی تربیت کے لیے عملی طور پر کام کیا۔ اخبارات و رسائل جاری کیے اور مختلف سماجی و فلاحی انجمنیں بھی قائم کیں۔ ان تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین نے بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ یہی وہ دور ہے جب بہت سے ایسے رسائل منظر عام پر آتے ہیں جنھیں ان خواتین نے عورتوں میں بیداری لانے کے لیے جاری کیا تھا۔ صغرا ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، عباسی بیگم، حجاب اسمٰعیل، مسز عبد القادر اور کئی دوسری خواتین قلم کاروں نے اپنی تحریروں، مضامین، کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے مسلمان عورتوں کو تفریحی ادب بھی مہیا کرایا اور ان کی ذہنی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اس دور کی مسلم خاتون قلم کاروں نے عورتوں کے عام سماجی مسائل کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور انگریزی ادب کے اس وقت کے ادبی رجحانات کو سامنے رکھ کر اردو میں ایسی کہانیاں لکھیں جو انتہائی دلچسپ بھی تھیں اور سبق آموز بھی۔

یہ وہ دور تھا جب انگریزی میں ایسی کہانیاں اور ناول لکھے جا رہے تھے جو ایک قسم کی طلسماتی فضا کے حامل تھے ان ناولوں اور کہانیوں میں تحیر و تجسس بھی تھا، پراسرار واقعات و کردار بھی تھے اور ایک انتہائی رومانی فضا بھی۔ H. Rider Haggard کا مشہور ناول 'She' اس دور میں بے حد مقبول تھا یہ اور اسی طرح کے دوسرے ناول فنطاسی اور مہم جوئی کے حامل تھے۔ انگریزی کے اس تخلیقی و ادبی رجحان و مزاج سے جن دو خواتین تخلیق کاروں نے استفادہ کیا ان میں حجاب اسمٰعیل اور مسز عبد القادر کا نام سرفہرست ہے ان دو تخلیق کاروں نے خوفناک واقعات، ناقابل فراموش کردار، ہولناک لیکن موثر فضا و ماحول سے ایک ایسی تخیلی دنیا سجائی جسے پڑھ کر قاری اس میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ خصوصاً مسز عبد القادر نے جس طرح کی کہانیاں لکھیں وہ انتہائی پراسرار فضا اور خوفناک ماحول کی حامل تھیں۔

مسز عبد القادر کا اصلی نام زینب خاتون تھا۔ ان کی پیدائش 1898 میں جہلم میں ہوئی۔ والد کا نام مولوی فقیر محمد تھا جو فاضل دیوبند اور اپنے وقت کے جید عالم اور قوم کے رہنما تھے۔ آفتاب محمدی، صحیفہ سیف الصارم اور حدائق الحنفیہ ان کی بہترین تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ سراج المطابع اور سراج الاخبار کے مالک و مدیر بھی تھے۔ مسز عبد القادر کا تعلق ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کی دادی بیراگن کے نام سے پنجابی میں سی حرفی اور بارہ ماسا لکھتی تھیں۔ مسز عبد القادر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی معلم اور معلمات کے ذریعے ہوئی۔ زمانے کے دستور کے مطابق اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، انھوں نے بوستاں، گلستاں، پندنامہ وغیرہ کتابیں گھر پر ہی پڑھیں۔ تیرہ برس کی عمر میں ایک ریلوے انجینئر میاں عبد القادر سے ان کی شادی ہوگئی جو عمر میں ان سے کئی برس بڑے تھے۔ اس شادی سے ان کے یہاں تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے ایک بیٹے سراج الدین ظفر نے اردو ادب میں کافی نام کمایا۔ وہ ایک افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ دل کا دورہ پڑنے سے مسز عبد القادر کا 18 اکتوبر 1976 کو لاہور میں انتقال ہوگیا۔ مسز عبد القادر کو بچپن سے ہی سیر و سیاحت کا شوق تھا جس کے سبب وہ مختلف مقامات کا سفر کرتی رہتی تھیں، کبھی ساحل سمندر، کوئی پہاڑی مقام، اکثر و بیشتر جہلم، راول پنڈی، پشاور اور لاہور میں ان کا وقت گزرتا تھا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ہمراہ پورے ہندوستان اور چند بیرون ممالک کا بھی سفر کیا تھا۔ ان سیاحتوں سے ان کے مشاہدے، تجربے، اور معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا اور یہی معلومات اور ان کا یہی مشاہدہ ان کے تخلیقی سفر میں بے حد کام آیا۔ ان کے شوق سیاحت کی تفصیل مرزا حامد بیگ نے اس طرح بیان کی ہے:

''اپنے میاں کے ساتھ کلکتہ، بنارس، دلی اور آگرہ کی جی بھر کے سیاحت کی، یہاں تک کہ پورا ہندوستان دیکھا۔ کنکھل کے مندر، بھیم گوڑا، ہری ہر آشرم، رشی کیش، سرسوتی کنڈ، لچھمن جھولا، سورگ آشرم، اجنتا، ایلورا اور ایلی فنٹا کے غار، دولت آباد، گولکنڈہ، گوالیار، رہتاس، اور کرکرناٹک کے قلعہ جات ملاحظہ کرنے کے ساتھ ساتھ

ہندومت، شیومت، برہمن مت، ہنومت، نیل مت، بدھ مت، جین مت، اور اگنی مت وغیرہ کی رسومات کے مطالعہ کے ساتھ پوتھیوں، پرانوں اور شاستروں کے مہاتم نسخہ جات کھنگال ڈالے لیکن رہیں راسخ العقیدہ مسلمان اور پابند صوم وصلوٰۃ۔ حج کیا، مزارات پر حاضری دی۔ یوروپ دیکھا، لبنان، قاہرہ، اور مصر میں رہیں۔''

(اردو افسانے کی روایت (1903 - 2009) مرزا حامد بیگ، عالمی میڈیا دہلی، فروری 2014، ص 390)

مندرجہ بالا اقتباس سے سیر و سیاحت سے ان کی دلچسپی صاف دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ قدیم تہذیبوں اور ان کی ویران کھنڈروں سے بھی کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ مسز عبدالقادر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 20-1919 کے آس پاس اس افسانہ 'لاشوں کا شہر' سے کیا لیکن ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے' اردو بک اسٹال، لاہور سے 1936 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سات افسانے راکھشس، معلم کا راز، گلنار، زیتون، لاشوں کا شہر، آواگون، یوم محبت اور آخر میں اختتامیہ کے عنوان سے ایک مختصر مضمون ہے جس میں اس مجموعے میں شامل افسانوں کا تاثراتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا افسانوی مجموعہ 'صدائے جرس' اردو بک اسٹال لاہور سے 1939 میں شائع ہوا۔ جس میں کل آٹھ افسانے ہیں۔ مجموعے میں شامل افسانوں کے ساتھ ساتھ اشاعت اور مقام بھی درج ہے۔ صدائے جرس (20 ستمبر 1937 ملتان)، منوہر (20 اکتوبر 1937 شملہ)، سادھ کا بھوت (جولائی 1937 کانگڑہ)، ایفائے عہد (دسمبر 1938)، داغ معصیت (5 ستمبر 1938 لاہور)، بلائے ناگہاں (مارچ 1938)، ارواح خبیثہ (مئی 1938 پالم پور) اور پاداش عمل (25 ستمبر 1930 رہتاس)۔ اس کے علاوہ دو اور افسانوی مجموعے 'راہبہ اور دوسرے افسانے' اردو بک اسٹال لاہور سے 1946 اور 'وادی قاف اور دوسرے افسانے' اردو بک اسٹال لاہور سے 1954 میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ناول 'تخت باغ' مکتبہ تعمیر ادب، راولپنڈی سے 1960 میں منظر عام پر آیا۔ بقول مرزا حامد بیگ انھوں نے پانچ مطبوعہ کتب کے علاوہ چار ناول نامکمل حالت میں یادگار چھوڑے ہیں۔ مسز عبدالقادر پر اب تک ہندوستان میں کوئی تحقیقی کام دیکھنے کو نہیں ملتا اور ایک دو تنقیدی مضامین کے علاوہ کوئی کتاب بھی ان پر موجود نہیں ہے، البتہ پاکستان میں ان پر ایک تحقیقی مقالہ 'مسز عبدالقادر: حیات و فن' کے عنوان سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں 1994 میں لکھا گیا ہے۔

مسز عبدالقادر نے جس وقت افسانہ نگاری کا آغاز کیا وہ رومان اور حقیقت پسندی کا دور تھا لیکن انھوں نے ایک الگ راہ نکالی جس میں کوئی اصلاحی لائحۂ عمل نہیں پیش کیا بلکہ خوف و ہراس، ہیبت و دہشت سے بھرپور افسانے لکھے اور اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے زیادہ جاذب اور دلکش بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں داستانوی انداز پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے ہیبت ناک اور پراسرار افسانے کی وجہ سے اردو افسانے میں اپنا ایک الگ مقام بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ اردو افسانے کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اس طرح کے افسانے لکھنے کی شروعات کی۔ اسی لیے ش اختر انھیں گوتھک اسکول کی نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے بعد کئی ادیبوں نے اس طرح کی کوشش کی لیکن اتنے کامیاب نہیں ہوئے جو مسز عبدالقادر کے حصے میں آئی۔ ان کے افسانوں میں رنگینی اور عریانی کے فقدان کے باوجود حد درجہ جاذبیت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔

'لاشوں کا شہر' ایک وحشت ناک افسانہ ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے۔ اس میں ایک قصبے کے دو گاؤں کا ذکر ہے۔ ایک میں انسان بستے ہیں اور دوسرے میں بھوتوں کا ڈیرہ ہے۔ یہ بدروح جب چاہتی کسی کو گاؤں سے اٹھا لے جاتی، اتنا ہی نہیں گاؤں میں جب کسی کی موت ہو جاتی ہے تو رات کو بھوت اس قبر کو کھود کر لاش کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ ان بھوتوں سے کام لینے والا ایک انسان نعمان خان ہے، جو پہلے اسی گاؤں کا سردار تھا، اب وہ ان بھوتوں کا مالک ہے لیکن اس کے بھائی نے دھوکا دے کر گدی ہتھیالی اور گاؤں میں یہ مشہور کر دیا کہ اس کی موت ہوگئی۔ وہ ایک ظالم بادشاہ تھا۔ ایک حکیم مشتاق احمد کے گاؤں میں آنے سے اس راز سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ ظالم بادشاہ مارا جاتا ہے، پیشین گوئی کے مطابق اس کا بیٹا تخت نشیں ہوتا ہے۔ اس طرح گاؤں والوں کو اس ظالم بادشاہ سے چھٹکارہ ملتا ہے اور بھوتوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ حکیم مشتاق احمد ایک نڈر اور بے خوف نوجوان ہے لیکن وہ ان مردوں کو دیکھ کر بری طرح ڈرتا ہے، اس کے اس خوف کی عکاسی مصنفہ نے بے حد خوبی کے ساتھ کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'' آہ معبود! ایسا جگر پاش اور حوصلہ شکن نظارہ میرے پیش نظر تھا کہ خوف سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ انتہائی دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو کر رہ گئے اور گلا خشک ہو کر بند ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ انسانی لاشیں جن کی شکلیں مسخ شدہ اور بے حد ڈراونی تھیں، غار کے اندرونی حصے سے نکل کر ہماری طرف آرہی ہیں۔''

(لاشوں کا شہر، مسز عبدالقادر، ص 102)

مسز عبدالقادر کا یہ ایک طویل افسانہ ہے جس میں تشدد، خوف اور غیر فطری واقعات کے عناصر نمایاں ہیں۔ پلاٹ چست اور واقعات کی ترتیب بہترین ہے۔ کہانی بیانیہ کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر کہانیاں فلیش بیک کی تکنیک کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ان افسانوں میں زیادہ تر کردار ایک خوبصورت نوجوان لڑکا یا ایک حسین وجمیل لڑکی ہوتی ہے، جو تلاش و جستجو میں بھٹکتے ہیں اور بھوتوں، جنوں، مردوں، خبیثوں سے جا ٹکراتے ہیں اور پھر کہانی ایک ڈرامائی موڑ لیتے ہوئے خوفناک طریقے سے آگے بڑھتی ہے۔ ایک افسانے میں کئی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور افسانہ 'ارواح خبیثہ' ہے۔ کہانی ایک نوجوان لڑکے سے شروع ہوتی ہے جو چاندنی رات میں بارہ بجے چپکے سے گھر سے نکلتا ہے اور پہاڑی سے نیچے اتر کر قلعے کی طرف چلا جاتا ہے۔ قلعہ ایک دم ویران تھا لیکن درباری کمرہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے روشنی آرہی تھی۔ جب کہ قلعے کے دیگر تمام حصے تاریکی میں ڈوبے اور سنسان پڑے تھے۔ حیرانی ہوئی کہ یہ کمرہ دن میں بھی نہیں کھلتا آج خلاف معمول دروازہ کھلا بھی ہے اور اندر سے روشنی بھی آرہی ہے۔ قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا ہے اور سامنے ایک اسٹیج ہے جس پر کوئی سویا ہوا ہے۔ اچانک ایک خوبصورت لڑکی اسٹیج کے پاس نمودار ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں خنجر تھا، وہ خنجر اس سوئے ہوئے شخص کے سینے میں پیوست کر دیتی

ہے اور زور سے دوڑ لگاتی ہے۔ لڑکا اسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ وہ خود اسے پکڑ کر دوڑتی ہے اس کی گرفت اتنی مضبوط اور رفتار اتنی تیز تھی کہ پلک جھپکتے ہی وہ اسے لے کر وادی میں کود جاتی ہے۔ جب اس لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو وہ دلہن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے یہ وہی لڑکی تھی جس نے اس رات ایک شخص کا قتل کیا تھا۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کی بیوی بیمار پڑ جاتی ہے جب وہ بستر مرگ پر تھی تو وہ لڑکے کو اپنے پاس بلاتی ہے اور بتاتی ہے آپ جو مجھے سمجھ رہے ہیں میں وہ نہیں ہوں وہ میری ہم شکل ایک خبیثہ تھی جس کو اس رات آپ نے دیکھا تھا۔ بہت سال پہلے اس قلعے میں ایک زمیندار رہا کرتا تھا اس کی اکلوتی بیٹی بے حد حسین تھی لوگ اس کے حسن کے دیوانے تھے لیکن وہ ایک غریب کسان کے بیٹے سے عشق کرتی تھی۔ اس کے باپ نے اس کی زبردستی شادی کردی تھی اور اس کے عاشق کو شہر بدر کروادیا لیکن اس نے اس سے ملنا جلنا جاری رکھا اور ایک دن اپنے شوہر کے سینے میں خنجر گھونپ کر اپنے عاشق کے ساتھ وادی میں کود کر اپنی جان دے دی۔ اب وہ روز بارہ بجے رات کو قلعے میں آتی ہے اور اسٹیج پر سوئے ہوئے شخص کو خنجر مار کر دوڑتے ہوئے اسی وادی میں چلی جاتی ہے۔ اتنا کہہ کر اس کی بیوی انتقال کر جاتی ہے وہ بہت روتا ہے کہ اس خبیثہ کی وجہ سے وہ اپنی بیوی سے پیار نہ کر سکا۔ غصے میں رات کے بارہ بجے وہ پھر قلعے کے درباری کمرے میں پہنچ جاتا ہے۔ آج پھر وہی منظر اس کے سامنے تھا۔

مسز عبدالقادر نے ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر کی جس میں بنگال ان کی پسندیدہ جگہ معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر ان کے کئی افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ انھوں نے مختلف ملکوں کا بھی سفر کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کے ساتھ بیرون ممالک کے واقعات کو بھی اپنے افسانوں میں بہ حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور ان ممالک میں بھی وہ ایسے کھنڈر اور پرانی عمارتیں تلاش کر لیتی ہیں جو اکثر بھوت پریت سے مانوس ہوتی ہیں۔ مسز عبدالقادر کو کردار نگاری میں مہارت حاصل ہے، انھوں نے کردار نگاری میں بہترین تجربے کیے ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کے انسانی کردار کے برعکس ایک غیر فطری کردار جو اس دنیا کا نہیں ہے، اسے بھی وہ سلیقے سے پیش کرتی ہیں۔ عورت کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور کہانی اسی کے سہارے آگے بڑھتی ہے، یہ ایک نیک سیرت، خوبصورت، پاک صاف، مجبور و لاچار، مظلوم و معصوم عورت ہے۔

افسانہ 'صدائے جرس' میں ایک ایسے ہی کردار کو پیش کیا گیا ہے، جو مصر کے ایک بادشاہ کی اکلوتی بیٹی کا ہے۔ جس کا نام مریستار ہے، جو خوبصورتی کا مجسمہ ہے۔ دنیا بھر کے شہزادے اسے اپنی شریک حیات بنانا چاہتے ہیں لیکن اسے مردوں خاص کر عشاق سے سخت نفرت ہے۔ وہ مذہبی خیالات کی ہے اور بہت کم عمر میں ہی گوشہ نشینی اختیار کر لیتی ہے۔ معبود کی آزمائش پر وہ راہ سے بھٹک جاتی ہے اور اسے اپنے ہی ملک کے ایک خوبصورت نوجوان لڑکے سے عشق ہو جاتا ہے لیکن عشق میں دھوکا کھانے پر اس کا قتل کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ اب یہ اس کا ہر سال کا معمول بن جاتا ہے کہ کسی نوجوان کو اپنے جال میں پھنساتی ہے اور ایک خاص موقعے پر اس کا قتل کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی یہ عمل جاری رکھتی ہے حتیٰ کہ قدیم چیزوں میں دلچسپی رکھنے والے ایک ہندوستانی شخص کے ہاتھ یہ ممی لگ جاتی ہے، وہ اس کو ہندوستان لاتا ہے لیکن اس کے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے۔ افسانے میں چار ہندوستانی کردار خلیل، ممتاز، نسیمہ اور سعید، ان کے علاوہ چار مصری کردار مریستار، نوت، ڈاکٹر عمر آفندی اور مارمر ہیں۔ مسز عبدالقادر کے حیرت انگیز اور دل دہلا دینے والے افسانوں کے تعلق سے شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

''مسز قادر کے افسانوں کو اگر عقل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو عقل خود متحیر نظر آتی ہے اور انسان یہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ افسانے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ممکن ہے؟ اور اگر ممکن نہیں ہے تو پھر اتنی دلچسپی کیوں کر قائم ہے؟'' (یوم محبت، مسز عبدالقادر، لاہور، ص 48)

مسز عبدالقادر کے پیش نظر ان کہانیوں کا مقصد کسی قسم کے سماجی مسئلہ کی عکاسی نہیں تھا بلکہ وہ تھکے ہارے

مسز عبد القادر نے ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر کی جس میں بنگال ان کی پسندیدہ جگہ معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر ان کے کئی افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ انہوں نے مختلف ملکوں کا بھی سفر کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کے ساتھ بیرون ممالک کے واقعات کو بھی اپنے افسانوں میں بہ حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور ان ممالک میں بھی وہ ایسے کھنڈر اور پرانی عمارتیں تلاش کر لیتی ہیں جو اکثر بھوت پریت سے مانوس ہوتی ہیں۔

انسان کو تفریح کا سامان مہیا کراتی ہیں اس کے لیے وہ بھوت، پریت، جن، خبیث وغیرہ سے انسان کا ٹکراؤ دکھاتی ہیں اور ان کرداروں کو خوفناک طریقے سے پیش کرتی ہیں اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

مسز عبدالقادر نے جب قلم اٹھایا تو رومانیت کا دور دورہ تھا انھوں نے بھی وہی راہ اختیار کی۔ ان کا ایک رومانی افسانہ یوم محبت ہے۔ یہ ان کا واحد افسانہ ہے جو دوسرے افسانوں سے بالکل جدا ہے، جدا ان معنوں میں کہ اس کے علاوہ جو بھی افسانے ہیں وہ بھوت، پریت، جنوں اور خبیثوں سے خالی نہیں ہیں۔ تحیر واستعجاب کی ایسی ہی فضا افسانہ شگوفہ میں بھی ملتی ہے۔ یہ کشمیر کی حسین وادیوں میں پروان چڑھنے والی ایک ایسی محبت کی داستان ہے جو انتہائی پراسرار ماحول میں بیان کی گئی ہے۔ شگوفہ کا لازوال حسن، اس کا عجیب وغریب حالات کا شکار ہونا، شہر سے آئے ایک نوجوان کا اس سے والہانہ عشق، گاؤں کے لوگوں کے ذریعے شگوفہ کو ڈائن قرار دیا جانا، تہہ خانے میں نیم مردہ جسم کی جنبش، سبز آگ، عثمان بھائی کا پراسرار کردار غرض کہ ایسی ہی کتنی انتہائی پراسرار وخوفناک لیکن دلکش اور موثر تصویریں اس افسانے میں نظر آتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ علم ویقین کی دنیا سے ہٹ کر یہ ایک ایسی دنیا ہے جو قاری کو بالآخر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ اس کہانی میں منظر کشی اپنے پورے شباب پر ہے اور بیانیہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں تلقین وتربیت سے زیادہ تفریح پر زور دیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا مقصد قاری کو ایک دلچسپ مواد پیش کرنا ہے لیکن ان میں جو کردار ہیں ان کا نفسیاتی مطالعہ ایک دلچسپ اور مفید عمل ہو سکتا ہے کیونکہ ان کرداروں میں وہ مخصوص انسانی اوصاف اور جذبات و احساسات پائے جاتے ہیں جو انسانی نفسیات کے مطالعے کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح مسز عبدالقادر کے یہاں کسی واضح نقطۂ نظر یا سماجی وابستگی کی کسی مخصوص شکل کی تلاش کارآمد نہیں ثابت ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ ان افسانوں میں سماجی مسائل اور انسانوں پر ان کے اثرات کہیں کہیں نظر آتے ہیں لیکن کسی مخصوص سماجی صورت حال کا بیان نہیں ملتا ہاں خوف وتحیر اور دہشت پر مبنی ایک ایسی فضا ضرور ملتی ہے جو قاری کو آخر وقت تک اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔

■

Dr. Mohd Jabir Hamza
Flat No 243, Road No: 7, Street No: 17
Telecomnagar, Gachibowli
Hyderabad - 500032
mohdjabir786@gmail.com

ابن صفی کا ناول وبائی ہیجان اور کورونا وائرس

حمیرا عالیہ

1958 میں ابن صفی کا ایک ناول 'وبائی ہیجان' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ وبائی ہیجان میں ابن صفی نے جس مسئلے کو پیش کیا ہے وہ عالمگیر ہے۔ اس ناول کا تھیم Biological Weapon ہے۔ اس سے مراد ایسا ہتھیار ہے جس میں جراثیم اور زہریلے مادوں کا استعمال کیا جاتا ہو۔ جنگ کے اس طریقۂ کار میں بائیولوجیکل ٹوکسن، بیکٹیریا، وائرس اور فنگی جیسے انفکشنز کا استعمال انسانوں، جانوروں اور نباتات کے خاتمے کے لیے کیا جاتا ہے۔ زندگی اور موت کے اس کھیل میں بڑی طاقتیں حیاتیاتی ہتھیاروں کا استعمال بڑی بے حسی سے کرتی ہیں اور انسانیت کی تمام حدود عبور کر جاتی ہیں۔ بظاہر مہذب نظر آنے والے یہ ممالک اقتدار اور طاقت کی ہوس میں کس حد تک گر سکتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان ہتھیاروں کا نشانہ زیادہ تر افریقہ اور ایشیاء کے غریب اور پسماندہ ممالک ہوتے ہیں۔ خطرناک وائرس کے ذریعے مصنوعی وبائیں پوری پوری بستیوں میں پھیلا دی جاتی ہیں۔ اور پھر ان کے خاتمے کے لیے انجکشنز اور دوائیں بھی بھاری مقدار میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ گویا خود ہی قاتل خود ہی مسیحا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد چند بڑی طاقتوں نے اپنی تمام تر توجہ ان حیاتیاتی ہتھیاروں پر مرکوز کر دی تھی۔ کیونکہ اس کے ذریعے بڑی سے بڑی آبادی کو بغیر کسی مزاحمت کے نہایت آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی زہر دے کر دشمنوں کو ہلاک کرنے کا طریقۂ کار قدیم زمانوں سے رائج ہے۔ اب سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اس میں مزید تباہیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کی حقیقی مثالیں برڈ فلو، پولیو، بلیک ڈیتھ، ہارس پاکس، SARS2.0,MERS، ایبولا، زیکا اور تازہ ترین نوول کورونا وائرس ہیں۔

ناول 'وبائی ہیجان' میں ابن صفی نے جس جرثومے کو وبا کا ذریعہ بتایا ہے وہ بیکٹیریا ہے۔ وبا پھیلانے کے لیے پانی کو آلودہ کرنے کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ شہر کے کنوؤں اور واٹر سپلائی کے ٹینکوں میں مردہ جانوروں کو پھنکوا کر بڑی آسانی سے وبا پھیلا دی جاتی ہے اور اس کام کے لیے باقاعدہ جراثیم پیشہ افراد کو ہائر کیا جاتا ہے۔ وبا کے نتیجے میں شہر کی نصف آبادی مالیخولیاتی دوروں اور واہماتی تشنج کا شکار ہو جاتی ہے۔ راہ چلتے، زینہ چڑھتے اترتے، گھروں میں رات گئے لوگ یونہی گھبرا کر بے تحاشا نکل پڑتے اور بدحواسی کے عالم میں بسوں، کاروں اور ٹرکوں کی زد میں آکر ہلاک ہو جاتے۔ شہر میں ہنگامی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ دفتر کاروبار اور روزمرہ کی زندگی ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لاعلاج وبا کے تدارک کے لیے مختلف ممالک سے طبی مشن آنے لگتے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ ناول میں وبا پھیلنے کی وجوہات اور وائرس کے بارے میں کیپٹن حمید سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سانگلو کہتا ہے:

''وبائی امراض کے جراثیم مختلف ذرائع سے ہمارے سسٹم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یا تو وہ فضا میں

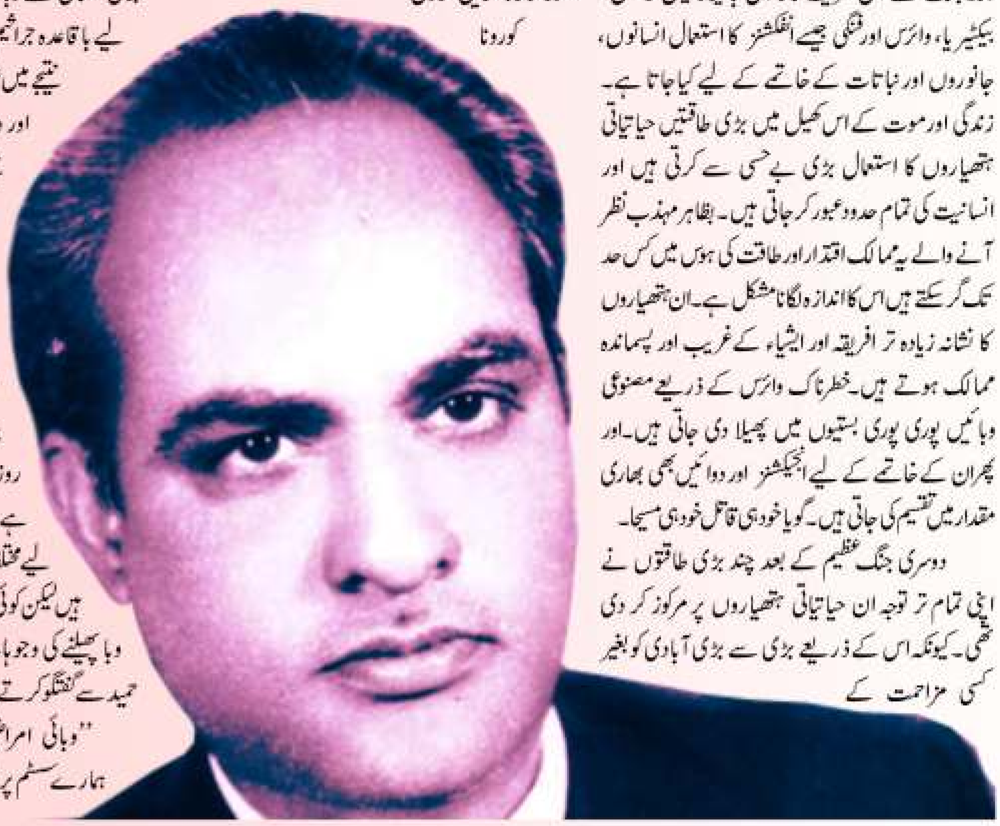

'وبائی ہیجان' در اصل انسان کے سطح انسانیت سے گرجانے کی کہانی ہے۔انسان جسے اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے جب اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو بعض اوقات جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔وہ مہذب اقوام جو خود کو امن کی محافظ قرار دیتی ہیں وہی فساد فی الارض کی اصل محرک ہیں۔ابن صفی نے جس وقت یہ ناول لکھا اس وقت شاید کسی نے اس اہم نکتے پر توجہ نہ دی ہو کیونکہ اس وقت ذرائع محدود تھے۔ سازشوں کی حقیقت سے صرف سیاسی لیڈران اور پڑھا لکھا دانشور طبقہ ہی واقف ہوتے تھے لیکن آج میڈیا کی رسائی دنیا کے ہر شخص تک ہے۔

فریدی جب اس سازش سے پردہ اٹھاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ محض ایک شخص یا گروہ کا کام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے ملک کی سازش تھی جو اپنے حریف ملک سے نپٹنے کے لیے ایشیاء کو آلہ کار بنانا چاہتا تھا۔

'وبائی ہیجان' دراصل انسان کے سطح انسانیت سے گرجانے کی کہانی ہے۔انسان جسے اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے جب اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو بعض اوقات جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔وہ مہذب اقوام جو خود کو امن کی محافظ قرار دیتی ہیں وہی فساد فی الارض کی اصل محرک ہیں۔ابن صفی نے جس وقت یہ ناول لکھا اس وقت شاید کسی نے اس اہم نکتے پر توجہ نہ دی ہو کیونکہ اس وقت ذرائع محدود تھے۔ سازشوں کی حقیقت سے صرف سیاسی لیڈران اور پڑھا لکھا دانشور طبقہ ہی واقف ہوتے تھے لیکن آج میڈیا کی رسائی دنیا کے ہر شخص تک ہے۔عوام بھی نسبتاً باشعور ہوچکی ہے۔لہذا ان بڑی طاقتوں کی رذالت سے تقریباً ہر کوئی واقف ہوچکا ہے۔ناول میں ایک موقعے پر فریدی کہتا ہے:

''دنیا کی وہ بڑی طاقتیں جو اپنے اقتدار کے لیے رسہ کشی کررہی ہیں اس سے بھی زیادہ گرسکتی ہیں۔ان کے بلند بانگ نعرے جو انسانیت کا بول بالا کرنے والے کہلاتے ہیں، کتنے زہر آلود ہیں؟ اس کا اندازہ مشکل ہے۔''

(وبائی ہیجان،ص 74)

ناول وبائی ہیجان کے تناظر میں کورونا وائرس کا جائزہ لیا جائے تو یہ شبہ کرنا جائز ہے کہ یہ ایک Man Made Disaster ہے۔کورونا وائرس کا پہلا معاملہ دسمبر 2019 میں چین کے ہوبئی صوبے کے ووہان شہر میں سامنے آیا تھا۔وبا کی علامات میں بخار کھانسی اور سانس لینے میں دقت وغیرہ ہیں جو بڑھ کر نمونیہ تک پہنچ جاتی ہیں۔یہ ایک زونوٹک یعنی جانوروں اور انسانوں کے درمیان منتقل ہونے والا وائرس ہے۔وبا سے اب تک پوری دنیا میں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار افراد کی موت ہوچکی ہے۔یہ تعداد 2003 میں چین میں ہی پھیلنے والی SARS وبا سے ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہے۔103 سے زائد ممالک میں پھیل جانے والی اس وبا کا علاج اب تک دریافت نہیں کیا جاسکا۔

اب آتے ہیں کورونا وائرس COVID-19 اور بائیولوجیکل ہتھیار کے ہائپوتھیسس کی طرف۔دنیا کے کئی سائنس دانوں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ کورونا وائرس ایک جان لیوا حیاتیاتی ہتھیار تھا جو تجربے کے مرحلے میں ناکام ہوگیا اور پھر چینی سائنس دانوں کے قابو میں نہ رہا۔

اس شبہ کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ اب جنگ کرنے کا طریقۂ کار تبدیل ہوچکا ہے۔اب کھلے میدان میں تلواروں اور تیروں سے شجاعت نہیں دکھائی جاتی بلکہ پیٹھ پیچھے مکاری سے وار کرکے دشمن کو زیر کیا جاتا ہے۔مذکورہ تمام شبہات آج سے ستر سال پہلے ابن صفی نے ناول 'وبائی ہیجان' میں صاف طور سے ظاہر کردیے تھے۔

''یہ بڑی طاقتیں اسی طرح تو ایشیاء پر سکہ جمارہی ہیں۔کہیں غلہ تقسیم ہورہا ہے، کہیں کپڑے بانٹے جارہے ہیں اور کہیں کسی وبا کا خاتمہ کرنے کے لیے مفت دوائیں بھاری مقدار میں تقسیم کی جارہی ہیں۔جہاں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں بھی ضرورت پیدا کرلی جاتی ہے۔مصنوعی قحط پیدا کیے جاتے ہیں۔مصنوعی وبائیں پوری پوری بستیوں پر دھاوا بول دیتی ہیں اور پھر یہ فرشتے آکر ہمارے آنسو بھی پونچھتے ہیں اور ہماری دعائیں بھی لے جاتے ہیں۔کتنا کمینہ ہے آدمی؟...ذرا سوچو تو وہ کیا کتوں کے ساتھ بھی باندھے جانے کے لائق ہیں۔''

(وبائی ہیجان،ص 75)

ماضی میں مختلف اقسام کے حیاتیاتی ہتھیاروں کا استعمال ہوتا چلا آرہا ہے جو نباتات اور زہریلے مادوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔بیسویں صدی سے قبل ان حیاتیاتی ہتھیاروں کے استعمال کے تین طریقے کثرت سے رائج تھے۔ زہریلے مادوں کے ذریعے غذائی اشیاء اور پانی موجود ہوتے ہیں اور ہوا کے ساتھ ہمارے جسم میں پہنچتے ہیں یا اس پانی میں ان کا وجود ہوتا ہے جسے ہم پیتے ہیں یا پھر کیڑے مکوڑوں کے ذریعے ہمارے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ہم نے سارے ذرائع چھان مارے لیکن ہمیں نئے قسم کے جراثیم کہیں بھی نہ ملے۔ایک دن میں تجربہ میں سلائڈ پر مشتبہ پانی کی چند بوندیں ڈال کر خورد بین سے ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ کسی نے مذاقاً اس پر ایک چٹکی نمک ڈال دیا۔شاید اس نے ایسا کرتے وقت ڈاکٹر گوہن پر پھبتی بھی کسی تھی لیکن کیپٹن مجھے تو خدا کی قدرت کا تماشہ نظر آگیا۔نمک کی چٹکی پڑتے ہی لاتعداد نارنجی رنگ کے ذرات سے نظر آنے لگے لیکن یہ غیر متحرک تھے...بس پھر یہیں سے ہمارے کام کا آغاز ہوا۔نمک نہ صرف ان کے لیے سم قاتل ہے بلکہ ان کی رنگت بھی تبدیل کردیتا ہے۔رنگت تبدیل ہونے سے قبل انھیں خوردبین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔یعنی آپ انھیں صرف مردہ حالت میں دیکھ سکتے ہیں، اگر یہ زندہ ہوں تو دنیا کی طاقتور ترین خوردبین سے بھی نہیں دیکھے جاسکتے۔''

(وبائی ہیجان،ص 66)

ایک دن ڈاکٹر گوہن نام کا ایک مغربی ڈاکٹر مسیحا بن کر نمودار ہوتا ہے اور علاج کے طور پر چائے کے پانی میں نمک ملا کر پینے کا نسخہ پیش کرتا ہے۔علاج کارگر ہوتا ہے اور گوہن راتوں رات مقبول ہوجاتا ہے۔بیماری کا زور ٹوٹنے لگتا ہے۔بظاہر اس ناول کا ولن سانگلو ہے جو محبِ وطن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پس منظر میں رہ کر اتنی خطرناک سازش انجام دیتا ہے لیکن ناول کا ہیرو کرنل

کومہلک بنادینا۔

Microbes نامی جرثومے اور Toxin (زہریلا مادہ) کے علاوہ مردہ جانوروں اور نباتات کو بطور ہتھیار استعمال کرنا۔

انجکشن یا ٹیکہ کے ذریعے زہر کو جسم میں منتقل کرنا (حیاتیاتی زہر)

اس تیسرے طریقۂ کار کا ذکر ناول وبائی ہیجان میں کیا گیا ہے۔

لیکن بیسویں صدی میں جدید بیکٹیریالوجیکل تکنیکوں نے مختلف اقسام کے جرثومے، انفیکشن اور وائرل فیور وغیرہ تیار کرلیے ہیں جو حیاتیاتی جنگوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن میں اینتھراکس، بروسیلا اور ریبٹ فیور اہم ہیں۔

حیاتیاتی جنگوں (Biological Warfare) کی تاریخ قدیم ہے۔ ہومر کی تاریخی رزمیہ ایلیڈ اور اوڈیسی جو کہ ٹرائے کی عظیم الشان جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے، اس میں بھی تیر اور بھالوں کو زہر میں بجھانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یونان کی پہلی Sacred War جو تقریباً 590 سال قبل مسیح لڑی گئی تھی اس میں Kirra خیرہ نامی گاؤں کی واٹر سپلائی کو زہریلے پودوں کے ذریعے آلودہ کردیا گیا تھا۔ 1710 میں روس نے سویڈن کے ساتھ جنگ میں طاعون زدہ لاشیں دشمن ملک میں پہنچادی تھیں۔ فرانس نے امریکہ سے جنگ کے دوران خسرہ کے جراثیم سے آلودہ کمبل قدیم امریکی باشندوں (ریڈ انڈین) میں تقسیم کروائے تھے۔ یہ حیاتیاتی جنگیں ہمیشہ کسی قسم کے پرانے زہر، مرض زدہ لاشوں اور جراثیم زدہ نباتات یا کیڑوں کے ذریعے متعارف کروائی جاتی ہیں۔ ویسے بھی جنگ اور وبا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موجودہ وقت میں شام اور یمن کی جنگوں میں ان حیاتیاتی ہتھیاروں کا اہم رول رہا ہے۔

مغربی ادب میں بھی حیاتیاتی جنگوں پر مبنی فکشن کی فہرست طویل ہے۔ جیک لندن کی سائنس فکشن The unparalleled Invasion(1910) میں ویسٹرن یونین کے ذریعے کیے گئے بائیولوجیکل حملے میں چین کا صفایا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایل رون ہبرڈ کا ناول 'فائنل بلیک آؤٹ' (1940)، اسٹیفن کنگ کا 'دی اسٹینڈ' (1978)، ڈین کونٹز کا 'آئیز آف ڈارک نیس' (1981)، فرینک ہربرٹ کا 'وہائٹ پلیگ' (1982)، ٹام کلانسی کا 'ایگزیکیٹو آرڈرز' (1996)، رچرڈ پریسٹن کا 'دی کوبرا ایونٹ' (1998)، رچرڈ پاور کا 'آرفیو' (2014) اور کرس رائن کا 'ہیل فائر' (2015) چند اہم ناول ہیں جن میں بیکٹیریا اور وائرس کو حیاتیاتی جنگوں کا ہتھیار بنایا گیا ہے۔

جہاں تک میری ناقص معلومات ہیں تو اردو ادب میں ابھی تک Biological Weapon کو کسی ناول کی تھیم کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ہاں طاعون جیسی قدرتی وبا کو انتظار حسین نے 'بستی' اور انیس ناگی نے ''چوہوں کی کہانی (1995) ناول میں موضوع ضرور بنایا ہے۔ لیکن یہ ایک مختلف چیز ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ادیب کا ذہن سائنس داں سے آگے چلتا ہے۔ناول وبائی ہیجان پڑھ کر ابن صفی کی عصری آگاہی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔اس وقت کورونا وائرس سے ہرطرف افراتفری اور خوف کا ماحول ہے۔دنیا بھر کے ماہرین اس وبا کا علاج ڈھونڈنے کے لیے نئی نئی تکنیکوں کا استعمال کررہے ہیں۔لیکن کسی وائرس کا ویکسین تیار کرنے میں سالوں لگ جاتے ہیں کیونکہ اس میں جانوروں پر آزمائش اور انسانوں پر طبی تجربے اور پھر منظوری کے مراحل بھی شامل ہوتے ہیں۔

'وبائی ہیجان' ناول ابن صفی کی مستقبل بینی کا ثبوت ہے۔ وہ جانتے تھے کہ آنے والے پچاس سالوں میں Biological Warfare اتنی ہی آسان بات ہوجائے گی جیسا کہ بم دھماکہ کرنا۔ یہ حیاتیاتی ہتھیار جو انتہائی سرعت کے ساتھ پوری آبادی کو ختم کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ان کے استعمال کی نت نئی وجوہات تلاش کرلی جائیں گی۔ جہاں دواؤں کی ضرورت نہیں بھی ہوتی ہے وہاں بھی خطرناک وائرس پھیلا کر ان کی ضرورت پیدا کرلی جائے گی۔ شمالی افریقہ میں پھیلنے والی ایبولا وبا اس کی تازہ مثال ہے جس نے ہزاروں افراد کی جان لے لی تھی۔

ناول میں کئی ایسے مناظر ہیں جو فی الوقت کے ووہان شہر کا حال پیش کرتے ہیں۔ پورے چین میں اس وقت خوف و ہراس کی فضا قائم ہے۔ ووہان کی رونقیں ماند پڑ گئی ہیں اور وہ ایک آسیب زدہ شہر معلوم ہونے لگا ہے۔ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک میں قرنطینہ کا نفاذ کردیا گیا ہے۔ اسکول کالج بند ہوچکے ہیں۔ شہروں میں سناٹا چھا گیا ہے۔ 'وبائی ہیجان' کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

''یہ وبا شہر کے جدید حصے میں بھی پھیلنے لگی اور پھر سڑکیں ویران ہوگئیں۔ نہ جانے کتنے حادثے ہوچکے تھے۔ لوگ چلتے چلتے گاڑیوں سے ٹکراتے اور وہ انھیں کچل کر رکھ دیتیں۔ لوگ شہر سے مضافات کی طرف بھاگنے لگے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی اندر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اساطیری عفریتوں نے کسی قدیم شہر کو تاراج کردیا ہو۔ حکومت کی ذمے دار شخصیتیں بھی شہر سے ہٹ گئی تھیں اور سارے دفاتر ہٹا دیے گئے تھے۔ اس حیرت انگیز وبا نے ساری دنیا کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ مختلف ممالک سے طبی مشن آنے لگے تھے لیکن خود ان مشنوں کے افراد بھی اس وبا کا شکار ہوگئے۔

ابھی تک حالات پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ بڑی بڑی طبی تجربہ گاہیں دن رات کھلی رہتیں۔ اس مرض کے متعلق چھان بین ہوتی لیکن اسے ختم کرنے کا کوئی مستقل ذریعہ ہاتھ نہ آتا نہ اس کے اسباب ہی سمجھ آتے۔''

(وبائی ہیجان ص 49)

کہا جاتا ہے کہ ادیب کا ذہن سائنس داں سے آگے چلتا ہے۔ ناول وبائی ہیجان پڑھ کر ابن صفی کی عصری آگاہی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اس وقت کورونا وائرس سے ہرطرف افراتفری اور خوف کا ماحول ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین اس وبا کا علاج ڈھونڈنے کے لیے نئی نئی تکنیکوں کا استعمال کررہے ہیں۔ لیکن کسی وائرس کا ویکسین تیار کرنے میں سالوں لگ جاتے ہیں کیونکہ اس میں جانوروں پر آزمائش اور انسانوں پر طبی تجربے اور پھر منظوری کے مراحل بھی شامل ہوتے ہیں۔

لازوال فکشن وہی ہوتا ہے جو ہر دور کے حالات کے مطابق اس کی نمائندگی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وبائی ہیجان میں ابن صفی نے جس حساس مسئلے کو ادبی پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، وہ مسئلہ آج بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ جس وقت قرۃ العین حیدر چار ہزار سال پرانی تاریخ لکھ رہی تھیں اس وقت ابن صفی مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کررہے تھے۔ جب منٹو اور انتظار حسین تقسیم کی شکست خوردگی کے نوحے پڑھ رہے تھے اس وقت ابن صفی دوسری عالمی جنگ کے بعد پنپنے والی سازشوں کے تئیں عوام میں شعور بیدار کررہے تھے۔ اس ناول کی قرات کے بعد قاری حالات حاضرہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جنگ کے اس مہلک طریقۂ کار کی وضاحت اور اس کے تباہ کن اثرات کا بیان ناول کی صورت میں کرکے ابن صفی نے اردو ادب میں نئی مثال قائم کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے کتنے ابن صفی ہیں جو کورونا وائرس کو فکشن کا موضوع بناتے ہیں۔

■

Humera Alia
Research Scholar, Urdu Dept
Lucknow University
Lucknow - (UP)

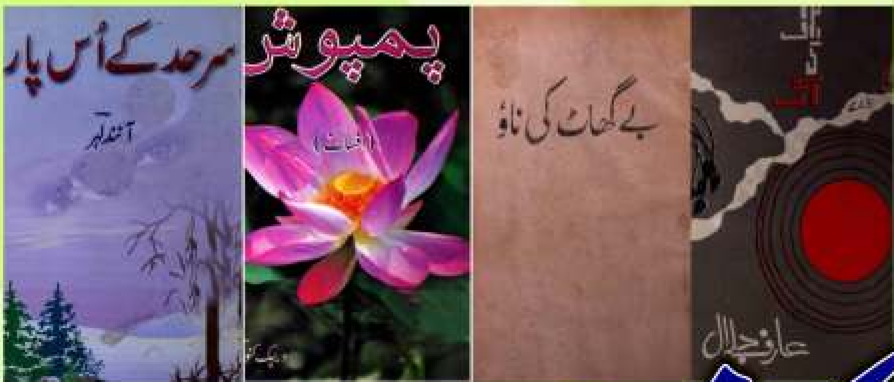

زمردہ محمد میر

جموں وکشمیر میں اردو افسانہ 2000 کے بعد

جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی ابتدا اور ارتقا پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اردو افسانہ لکھنے کی شروعات تب ہوئی تھی جب اردو میں افسانہ ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ تاریخی طور پر اگرچہ یہاں کے کئی تخلیق کاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے تاہم اس سے قبل پریم ناتھ پردیسی کا نام سامنے آتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کے اردو افسانے ہندو پاک کے کئی معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے جن کی وجہ سے ریاست میں اردو افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ در، قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، کوثر سیمابی، موہن یاور، جگدیش کنول، سوم ناتھ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے نہ صرف افسانے کے معیار کو برقرار رکھا بلکہ ریاست میں اردو افسانے کو مزید فروغ دینے اور پروان چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ نیز ان افسانہ نگاروں نے ڈوگرشاہی نظام، سماجی بے راہ روی، سرمایہ داری، معاشی بدحالی، جہالت، بھوک، افلاس، غرض ہر قسم کے اہم سماجی موضوعات ومسائل کو فنکارانہ انداز میں اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اگرچہ افسانہ نگاری کی ابتدا روایتی انداز سے ہوئی۔ تاہم رفتار زمانہ اور تخلیق کاروں کے گہرے تجربوں اور مشاہدوں کی بدولت اس میں نئے نئے تجربے بھی کیے گئے۔ اس تناظر میں اگر جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے معاصر منظر نامے پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں چند افسانہ نگار ہی اپنی انفرادیت کی بنا پر نمایاں مقام بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جن میں عمر مجید، نور شاہ، وریندر پٹواری، شبنم قیوم، وحشی سعید، شیخ بشیر احمد، آنند لہر، دیپک کنول، مشتاق مہدی، دیپک بدکی، پروفیسر منصور احمد منصور، ترنم ریاض، عبدالغنی لداخی، راجہ نذر بونیاری، غلام نبی شاہد، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر ریاض توحیدی، اشوک پٹواری، راجہ یوسف، طارق شبنم وغیرہ شامل ہیں۔

جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ریاست جموں وکشمیر کی سیاسی وسماجی صورت حال کا احاطہ اپنے اپنے انداز سے کیا ہے۔ ان میں بیشتر افسانہ نگاروں کے افسانے 2000 کے بعد سامنے آئے ہیں، جن کے مطالعے سے ایک تو جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر کا پتہ چلتا ہے اور دوسرا یہاں کے مقامی ماحول کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ کشمیر کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں سب سے پہلے نور شاہ کا نام آتا ہے۔ نور شاہ اگرچہ کئی دہائیوں سے افسانے لکھتے آئے ہیں۔ تاہم سنہ دو ہزار کے بعد بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ نور شاہ کشمیر کے ایک سینئر اور مستند افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیری عوام کی زندگی، ان کے رنج وغم اور ان کے جذبات واحساسات کو دلچسپ انداز سے رقم کیا ہے۔ نور شاہ کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف باشعور ناقدین اور قارئین کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی تخلیقی توانائی کی پرواز ہے کہ نصف صدی سے اردو افسانے کے منظر نامے پر چھائے ہوئے ہیں اور عصر حاضر تک موصوف کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ نور شاہ کی کہانیوں کے کئی روپ ہیں۔ ایک رومان اور دوسرا حقیقت۔ فنی طور پر اگرچہ دونوں کو پیش کرنے کے لیے تخلیقی صلاحیت درکار ہوتی ہے تاہم رومان کے بدلے حقیقت بیان کرنے میں مقصدیت کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایک تخلیق کار کی تخلیق میں جب سماجی حقیقت نگاری کا رنگ شامل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی سماجی ذمے داری کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اس کی تخلیق بھی سماج کی زخمی روح کی تاریخ بن جاتی ہے۔ اس تناظر میں نور شاہ کے وہ افسانے جو کشمیریوں کے دکھ درد اور کرب انگیز حالات کی فنی عکاسی کرتے ہیں۔ کسی تاریخ سے کم نہیں ہیں۔ اس کا عیاں ثبوت 'کشمیر کہانی' کے بیشتر افسانے ہیں۔ کشمیر کے تعلق سے نور شاہ کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں کہ:

''وہ بطور خاص کشمیر کی روح عصر کے موثر ترجمان ہیں اور ان کے طفیل ہی خود نور شاہ کا شمار ایک عرصے سے اردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔''

(کتاب 'یہ کیسا ہے جنون!۔ نور شاہ ص 6)

نور شاہ کے افسانوی مجموعوں میں 'بے گھاٹ کی ناؤ'، 'ویرانے کے پھول'، 'من کا آنگن'، 'گیلے پتھروں کی مہک'، 'بے ثمر سچ' اور 'کشمیر کہانی' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے چار ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ رومان اور

حقیقت کا امتزاج نور شاہ کو کشمیر کے افسانہ نگاروں میں خاص مقام عطا کرتا ہے۔ نور شاہ اپنے افسانوی فن میں یکتا نظر آتے ہیں۔ وہ زبان، پلاٹ اور دیگر افسانوی لوازمات کا اپنے افسانوں میں پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

شبنم قیوم بھی افسانہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے مختلف نشیب و فراز ملتے ہیں۔ ان کے اب تک تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں 'ایک زخم اور سہی'، 'نشانات' اور 'آزادی کی تلاش' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کئی ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ شبنم قیوم بحیثیت مزاحمتی افسانہ نگار بھی بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے حالات کی اپنے افسانوں میں خوب عکاسی کی ہے۔ شبنم قیوم نے اپنے افسانوں میں مظلوم عوام کے درد و کرب کو بڑی بے باکی سے رقم کیا ہے۔ ان کے افسانے 'آزادی کی تلاش'، 'برات جنازے کی'، 'امانت' وغیرہ انہی حالات و واقعات کی روداد بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ شبنم قیوم ایک سنجیدہ اور حساس افسانہ نگار ہیں جس کی جھلک ان کے افسانوں میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔

آنند لہر کی فکشن نگاری کا احاطہ کریں تو انھوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'انحراف 1975' میں شائع ہوا تھا اور ان کا ایک ناول 'مجھ سے کہا ہوتا' 2004 میں منظر عام پر آیا اور کافی مشہور ہوا۔ 2004 میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'سریشا نے بھی لکھا تھا' شائع ہو کر آیا اور بے حد مقبول ہوا۔ آنند لہر کے بیشتر افسانے علامتی اور تجریدی اسلوب کے حامل ہوتے ہیں۔ جن افسانوں میں تجریدیت کا گہرا رنگ ہے ان میں عدالت، سڑک رفتار، راستے کا پہاڑ وغیرہ شامل ہیں۔ آنند لہر کے کئی افسانے بغیر پلاٹ اور کردار کے ہیں۔ ان میں شعوری طور پر خواب آمیز کیفیات کو متن کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں روایتی پلاٹ کے برعکس منتشر خیالات و واقعات کو فن کے قالب میں ڈالا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانے محسوسات و تجربات اور احساسات کی گہری شعوری کیفیات کی اچھی فنی عکاسی کرتے ہیں جن کو پڑھنے کے دوران قاری پر بھی ایک مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

آنند لہر کے دوسرے افسانوی مجموعوں میں 'سرحد کے اس پار' اور 'کورٹ مارشل' شامل ہیں۔ چونکہ آنند لہر خود بھی عدلیہ کے کام کاج کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں اس لیے ان کے کئی افسانوں کی کہانیاں کوٹ کچہری کی اچھی منظر کشی کرتی ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں سیاسی چالبازیوں اور سماجی ناہمواریوں کی کہانیاں ملتی ہیں۔ لیکن یہ کہانیاں سیدھے سادے اسلوب کی حامل ہیں جن کو سمجھنے کے لیے قاری کو کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے۔

وحشی سعید معاصر فکشن نگاروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ'، 'خواب حقیقت'، 'سڑک جاری ہے'، 'آسمان میری مٹھی میں' منظر عام پر آچکے ہیں۔ وحشی سعید کے افسانوی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے مشہور افسانہ نگار دیپک بدکی لکھتے ہیں:

''ان کے کئی افسانوں کا پس منظر کشمیر ہے اور کئی جگہوں پر کشمیر کے اہم مقامات، گلی محلوں اور بود و باش کا ذکر آچکا ہے۔ (وہ ہار گیا، جوا، ترک) ان کا اثر انگیز افسانہ 'جوا' پڑھ کر مجھے اپنی گمشدہ دھرتی میں بیتا ہوا بچپن یاد آیا۔'' (جموں و کشمیر کا عصری ادب ص 119)

وحشی سعید کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو کہانیوں کا روپ دیا گیا ہے۔ مطالعے کے دوران ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار ایک تماشائی کی طرح صرف روداد پیش نہیں کرتا ہے بلکہ وہ ان حالات و واقعات کا خود ستایا ہوا نظر آتا ہے اور قاری بھی پڑھنے کے دوران جیسے اپنی ہی کہانی پڑھتا رہتا ہے۔ جیسے افسانہ 'کشکول' کی کہانی۔ اس میں ایک مجبور انسان کے مصائب کو متاثر کن انداز سے بیان کیا گیا ہے اور افسانہ نگار اس قسم کے سماج کو پتھر کی دنیا قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک افسانہ 'طلسم کلام' بھی ایک اچھا تخلیقی فن پارہ ہے۔ اس افسانے میں بدلتے ماحولیاتی نظام کے مضر اثرات کے پیش نظر انسان کی بدلتی فکر و سوچ کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ وحشی سعید کے افسانوں میں مقامی حالات و واقعات کی اچھی افسانوی منظر کشی ہوئی ہے۔

جموں و کشمیر کے جینوئن افسانہ نگاروں میں مشتاق مہدی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ ان کی پہلی کہانی 'کمینہ' 1974 میں رسالہ 'بمبئی فلم سنسار' میں شائع ہوئی تھی۔ عصر حال تک ان کے دو افسانوی مجموعے 'مٹی کے دیے' (تالیف) اور 'آنگن میں وہ' کے علاوہ تقریباً اسّی افسانے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجموعہ 'آنگن میں وہ' 2010 میں شائع ہوا ہے، جس میں اکیس کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کی قرأت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں راست بیانیہ کے ساتھ ساتھ تخلیقی بیانیہ کی کہانیاں بھی شامل ہیں اور علامتی و تجریدی اسلوب کے علاوہ حقیقت نگاری سے متشکل کہانیاں بھی موجود ہیں۔ موصوف کے افسانوں کے ساختیاتی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''ان کے افسانوں میں متکلم یا بیان کنندہ بھی ہے، واقعات بھی ہیں، فضا آفرینی بھی ہے اور افسانوی تجربہ کی نمو و ارتقا بھی ہے۔''

(آنگن میں وہ...ایک نظر، ص 5)

اس طرح مشتاق مہدی کا شمار کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں قارئین کو کشمیر کے حقیقی حالات سے روشناس کراتے ہیں۔ علامتی پیرایہ اظہار میں وہ ایسی کہانی رقم کرتے ہیں کہ قاری پر درد و غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں کا اسلوب جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ مشتاق مہدی کی کہانیاں قاری کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کشمیر کے عصری حالات کا خوبصورت اظہار ہوا ہے۔

کشمیر کے افسانہ نگاروں میں دیپک کنول کا ایک مقام ہے۔ اُردو رسائل میں اُن کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ 'برف کی آگ' کے بعد 'پمپوش' اُن کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ چودہ افسانوں کا یہ مجموعہ 2011 میں راہی کتاب گھر دہلی نے شائع کیا ہے۔ دیپک کنول کے افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف زندگی کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا ہے بلکہ اپنے مشاہدے کو تجربے کے بل پر افسانوی پیکر میں ڈھالتے ہوئے اتنی دلکش تصویریں بنائی ہیں کہ قاری کے جمالیاتی شعور میں نکھار آجاتا ہے۔ دیپک کنول افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ناول اور ڈرامہ نگار بھی ہیں ان کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ 'میرے گاؤں کا چراغ'، 'پوش مال'، 'پمپوش'، 'برف کی آگ'، 'لال پل کا دیوانہ' قابل ذکر ہیں۔ دیپک کنول کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے معروف نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر ریاض توحیدی لکھتے ہیں:

''"پمپوش" کے افسانوں کا مطالعہ زندگی کے نشیب و فراز کا مطالعہ ہے۔ چونکہ تمام افسانوں کا پس منظر کشمیر نظر آرہا ہے اس لیے مطالعے کے دوران قاری کے سامنے کشمیر کے کئی روپ سامنے آجاتے ہیں۔ رشتے، نانی خیر والی، باگی مرغا جیسے افسانوں میں کشمیر کے اُس دور کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جب کشمیر میں زندگی خوش گوار ماحول میں بسر ہو رہی تھی۔ لوگوں کے درمیان بھائی چارہ قائم تھا اور غم و خوشی میں مشترکہ شرکت ہوتی تھی۔

دوسری کہانیاں کشمیر کے اس پُر آشوب دور سے تعلق رکھتی ہیں جس نے ہر کشمیری کو اندر سے توڑ پھوڑ کر

کے چھوڑ رکھا ہے۔'فاصلے' نامی افسانے میں صاحب افسانہ نے کشمیر کی اسی اندوہ ناک صورت حال کو موضوع بناتے ہوئے اُن سیکڑوں بے بس انسانوں کے درد بھرے حالات کی منظر کشی کی ہے جو کئی دہائیوں سے اپنوں سے ملنے کے لیے ترس رہے ہیں۔"

(معاصر اردو افسانہ: تفہیم و تجزیہ جلد اول ص 248)

دیپک کنول کے افسانے سماجی و معاشرتی حقیقت نگاری کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں۔'لال کی مکھنی'، 'قصائی کی بکری'، 'پمپوش'، 'سنتا کی گوری' وغیرہ افسانے دیپک کنول کے افسانوی فن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ان کے افسانوی موضوعات بھی کمال کے ہیں۔وہ سماج سے جڑے رہ کر افسانے تخلیق کرتے ہیں۔اسی لیے ان کے افسانے قارئین کا من موہ لیتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں سماج کے متوسط افراد اور خاندانوں کو موضوع بناتے ہیں۔دیپک کنول کے افسانوں سے سماجی شعور، فطری اور تکنیکی خوبیوں اور ان کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔

کشمیر کے معاصر سینئر افسانہ نگاروں میں شیخ بشیر احمد ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔آپ کا ادبی سفر 1969 سے تا حال جاری ہے۔'بند مٹھی سے بھاگا پرندہ' کے بعد 'کلی کی بے کلی' ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس کے بیشتر افسانے ایوانِ اردو، بیباک، تحریرِ نو، عالمی سہارا، کسوٹی جدید، لفظ لفظ، نگینہ وغیرہ رسالوں میں شائع ہو کر قارئین سے داد تحسین پا چکے ہیں۔ شیخ بشیر احمد کی تخلیقی سوچ کا احاطہ کرتے ہوئے ایم رحمان (دہلی) لکھتے ہیں:

"موصوف ایک باشعور، نکتہ شناس اور بے حد حساس فنکار ہیں۔ان کے افسانے اپنے رویے سے آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا فن درشاتے ہیں جو انھیں ممتاز کرتا ہے۔کہانیوں میں دلخراش منظرنامے بھی موجود ہیں جس میں آج کا نام نہاد مہذب سماج اپنی برہنگی پر نقاب ڈالنے کی حکمت تو ضرور کرتا ہے مگر تمام تر نشانات کے ساتھ منعکس دکھائی دیتا ہے۔دراصل درد و کرب سے یادوں کی جگنوؤں سے گوندھنے کا سلیقہ بھی خوب جانتے ہیں۔"

(کلی کی بے کلی، ص 4)

شیخ بشیر احمد کے افسانے کشمیر اور عالمی منظرنامے نیز موجودہ حالات کا اچھا احاطہ کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کی زبان بھی بہت عمدہ ہوتی ہے۔شیخ بشیر کے افسانوں کا مطالعہ کرنے پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ موصوف فن افسانہ نگاری کی خوبیوں سے پوری آگہی رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کا شمار کشمیر کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

دیپک بدکی 1980 کے ابھرنے والے معروف اردو افسانہ نگار ہیں۔ان کی کہانیوں میں عصری زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ان کے اب تک سات افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'روح کا کرب'، 'ریزہ ریزہ حیات'، 'اب میں وہاں نہیں رہتا' اور 'جڑوں کی تلاش' شامل ہیں۔دیپک بدکی کشمیر کے ان معتبر کہانی کاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے نہ صرف کہانی پن کو زندہ رکھا ہے بلکہ اردو ادب کو کئی اہم کہانیاں دی ہیں۔ان کے بیشتر افسانے حقیقت پسندی کی عکاسی کرتے ہیں اور اکثر افسانے کشمیری پنڈتوں کی دردبھری کہانی سناتے ہیں۔ان کے افسانوں میں کشمیری پنڈت مہاجرین کا درد و کرب، ہجرت کی مصیبتیں اور مشکلات کا اظہار ملتا ہے۔

دیپک بدکی اپنے افسانوں میں اچھے خاصے تجربے کرتے ہیں۔وہ کرداروں کی نفسیات اور حقیقت سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں۔وہ جس طرح چاہتے ہیں اس طرح کردار سے کام لیتے ہیں۔دیپک بدکی کہانی کار اور قاری کے درمیان مضبوط رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'مخبر'، 'چنار کے پنجے'، 'گونگے سناٹے' وغیرہ افسانے دیپک بدکی کے افسانوں میں بہترین کرداری نگاری کو نمایاں کرتے ہیں۔دیپک بدکی نے کشمیر اور بیرون ریاست میں رہ رہے پنڈتوں کے مسائل اور کشمیری ماحول و فطرت کی افسانوں میں خوب عکاسی کی ہے۔

اس کے علاوہ نئی نسل کے کئی نوجوان افسانہ نگاروں کی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں جن میں نوجوان افسانہ نگار ڈاکٹر ریاض توحیدی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ریاض توحیدی کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں دو افسانوی مجموعے 'کالے پیڑوں کا جنگل' اور 'کالے دیوؤں کا سایہ' کے علاوہ فکشن تنقید پر ایک اہم تصنیف 'معاصر اردو افسانہ ... تفہیم و تجزیہ' شامل ہیں۔آخرالذکر کتاب حال ہی میں شائع ہو چکی ہے جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پزیرائی ہو رہی ہے۔ریاض توحیدی کے تنقیدی مضامین اور افسانے اپنے اسلوب اور موضوعات کی بنا پر ہر جگہ پسند کیے جاتے ہیں۔ وہ تنقید کے جدید اسالیب اور افسانوی اسلوب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے مقامی موضوعات سے لے کر عالمی منظرنامے کی دلچسپ فنی عکاسی کرتے ہیں۔ممتاز نقاد پروفیسر قدوس جاوید اس مناسبت سے لکھتے ہیں:

"ریاض توحیدی کے افسانوں میں بھی کشمیر کے عصری حالات و حقائق کا عمدہ فنی اور جمالیاتی دروبست کے ساتھ جینے کا عمل ملتا ہے۔تاہم ریاض توحیدی کی فکشن نگاری کا یہ پہلو بھی قابل ستائش ہے کہ ایک صاحب بصیرت (Visionary) افسانہ نگار اور ناقد ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں صرف مقامی موضوعات کی کہانیاں نہیں ملتی ہیں بلکہ ان کے بیشتر افسانوں کا کینوس اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ان میں عالمی سطح کے موضوعات و مسائل کو بڑی فنکاری اور دانشورانہ انداز سے موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے جس کی مثال ان کے پہلے مجموعے "کالے پیڑوں کا جنگل" اور دوسرے مجموعے 'کالے دیوؤں کا سایہ' کے بیشتر افسانوں میں ملتی ہے۔جیسے سفید ہاتھی، سفید تابوت، احتسابی جزیرہ، تیسری جنگ عظیم سے قبل، ہائی جیک وغیرہ۔یعنی ریاض توحیدی کے افسانوں میں جس طرح مقامی مسائل و موضوعات کو بڑی فنی چابکدستی سے برتا گیا ہے اسی طرح عالمی سطح کے موضوعات و مسائل پر بھی بڑی ہوشمندی سے ارتکاز کیا گیا ہے۔"

(ڈاکٹر ریاض توحیدی... مابعد جدید دور کا نمائندہ افسانہ نگار۔ کشمیر عظمیٰ)

پروفیسر قدوس جاوید کی ریاض توحیدی سے متعلق مذکورہ رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ موصوف افسانہ نگار نے کشمیر کے عصری حالات اور کشمیریوں کے سیاسی و سماجی مسائل کو اپنا افسانوی اختصاص بنایا ہوا ہے۔ان کا علامتی افسانوی اسلوب قاری کو اپنے حصار میں لیتا ہے۔'کالے پیڑوں کا سایہ'، 'کالے پیڑوں کا جنگل'، 'سفید خرگوش'، 'ڈپریشن'، 'گمشدہ قبرستان' وغیرہ افسانے ریاض توحیدی کے افسانوی فن کی بہترین مثالیں ہیں۔

کشمیر کے دیگر سربرآوردہ افسانہ نگاروں میں وریندر پٹواری کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جو وادی کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں سرفہرست ہیں۔ان کے سات افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں 'فرشتے خاموش ہیں'، 'دوسری کرن'، 'بے چین لمحوں کا سفر'، 'آواز سرگوشیوں کی'، 'ایک ادھوری کہانی' وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانے کشمیر ہی کے سیاسی و سماجی حالات کو نمایاں کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر جموں و کشمیر میں 2000 کے بعد تخلیق شدہ افسانوی ادب فنی اور موضوعاتی طور پر معیاری نظر آتا ہے اور اردو ادب کی افسانوی تاریخ میں اپنی منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہے۔

■

Zamrooda Mohd Meer
Janwara, H.No: 310, Sopore
Kashmir - 193201
Mob.:07780924885

کچھ باتیں کچھ یادیں عبدالاحد ساز کی

صدر عالم گوہر

کئی زبانیں جاننے اور تخلیقی سفر کی کئی جہات میں ہونے کی وجہ سے میرے تعلقات تخلیق کاروں کی مختلف جماعتوں سے ہیں۔ جب پچھلے دنوں میں اردو کے حوالے سے مراٹھی زبان پر تخلیق کر رہا تھا تو مراٹھی شعرا و ادبا سے دوستانہ تعلقات ہو گئے اور پھر جب میں آج کل گجراتی زبان پر تحقیق کر رہا ہوں تو گجراتی کتابوں کی مجھے ضرورت پڑی اور اسی سلسلے میں مجھے یاد آیا کہ ندا فاضلی نے گجراتی میں بھی کچھ کام کیا ہے اور ان کی کچھ کتابیں گجراتی زبان میں ہیں اور دوسری اہم بات یہ کہ ندا فاضلی کی شریک حیات مالتی جوشی بھی گجراتی ہیں اس لیے گجراتی زبان میں ان سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس لیے میں ندا فاضلی کے گھر مالتی جوشی سے ملنے گیا۔ وہاں جو کتابوں کے سلسلے میں باتیں ہوئیں تو مجھے بے ساختہ عبدالاحد ساز یاد آ گئے۔

ہوا یوں کہ میں نے جب مالتی جوشی سے ندا صاحب کی گجراتی کتابوں کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ندا صاحب کی گجراتی کتابیں تو ہیں اور ایک ان کی کتاب کا گجراتی زبان میں ترجمہ بھی ہے۔ چلیے دیکھتی ہوں پھر ہم لوگ ندا صاحب کے بیڈروم میں گئے۔ یہ بیڈروم کیا ہے ایک لائبریری ہے جس میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ وہ روم اسی طرح ہے جیسے ندا صاحب کے وقت میں تھا۔ بیڈروم، الماریاں، کمپیوٹر سب ویسے کا ویسا ہی ہے۔ صرف بیڈ کو ایک بڑے سے چادر سے ڈھک دیا گیا ہے تاکہ گرد و غبار سے محفوظ رہے۔ وہاں سے مالتی جوشی نے ندا صاحب کی معروف سوانح عمری دیواروں کے بیچ کا گجراتی زبان میں ترجمہ 'دیواروں نی بھیتر' نکالا۔ بشیر بدر اور جگر مرادآبادی بھی نکالی اور ساتھ ہی ہندی میں تماشا میرے آگے۔ پھر ہم لوگ مالتی جی کے روم میں آ گئے۔ وہاں انھوں نے گجراتی زبان کے شاعروں کی غزلوں کے مجموعے بھی دکھائے مگر بولنے لگیں کہ یہ کتابیں دوں گی نہیں۔ یہ سب کتابیں ایک ایک ہی ہیں۔ کہیں گم ہو گئیں تو پھر ملیں گی نہیں۔ کتابوں کے لینے دینے کا ایک قصہ انھوں نے سنایا کہ ندا صاحب کے انتقال کے بعد ایک بار میں بینک سے کچھ پیسہ نکالنے گئیں تو وہاں خیام صاحب مل گئے انھوں نے خیر خبر پوچھی بیٹی تحریر کو دعائیں دیں اور کہا کہ میری ایک کتاب ندا صاحب لے گئے تھے۔ صابر دت جو پرچہ نکالتے تھے 'فن اور شخصیت'، اس کا جاں نثار اختر نمبر۔ وہ کتاب مجھے جاں نثار اختر صاحب نے دی تھی۔ ندا صاحب وہ کتاب مجھے لوٹائے نہیں آپ وہ کتاب تلاش کر کے مجھے دے جائیے گا۔ میں گھر آئی وہ کتاب تلاش کی، نہیں ملی۔ اتفاق ایسا کہ جب بھی میں بینک جاتی تھی اس دن وہ بھی بینک آتے تھے کیونکہ ہمارا اور خیام صاحب کا ایک ہی بینک میں کھاتا تھا اور ہر بار وہ کتاب کا تقاضہ کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ جب بھی میں اور بیٹی تحریر بینک جاتی تھی تو تحریر کہتی، وہ دیکھو خیام صاحب ہیں پھر کتاب کا تقاضہ کریں گے اور ہم لوگ اس وجہ سے خیام صاحب سے بڑے ڈرنے لگے کہ اب وہ پھر کہیں تقاضہ کریں گے۔ ہم دونوں ماں بیٹیوں نے ندا صاحب کی پوری لائبریری کھنگال ڈالی، وہ کتاب نہیں ملی۔ شاید کوئی ندا صاحب کے یہاں سے مانگ کر لے گئے ہوں گے اور واپس نہیں کی ہوگی اور اب تو خیام صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں نے کہا ایسا ہی ایک واقعہ ڈرنے اور چھپنے چھپانے کا میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اور کتاب کے سلسلے میں ہی۔ پھر میں نے اپنی آپ بیتی ان کو سنائی۔

ہوا یوں کہ میں ساہتیہ اکادمی کے لیے ندا صاحب کی ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ شعری مجموعہ 'کھویا ہوا سا کچھ' کا اردو زبان سے میتھلی زبان میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ندا صاحب سے 'کھویا ہوا سا کچھ' مانگا۔ ندا صاحب نے کہا وہ کتاب تو میرے پاس نہیں ہے۔ ساری ختم ہو گئی۔ کہیں ملے تو لایئے میں اس کا نیا ایڈیشن شائع کرواؤں گا۔ حالانکہ جب 'کھویا ہوا سا کچھ' شائع ہو کر آئی تھی تو انھوں نے مجھے بھی دی تھی مگر میرے بھیونڈی والے مکان میں برسات میں باڑھ آنے کی وجہ سے کتاب بھیگ گئی اور اس کے شروع اور اخیر کے کچھ صفحات گل گئے۔ اب جو میرے پاس کتاب تھی وہ آدھی ادھوری تھی۔ میں نے ندا صاحب سے کہا کہ آپ ہی کوئی تدبیر سوچیے، مجھے 'کھویا ہوا سا کچھ' چاہیے۔ بہت ضروری ہے ترجمہ کرنا ہے۔ پھر ندا صاحب نے کچھ دیر سوچ کر کہا، 'آپ عبدالاحد ساز صاحب کے پاس چلے جایئے۔ میں نے ان کو 'کھویا ہوا سا کچھ' دیا تھا۔ میرا نام کہیے گا وہ دے

دیں گے۔ میں کرافیڈ مارکیٹ کے پاس چکلہ مارکیٹ میں عبدالاحد ساز صاحب کے شور روم پر پہنچا، ساز صاحب ملے۔ان سے میں نے 'کھویا ہوا سا کچھ' کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ندا صاحب نے کہا ہے کہ آپ ساز صاحب سے لے لیں۔ساز صاحب نے کہا آج تو نہیں ہے۔آپ کسی دوسرے دن فون کرکے آیئے، میں کتاب لے کر آؤں گا۔خیر ایک دن فون کرکے ان کے پاس گیا انھوں نے 'مجھے کھویا ہوا سا کچھ' دیا اور کہا کہ کام ہوجائے تو خیال سے واپس کر دیجیے گا۔ساتھ ہی انھوں نے اپنی بھی کچھ کتابیں دیں۔یہ میری عبدالاحد ساز صاحب سے باضابطہ پہلی ملاقات تھی اور بالمشافہ باتیں ہوئی تھیں۔اس سے پہلے میں ساز صاحب کو اخباروں اور رسالوں میں پڑھ چکا تھا اور ان کی نظم مجھے پسند تھی۔جو اس وقت نئی نئی تھی اور چرچے میں تھی۔اس کے ترجمے میں مجھے کافی وقت لگ گیا کیونکہ میں 'کھویا ہوا سا کچھ' کا شعری ترجمہ کر رہا تھا۔'کھویا ہوا سا کچھ' میں ایک صفحے پر نظم ہے اور دوسرے صفحے پر غزل۔یہی ترتیب ہے اس کتاب کی، پہلے ایک نظم پھر غزل۔پھر آخر میں دوہے۔اس طرح غزل کا ترجمہ اردو سے میتھلی زبان میں کرنے میں قافیہ اور ردیف تلاش کرنا اور اس کو بحر میں کرنا کافی وقت طلب کام تھا۔سو کافی وقت لگا۔

ساز صاحب اس دوران مجھے برابر ملتے رہے۔کیونکہ میں اس دوران صحافت میں زیادہ سرگرم رہا کرتا تھا۔اس وجہ سے برابر پروگراموں میں شریک ہوتا دعوت نامے آتے۔مشاعرے، سیمینار، شادی بیاہ اور غرض اسی طرح کی تقریبات میں جہاں جہاں جاتا اکثر عبدالاحد ساز صاحب سے ملاقات ہو جاتی اور ساز صاحب مجھ سے پوچھتے 'کھویا ہوا سا کچھ' کا کام ہوگیا۔ہوگیا ہو تو واپس کر دیجیے۔اس کتاب کی میری نظر میں بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس پر ندا صاحب نے کچھ لکھ کر مجھے دیا ہے۔ان کا لکھا ہوا میرے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایوارڈ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ دو لائن۔میں ہر بار ان سے یہی کہتا ابھی کام نہیں ہوا ہے کام ہوتے ہی میں وہ کتاب آپ کو واپس لوٹا دوں گا اور اس کے بعد سے تو ساز صاحب کے تقاضے کے ڈر سے میں چھپنے کی کوشش کرتا۔مگر کبھی کھانے کی میز پر تو کبھی ہاتھ دھوتے وقت ان کا سامنا ہو ہی جاتا اور وہ وہی سوال دہراتے 'کتاب کا کام ہوگیا' اور ایک دن جب کتاب کا کام ختم ہوگیا میں نے ترجمہ مکمل کر لیا اور ساہتیہ اکادمی بھیج دیا تب میں نے ساز صاحب کو فون کیا کہ کتاب کا کام ہوگیا ہے۔میں ایک دو دن میں آپ کے شوروم کی طرف آتا ہوں تو کتاب واپس کر دیتا ہوں۔

آخر ایک دن میں جب ان کے شوروم پر پہنچا تو وہ نہیں تھے۔میں نے فون کیا تو ساز صاحب بولے کاؤنٹر پر میرے اسٹاف کو دے دیجیے۔میں نے وہ کتاب ان کے کاؤنٹر پر دے دی لیکن اہم بات جس کا ذکر ساز صاحب کرتے تھے کہ وہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔میرے لیے کسی ایوارڈ سے بھی زیادہ ہے وہ دو لائن۔ میں نے دیکھا کہ ندا صاحب نے اس کتاب پر لکھا تھا۔

عبدالاحد ساز کے لیے

جنھیں معلوم نہیں کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں

ندا فاضلی

بات آئی گئی ہوگئی پھر جب ندا فاضلی صاحب کی کلیات 'شہر میں گاؤں' آئی اور ندا صاحب نے دو تین کتابیں 'شہر میں گاؤں' مجھے دی اور کہا کہ آپ ممبئی سینٹرل میں رہتے ہیں تو ادھر ہی انقلاب اور اردو ٹائمز میں۔شاہد لطیف اور ندیم صدیقی کو دے دیجیے گا۔میں نے جب انقلاب کے ایڈیٹر 'شاہد لطیف' اور اردو ٹائمز میں ندیم صدیقی کو کتابیں دیں تو ان لوگوں نے کتاب الٹ کر غور سے دیکھا اور مجھ سے پوچھا، 'ندا صاحب نے کچھ لکھ کر نہیں دیا ہے؟ کچھ لکھوا لیتے ہم لوگوں کے لیے تبرک ہوتا۔' پھر مجھے یاد آئے عبدالاحد ساز اور ان کا کہا ہوا وہ جملہ۔ندا صاحب نے اس کتاب پر مجھے کچھ لکھ کر دیا ہے۔اس کی اہمیت میرے نزدیک کسی بھی ایوارڈ سے زیادہ ہے۔

ندا صاحب نے مجھے بھی 'شہر میں گاؤں' کا ایک نسخہ دیا تھا۔میں وہ کتاب لے کر واپس ندا صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ یہ کتاب واپس لیجیے نہیں تو اس پر میرے لیے کچھ لکھ دیجیے۔پھر انھوں نے مجھے جو کتاب دی تھی اس پر لکھا۔

عبدالاحد ساز صاحب بھی ندا فاضلی سے بے تکلف تھے۔ وہ ندا صاحب کے یہاں وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے تھے۔ ندا صاحب کو جب ساز صاحب کے بیمار ہونے کی خبر ملتی تو افسوس ظاہر کرتے اور کہتے ساز صاحب بیمار چل رہے۔ اللہ کرے جلد اچھے جائیں۔ جب ندا صاحب کا انتقال ہو گیا او ر رسالہ آج کل میں میں نے ندا صاحب پر ایک مضمون لکھا تو ساز صاحب نے دوسرے شمارے میں اس مضمون سے متعلق خط لکھا اور افسوس کا اظہار کیا تھا۔

صدر عالم کے خلوص کے نام

ندا فاضلی

مجھے بڑی خوشی ہوئی اور کسی بھی شاعر یا ادیب کی کتاب کی اہمیت تب اور بڑھ جاتی ہے جب صاحب کتاب اس پر کچھ لکھ دیتا ہے۔اس کا اندازہ ہوا اور ندا صاحب اگر لکھ دیں تو اس کی اہمیت حقیقت میں ایوارڈ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

عبدالاحد ساز صاحب سے جڑی کئی باتیں ہیں جن میں سے ایک اہم بات ہے ساز صاحب کا ندا فاضلی صاحب سے بے تکلفی۔ندا فاضلی صاحب سے ملنا ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ندا صاحب ریزرو رہنے والے تھے۔ویسے تھے تو یاروں کے یار مگر ان کا یار ہونا سب کو نصیب نہیں تھا۔ندا صاحب کو سب جانتے تھے مگر ندا صاحب بہت کم لوگوں کو جانتے تھے۔اس جاننے کا مطلب گہری جان پہچان سے ہے۔میرے شہر بھیونڈی میں رفیع انصاری صاحب اکثر کہتے ہیں ندا صاحب بھیونڈی میں ایک ہی آدمی کو جانتے ہیں اور وہ ہیں صدر عالم گوہر۔

ندا صاحب سے میری بے تکلفی تھی۔ میں اکثر سنڈے کی شام اگر کام نہ ہوا تو ندا صاحب کے یہاں چلا جاتا تھا۔اور کبھی سنڈے کے علاوہ جب ان کو ضرورت کسی کتاب کی پڑتی تو فون کرتے صدر عالم مکتبہ جامعہ سے فلاں کتاب لیتے آیئے گا، میرے لیے۔کبھی بھی فون کرکے، وقت لے کر جانے والا معاملہ پیش نہ آیا۔ان کا دروازہ میرے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔اس لیے مجھے اس بات کا احساس بعد میں ہوا کہ ندا صاحب کے یہاں ہر کوئی نہیں جا سکتا، چاہے کتنا بڑا شاعر یا ادیب ہو یا کتنا بڑا سرکاری عہدے پر فائز آدمی۔میں نے کم لوگوں کو ندا صاحب کے یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا جن میں تھے۔فضیل جعفری، محمد علوی، عبدالاحد ساز یا پھر فلموں سے متعلق ڈائریکٹر، پروڈیوسر، موسیقار وغیرہ۔

عبدالاحد ساز صاحب بھی ندا فاضلی سے بے تکلف تھے۔ وہ ندا صاحب کے یہاں وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے تھے۔ ندا صاحب کو جب ساز صاحب کے بیمار ہونے کی خبر ملتی تو افسوس ظاہر کرتے اور کہتے ساز صاحب بیمار چل رہے۔ اللہ کرے جلد اچھے جائیں۔ جب ندا صاحب کا انتقال ہوگیا اور رسالہ آج کل میں میں نے ندا صاحب پر ایک مضمون لکھا تو ساز صاحب نے دوسرے شمارے میں اس مضمون سے متعلق خط لکھا اور افسوس کا اظہار کیا تھا۔

ندا فاضلی کے تعلق سے ساز صاحب نے جو واقعہ

لکھا ہے وہ ندا صاحب سے ملنے والے خاص طور سے ہر بے تکلف ملنے والے کا واقعہ ہے۔ ساز صاحب ندا صاحب سے پہلی ملاقات اور بے تکلفی کے بارے لکھتے ہیں۔

اپنے اس پسندیدہ شاعر کو اپنے ہی گھر میں دیکھ کر مجھے بڑی بے محابہ حیرت اور خوشی ہوئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے۔ اس شام انھوں نے یہ دو شعر سنائے تھے۔

میں موسموں کے جال میں جکڑا ہوا درخت
اگنے کے ساتھ ساتھ بکھرتا رہا ہوں میں
اوپر کے چہرے مہرے سے دھوکا نہ کھایئے
مجھ کو تلاش کیجئے گم ہو گیا ہوں میں

اور اپنا ایک گیت بھی جس کا مکھڑا ہے۔

جھکے ہوئے کندھوں پہ سانسوں کی گٹھری، رستوں میں نوکیلی گھاس

چند مہینوں بعد ان کا پہلا شعری مجموعہ 'لفظوں کا پل' شائع ہو گیا تھا۔ پھر کافی عرصے تک اپنی معاشی الجھنوں میں گھرا رہنے کے سبب میں ان کی ملاقات نہیں کر سکا تھا مگر بعد میں ادبی نشستوں کے بعد 'کارنر میٹنگس میں'، چائے کی میز، پھر مشاعروں اور مشاعروں کے لیے سفر کے دوران تفصیلی ملاقاتیں ہونے لگیں، جو ادھر پانچ سات برسوں میں خود ان کے گھر پر ملاقاتوں اور طویل مکالموں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ قدر و احترام کے علاوہ کچھ بے تکلفی اور ان سے لبرٹی لے کر بات کرنے کی سہولتیں بھی میسر آئیں، جو از راہ دوست نوازی و کشادہ ذہنی خود انھوں نے مہیا کیں۔ ان مکالموں میں گو کہ میرے حصے میں زیادہ تر سماعت ہی رہتی ہے، مگر میرے تجسس اور استفہام کا وہ بڑے تحمل، دیانت داری، تفکر اور لطف کے ساتھ جواب دیتے۔ ہاں اپنے مزاج کے تیکھے پن کے ساتھ بھی 'جس میں کبھی کبھی ذہانت بھری شرارت لیے میری کھینچائی کرنے کے پہلو بھی ضرور شامل ہوتے ہیں۔

(عبدالاحد ساز، اعتراف، ص، 280)

ساز صاحب کی یہ باتیں مجھ پر بھی صادق آتی ہیں۔ یہ بے تکلفی اور لبرٹی ندا صاحب سے میں نے بھی لی تھیں۔ میں بھی کبھی کبھی کھینچائی کا نشانہ بنتا تھا۔ میری کھینچائی میں کبھی کبھی ندا صاحب کی شریک حیات مالتی جوشی بھی شریک ہو جاتی تھیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ندا صاحب سے مکالمے کے دوران ملاقاتی کا زیادہ تر حصہ سماعت میں ہی گذرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ندا صاحب مقرر اچھے تھے، بولتے بہت اچھا تھے۔ ساز صاحب سے میری پہلی باضابطہ ملاقات ندا صاحب کے توسط سے ہی ہوئی تھی اور آخری ملاقات بھی ندا صاحب کے ساتھ ہی ندا صاحب کے ورسوا والے گھر پر۔

ساز صاحب جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے اور ایسا کم کم ہی ہوتا ہے کہ اچھا شاعر اچھا نثر نگار بھی ہو۔ جب میری غزلوں کا مجموعہ 'چاندنی خیالوں کی' اشاعت کے مرحلے میں تھا تو میں مسودہ لے کر ساز صاحب کے یہاں گیا اور اس پر اظہار خیال کے لیے کہا تو وہ بخوشی راضی ہو گئے اور جلد ہی انہوں نے اظہار خیال لکھ کر دے بھی دیا۔ میرے شعری مجموعے 'چاندنی خیالوں کی' کے دیباچے کے آخری پیراگراف میں انھوں نے لکھا:

'اردو غزل نے روایات کے عہد سے تا حال کئی پیرائے بدلے اور کئی پہلو اختیار کیے ہیں۔ موجودہ عصری غزل میں روایات کی شعاعوں کا انجذاب بھی ہے اور معاشرتی کرنوں کا انعکاس بھی اور فرد کے دل کے چراغ کی روشنی کا انتشار بھی ہے۔ صدر عالم گوہر کی غزلوں میں بھی یہی پرچھائیاں کہیں واضح اور کہیں دھندلی دکھائی دیتی ہیں۔ سرے دست اپنا ہی ایک شعر ان کی نذر کرنا چاہوں گا

کہہ نہ سکنا بھی بہت کچھ ہے ریاضت ہو اگر
زخم ہونٹوں کے سر عجز بیاں ہی رکھنا

عبدالاحد ساز، ممبئی

عبدالاحد ساز صاحب سے میری آخری ملاقات ندا فاضلی کے گھر پر ہی ہوئی تھی ایک شام میں ندا صاحب کے یہاں بیٹھا تھا، باتیں ہو رہی ہیں کہ عبدالاحد ساز صاحب تشریف لائے۔ پھر ہم تینوں گفتگو میں شریک ہو گئے۔ بات نکلی تو پھر دور تک گئی، ندا صاحب کا ایک طے شدہ وقت شغل کرنے کا تھا وہ وقت آ گیا۔ ندا صاحب نے اپنی بیٹی تحریر کو آواز دی، گڑیا گلاس لاؤ۔ گلاسیں آئیں قیمتی شراب آئی۔ ساز صاحب بولے میں شراب نہیں پیتا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز منگا لیجیے۔ ان کے کہنے کا مطلب تھا کوکا کولا یا کوئی کولڈ ڈرنک۔ ندا صاحب نے کہا، گڑیا رس گلا لاؤ جو میں کلکتے سے لایا ہوں۔ ندا صاحب نے کہا میں کلکتے گیا تھا تو وہاں سے رس گلا لایا ہوں۔ آپ رس گلا کھایئے۔ پھر جب ساز صاحب رس گلا کھانے لگے تو ندا صاحب نے ساز صاحب سے پوچھا، آپ کو ڈائبیٹیز ہے۔ پھر بھی آپ رس گلا کھاتے ہیں۔ کیسے؟ ساز صاحب نے کہا، 'میں انسولین لیتا ہوں۔ اس لیے سب کچھ کھاتا پیتا ہوں۔ پرہیز نہیں کرتا۔ جب شوگر کی مقدار جسم میں کم ہو جاتی ہے تو میٹھا کھانے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اگر اس وقت میٹھا نہ ملے اور کوئی بچہ میٹھا کھاتا ہو تو جی کرتا ہے اس سے چھین کر کھالوں۔ ندا صاحب نے کہا میں نے پچھلے ہفتے چیک اپ کروایا تھا۔ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے اور اس ملاقات کے بعد میں ممبئی سے باہر اپنے وطن چلا گیا تھا کہ وطن میں ہی پتہ چلا کہ ندا صاحب انتقال کر گئے جبکہ ندا صاحب بالکل تندرست دکھائی دیتے تھے۔ بظاہر کوئی بیماری یا کمزوری کے آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ہارٹ اٹیک ہوا اور ندا صاحب دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ ندا صاحب کی وفات پر ندا صاحب کو یاد کرتے ہوئے میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ 'ندا صاحب چھا جاتے تھے۔' جو رسالہ 'آج کل' میں شائع ہوا تھا۔ 'آج کل' رسالہ ساز صاحب کے یہاں بھی آتا تھا۔ ساز صاحب نے اس مضمون کو پڑھ کر اس مضمون کے تعلق سے ایک خط لکھا تھا جو 'آج کل' میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں ساز صاحب کا خط پڑھ کر مجھے اچھا لگا تھا اور ساتھ ہی ندا صاحب اور ساز صاحب کے ساتھ ہوئی وہ آخری ملاقات یاد آ گئی۔ یہ 2016 کی بات ہے اور اب 2020 میں ساز صاحب بھی دنیا کو چھوڑ گئے۔ ممبئی کے چند بڑے شاعروں کا اگر ذکر آئے گا تو ساز صاحب کا اس میں ضرور ذکر کیا جائے گا۔ ساز صاحب نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک اچھے انسان تھے۔ وہ اپنی بیماری کے باوجود اردو کی محفلوں میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔ انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بڑے بااخلاق اور اچھے شاعر کے ساتھ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین

> **ساز صاحب جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ھی اچھے نثر نگار بھی تھے اور ایسا کم کم ھی ھوتا ھے کہ اچھا شاعر اچھا نثر نگار بھی ھو۔ جب میری غزلوں کا مجموعہ 'چاندنی خیالوں کی' اشاعت کے مرحلے میں تھا تو میں مسودہ لے کر ساز صاحب کے یہاں گیا اور اس پر اظہار خیال کے لیے کہا تو وہ بخوشی راضی ھو گئے اور جلد ھی انہوں نے اظہار خیال لکھ کر دے بھی دیا۔**

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

■

Sadre Alam Gauhar
1138, New Islamabad
Nalapar, Thana
Bihwandi - 421302 (Maharashtra)

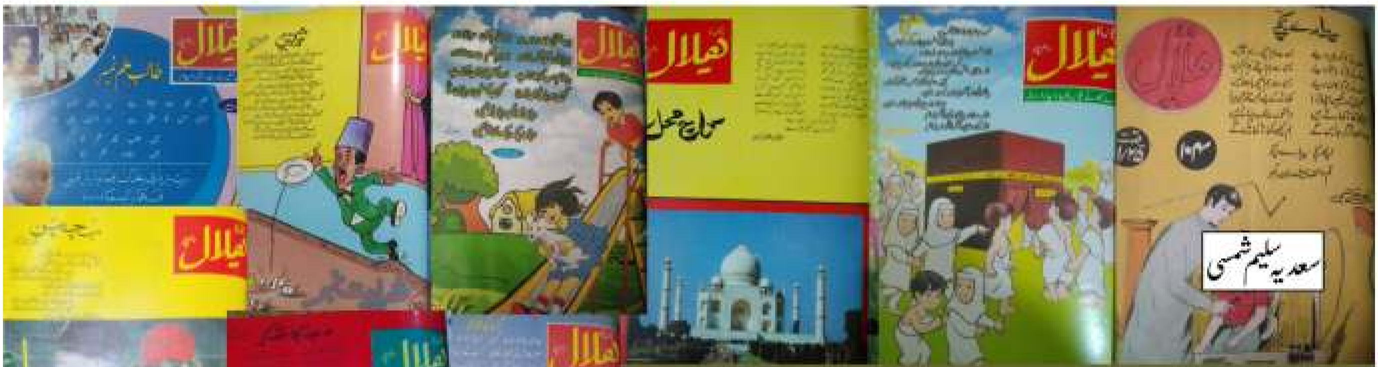

سلسلۂ صحافت

ماہنامہ ہلال رامپور

سعدیہ سلیم شمسی

ایک زمانہ تھا کہ گھر اور مکتب کی تعلیم و تربیت کے بعد نونہالوں کی دینی؛ اخلاقی اور سماجی تربیت و تعلیم کا ذریعہ 'ادب اطفال' بھی تھا۔ دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں؛ زندگی کی امنگوں؛ مستقبل کے روشن خوابوں؛ اور فرحت بخش موضوعات سے بھرپور مترنم نظمیں ادب اطفال کا وہ قیمتی سرمایہ تھیں جو کسی نہ کسی طرح جوانی سے بڑھاپے تک ہمارے ذہنوں میں اپنی بازگشت تازہ رکھتی تھیں۔ کہانیوں اور نظموں کے دور سے گزرنے کے بعد بھی ان سے ہمارا خوش گوار رشتہ قائم رہتا تھا۔ ادب اطفال کی شکل میں شعرائے کرام صالح اقدار سے بھرپور؛ عمل پیہم کا آئینہ دار؛ صحت مندانہ عوامل سے لبریز وہ مواد فراہم کرتے تھے جو ہمارے اخلاق و کردار کی تعمیر میں نادیدہ ہمدرد کا درجہ رکھتا تھا۔ ادب سے آشنا وہ بچپن اتنا نرم ولطیف اور شگفتہ ہوا کرتا تھا کہ عمر کی منزلیں طے کرتے کرتے اگرچہ ہم جوانی؛ پختہ عمری اور بڑھاپے تک پہنچ جاتے تھے لیکن 'بچپن میں لوٹ جاؤں' کی ناممکن تمنا لاشعور کے پردوں کی اوٹ سے آدھا ادھورا چہرہ کبھی نہ کبھی ضرور دکھاتی تھی۔

ادب اطفال کی صحت مندانہ روایات کا ہی اعجاز تھا کہ کتب اور رسائل کو ہمارے گھروں میں پسندیدہ رشتے داروں جیسی حیثیت واہمیت حاصل تھی۔ ابھی ہماری یادداشتیں ماضی قریب کے اس ہنگامہ خیز محبت و اشتیاق کو نہیں بھولی ہیں جو مقررہ تاریخ پر ماہانہ رسائل گھر میں آتے ہی ہر چھوٹے بڑے میں نظر آتا تھا۔ کتابیں اور رسائل ہماری زندگی کا حصہ تھے۔ سب کا شوق اور سب کے پسندیدہ۔

ادب اطفال کی بات چلتی ہے تو ذہن میں یک بہ یک کئی نام ابھرتے ہیں؛ ماہنامہ کھلونا؛ جنت کا پھول؛ ماہنامہ امنگ، ماہنامہ گل بوٹے اور ماہنامہ بچوں کا ہلال وغیرہ۔

رامپوراتر پردیش سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'بچوں کا ہلال 'ادب اطفال میں استقامت اور بلند قامتی کی علامت بن چکا ہے ۔ادارہ الحسنات رامپور سے شائع ہونے والا یہ ماہنامہ مئی 1973 میں جاری کیا گیا تھا اور اس کے بانی ومدیر اپنے وقت کے مایہ ناز عالم وفاضل اور تحریکی شخصیت مولانا ابوسلیم محمد عبدالحیٔ تھے۔

مولانا ابوسلیم محمد عبدالحیٔ کی علمی وادبی بالخصوص دینی کتب کسی تعارف کی محتاج نہیں' ایک سو سے زائد گراں قدر کتابوں کے مصنف مولانا محمد عبدالحیٔ نے تحریکی انداز میں ادارہ الحسنات کا قیام کر کے 1947 میں سب سے پہلے باشعور وبالغ نظر طبقے کے لیے ماہنامہ الحسنات کی اشاعت شروع کی، اس کے بعد نوعمروں کے لیے ماہنامہ نور، پھر خواتین کے لیے ماہنامہ بتول اور مئی 1973 میں پندرہ سال سے کم عمر کے نونہالوں کے لیے ماہنامہ بچوں کا ہلال کا اجرا کیا۔ ان تمام رسائل کی اشاعت کا بنیادی مقصد صالح فکر ونظر کا فروغ بھی تھا اور ہر عمر کے لوگوں کی اخلاقی اور سماجی تربیت بھی۔

ماہنامہ بچوں کا ہلال، رامپور سے شائع ہونے والا ادب اطفال کا ترجمان تھا اگرچہ رامپور میں صحافت کا آغاز ریاست کے ساتویں والیِ رامپور نواب کلب علی خاں کے زمانے میں ہفت روزہ اخبار دبدبہ سکندری سے ہوا تھا، اس کے بعد زمانہ بہ زمانہ مختلف ادبی واصلاحی اور دینی رسائل آزادیٔ ہند سے قبل اور اس کے بعد بھی مستقل شائع ہوتے رہے لیکن ادب اطفال کے حوالے سے ملک گیر پیمانے پر ماہنامہ بچوں کا ہلال کو ہی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بچوں کے لیے رامپور سے شائع ہونے والے رسائل میں باعتبار ترتیب اشاعت 'ہلال' کا نمبر تیسرا تھا اس سے قبل ماہنامہ 'کلیاں' اور 'جنت کا پھول' بھی شائع ہوتے تھے البتہ ہر دو رسائل کا دائرۂ قارئین وسیع نہ ہونے کے سبب شہرت محدود تھی اور عرصۂ اشاعت بھی۔

ماہنامہ بچوں کا ہلال کا پہلا شمارہ مئی 1973 میں

مولانا عبدالحئی صاحب کی تربیت کا ہی اعجاز تھا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کہ ماہنامہ ہلال سے وابستگی کے کچھ عرصہ بعد ہی مرتضیٰ ساحل تسلیمی مدیر کی حیثیت سے ماہنامہ ہلال کے لیے کام کرنے لگی اور رفتہ رفتہ اُنھی کے زیر ادارت ونگرانی رسالہ بھی شائع ہونے لگا، ہرماہ سرورق پر اُن کی دل کش موضوعاتی منظومات کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ان منظومات کو قارئین بالخصوص بچوں میں انتہائی مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی جس سے رسالہ کی تعداد اشاعت بھی بڑھنا شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی ہلال کے لیے لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا اور ماہنامہ ہلال ہندوستان کے مختلف شہروں میں مقبولیت کی نئی بلندیوں کو چھونے لگا۔

شائع ہوا اور خوش رنگ ٹائٹل سے آراستہ اس شمارے کے سرورق پر موسس وبانی ومدیر مولانا ابوسلیم محمد عبدالحئیؒ کی ایک آزاد نظم بھی شائع ہوئی تھی۔ پہلے شمارے سے ہی قارئین کے حلقوں میں اس کو پذیرائی حاصل ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مولانا محمد عبدالحئیؒ کی علمی وقلمی مصروفیات کا دائرہ چونکہ زیادہ وسیع تھا اور رسائل کی تیاری کے ساتھ ان کو تصنیف وتالیف کا کام بھی کرنا ہوتا تھا اسی لیے ان کے زیرِ تربیت شاگرد اور معاونین بھی رسائل کی دیکھ ریکھ اور ترتیب میں معاونت کرتے تھے ایسے ہی معاونین میں مستفیض عنصر اور مرتضیٰ ساحل تسلیمی کے اسماء بھی شامل ہیں، ہر دو اصحاب اہل قلم بھی تھے اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک بھی' اکثر ان دونوں کی منظوم ومنثور تحریریں ہلال کی زینت ہوتی تھیں۔ ہلال کے سرورق پر اکثر منظومات بھی شائع ہوتی تھیں لیکن شروع میں ہر ماہ اس کا اہتمام نہیں ہوتا تھا۔

مولانا عبدالحئیؒ صاحب کی تربیت کا ہی اعجاز تھا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کہ ماہنامہ ہلال سے وابستگی کے کچھ عرصہ بعد ہی مرتضیٰ ساحل تسلیمی مدیر کی حیثیت سے ماہنامہ ہلال کے لیے کام کرنے لگی اور رفتہ رفتہ اُنھی کے زیر ادارت ونگرانی رسالہ بھی شائع ہونے لگا، ہرماہ سرورق پر اُن کی دل کش موضوعاتی منظومات کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ان منظومات کو قارئین بالخصوص بچوں میں انتہائی مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی جس سے رسالہ کی تعداد اشاعت بھی بڑھنا شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی ہلال کے لیے لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا اور ماہنامہ ہلال ہندوستان کے مختلف شہروں میں مقبولیت کی نئی بلندیوں کو چھونے لگا۔

1993 سے اس کے مدیر عبدالباری وسیم رہے ہیں جو مولانا ابوسلیم محمد عبدالحئیؒ کے فرزندِ اکبر عبدالملک سلیم مرحوم کے فرزندِ ثانی ہیں۔ عبدالباری وسیم صاحب چونکہ خود بھی اپنے دادا کی صحبت سے فیضیاب سے رہے ہیں اس لئے ان کا ذہن بھی صالح فکر ونظر سے آراستہ ہے۔ عبدالباری وسیم صاحب کے زمانۂ ادارت میں ماہنامہ ہلال کو مقبولیت وشہرت کی وہ بلندیاں حاصل ہوئیں جو کسی بھی رسالے کے لیے اعزاز کا باعث ہوتی ہیں۔ نثر ونظم کے بہترین انتخاب وترتیب کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے قارئین سے رابطہ کے کئی کالموں کا اضافہ کیا، ساتھ ہی بچوں کی توجہ اور دلچسپی کو مزید فروزاں کرنے کے لیے مقابلہ جاتی نوعیت کے معلوماتی، دینی اور ادبی سلسلے شروع کیے، عبدالباری وسیم صاحب نے بچوں میں سنجیدہ غور وفکر اور تقریر وتحریر کے فروغ کے لیے بھی مخلصانہ عملی کاوشیں کیں جس سے کئی نونہال اعتماد کے ساتھ نثر ونظم لکھنے لگے۔ اس کے علاوہ عبدالباری وسیم نے کارآمد انٹرویوز کا کالم بنام 'ایک ملاقات' کا آغاز کیا جس میں ہر ماہ کسی مشہور مذہبی، سماجی یا ادبی شخصیت سے سوال جواب کا سلسلہ ہوتا تھا اور قارئین میں اس کو انتہائی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کے قارئین کی کثیر تعداد ماہنامہ ہلال سے وابستہ ہوئی اور عالم یہ تھا کہ رسالہ شائع ہوکر آنے کے بعد بک اسٹالس پر پہنچتا اور آن کی آن میں سو پچاس کاپیاں فروخت ہوجاتی تھیں۔ عبدالباری وسیم کے زمانۂ ادارت میں بھی مرتضیٰ ساحل تسلیمی مدیرِ اعزازی کی حیثیت رکھتے تھے نیز ان کے مخلصانہ مشورے رسالہ کی ترتیب واشاعت میں معاون ہوتے تھے۔ سرورق پر ہنوز ساحل صاحب کی منظومات ہر ماہ شائع ہوتی تھیں البتہ کبھی کبھی وقتی ضرورت کے تحت کسی دوسرے شاعر یا ہلال کے کسی باصلاحیت نونہال قاری کی نظم کو بھی برائے حوصلہ افزائی سرورق کی زینت بنایا جاتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تسلسل کے ساتھ صرف مرتضیٰ ساحل تسلیمی کی نظم ہر ماہ سرورق پر شائع ہوتی تھی اور سرورق پر موضوعاتی نظم کا یہ تسلسل ہلال کا امتیاز بھی تھا اور انفرادیت بھی۔ عرصہ تک عبدالباری وسیم تن تنہا حسنِ انتظام وترتیب کے ساتھ ہلال کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے بعد میں ان کی اہلیہ سنبلہ کوکب صالحاتی بھی ان کی معاونت کرنے لگیں۔

ماہنامہ بچوں کا ہلال کے بانی مولانا محمد عبدالحئیؒ کے زمانے سے ہی اہلِ قلم حضرات کی جماعت اس سے وابستہ تھی نیز ایسے نوآموزوں کی بھی وابستگی رہی جو بعد میں نامور اہلِ قلم ہوئے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد عبدالحئیؒ نے نہ صرف اپنے زیرِ تربیت اہلِ قلم کا ایک مضبوط گروپ تیار کیا بلکہ ان میں ایسا اعتماد بھی پیدا کیا کہ بعد میں مذکورہ افراد نے خود بھی کئی اہم اور مشہور رسائل خود بھی شائع کرنا شروع کیے۔ ہلال کے لیے لکھنے والے مشہور اہلِ قلم میں مولانا محمد عبدالحئیؒ اور مرتضیٰ ساحل تسلیمی کے علاوہ، سید مستفیض عنصر، مائل خیر آبادی، ابوالمجاہد زاہد، مجاہد لکھیم پوری، خالد فوزان، بشریٰ مہر، اجمل خاں نجمی بگراسوی، حیدر بیابانی، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، سعید ریاض، سعید فرحت، تبسم نشاط، ایس فضیلت، رضاء الرحمن عاکف سنبھلی، قانتہ ارم اور عبداللہ خالد کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں شعراوادبا مستقل طور سے شامل تھے۔

یوں تو قارئین بالخصوص بچوں کے لیے 'ماہنامہ بچوں کا ہلال' کے بھی شمارے پرکشش ہوتے تھے لیکن ہر سال شائع ہونے والے خصوصی نمبر کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ خصوصی نمبر کی اشاعت عموماً ہر سال کے آغاز ماہ جنوری یا فروری میں ہوتی تھی لیکن اکثر اسٹاف کی مصروفیات یا دیگر امور کے سبب خصوصی نمبر اکتوبر، نومبر اور دسمبر میں بھی شائع کیے گئے۔ بہرحال ان نمبروں کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کثیر تعداد میں اشاعت کے باوجود ان کی کوئی اضافی کاپی باقی نہیں رہتی تھی بلکہ اکثر بعد میں فرمائش کرنے والے قارئین سے 'آوٹ آف اسٹاک' ہونے کی اطلاع دے کر معذرت کرلی جاتی تھی۔ ہلال کے یہ نمبر مختلف موضوعات پر شائع کیے جاتے تھے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ مجوزہ موضوعات بچوں کی دلچسپی سے متعلق ہوں، اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ خصوصی نمبر کے موضوع اور مواد کے تعلق سے ہلال کے مختلف شماروں میں ایڈیٹوریل یا اطلاع کے ذریعہ قارئین سے رائے طلب کی جاتی تھی۔ ہلال کے جن خصوصی نمبروں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ابا جان نمبر، ماں نمبر، نئے قلم کار نمبر، کہانی نمبر، شرارت نمبر، عید نمبر، طالب علم نمبر، بھائی بھائی نمبر، سچائی اور ایمانداری نمبر، دوستی نمبر، پچائی نمبر، عزائم نمبر، محنت نمبر، دوست اور دوستی نمبر، گدگدی نمبر، استاد نمبر، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اکثر خصوصی نمبر کے لیے

اہلِ قلم کی جانب سے اس قدر مواد بھی حاصل ہو جاتا تھا کہ بعض خصوصی نمبر سال میں دو بار اول اور دوم شکلوں میں شائع کیے گئے۔

ہلال کا خصوصی شمارہ 'عید نمبر' مارچ 1995 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مستقل کالمس کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے 'کلیم چغتائی، مناظر عاشق ہرگانوی، شکیل انوار صدیقی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی اور اشفاق میر کی کہانیاں نیز تنویر پھول، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، عزیز مرادآبادی اور محمد امان خاں دل وغیرہ کی منظومات شامل تھیں۔ یہ نمبر قارئین میں بہت مقبول ہوا۔ مئی 1996 میں 'کہانی نمبر' کی اشاعت کی گئی جس کو بے حد پسند کیا گیا۔ اس نمبر میں ضمیر درویش، محمد عادل اسیر، مجاہد لکھیم پوری، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، شکیل انوار صدیقی اور عبداللہ خالد کی منظوم و منثور تخلیقات شامل تھیں۔ مذکورہ نمبروں کی مقبولیت کے بعد فروری 1997 میں ہلال کا خصوصی شمارہ 'شرارت نمبر' کے عنوان سے شائع کیا گیا جس میں امین حزیں، بنت الاسلام، کوثر اعظمی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، مجاہد لکھیم پوری، شکیل انوار صدیقی 'بشریٰ مہر، رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی، حیدر بیابانی، مہر الحق تابش وغیرہ کی منظوم و منثور تخلیقات شامل تھیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تقریباً دس سال کے عرصہ بعد قارئین کی فرمائش پر ہلال کا 'شرارت نمبر2' بھی شائع کیا گیا جس کو گزشتہ نمبر سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہلال کا ایک اور خاص نمبر جس کو قارئین کے حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا 'پتائی نمبر' بھی تھا۔ 'پتائی نمبر' کی اشاعت فروری 1998 میں ہوئی اور اس شمارے میں 'ابن انشا' محشر بدایونی، شوکت تھانوی، فنا پرتاپ گڑھی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، سرمد صہبائی، اشفاق طائر، شکیل انوار صدیقی، لطیف فاروقی، انور افسری، محمد یونس سرور، فخر الدین فخر، محمد شفیع سیتاپوری، محمد اجمل خاں نجمی بگراسوی، حیدر بیابانی، مہر الحق، بشریٰ مہر' وغیرہ کی منظوم و منثور تخلیقات شائع ہوئی تھیں۔

دنیا کی عظیم الشان ہستی ماں پر ہلال کا خصوصی شمارہ 'ماں نمبر' فروری 2000 میں شائع ہوا تھا، یہ نمبر اپنے موضوع کے اعتبار سے قارئین میں کافی مقبول ہوا، اس شمارے میں اکثر متقدر و مشہور اہلِ قلم کی کہانیاں، مضامین اور منظومات کو شامل کیا گیا تھا۔ ماں نمبر کی اشاعت کے بعد ہلال کے اکثر قارئین کی فرمائش تھی کہ 'ابا جان نمبر' بھی شائع کیا جائے اسی کے پیشِ نظر فروری 2001 میں ابا جان نمبر شائع کیا گیا جس کو ماں نمبر کی طرح غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ابا جان نمبر میں اداریہ، اور دیگر مستقل کالمس 'بچوں کی دعا' ایک ملاقات از عبداللہ خالد، ننھے منے قلم کار، ہنسنا منع ہے (لطائف) اور بچوں نے خط لکھا (خطوط کا کالم)' کے علاوہ مرتضیٰ ساحل تسلیمی، حشمت کمال پاشا، پریمی کلکتہ، حیدر بیابانی اور بشریٰ مہر کی موضوعاتی منظومات شائع ہوئی تھیں اور مولانا ابو سلیم محمد عبدالحیٔ، محمد اجمل خاں نجمی بگراسوی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، مرزا شعیب، محمد نادر کھوکھ، عارفہ خانم صالحاتی، ذکیہ سلطانہ صالحاتی اور عبداللہ خالد کے مضامین اور کہانیاں بھی اس خاص نمبر میں شامل تھے۔ 124 صفحات پر مشتمل یہ شمارہ قارئین کے حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔

ہلال کا 'استاد نمبر' بھی کافی پسند کیا گیا جس کی اشاعت جنوری 2003 میں ہوئی تھی۔ اس شمارے میں معاونِ ترتیب کی حیثیت سے عبداللہ خالد کا نام بھی درج تھا۔ استاد نمبر کے اداریہ میں ہلال کے ایڈیٹر عبدالباری وسیم کی یہ بیش قیمت سطور بھی شامل تھیں:

''اہلِ علم و ہنر جب جب بھی اپنے مرتبے پر نگاہ کرتے ہیں۔ اپنی شہرت، علمیت، قدر و منزلت اور سماج میں اپنی عزت کا خیال کرتے ہیں تو بے ساختہ ذہنوں میں مدتوں قبل کے اُن اساتذہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنھوں نے بدتہذیبی کو تہذیب کے سانچے میں ڈھالا تھا، وحشت کو انسانیت کی راہ دکھائی تھی' لاعلمی کے سادہ اوراق پر علم کی روشنائی سے مقصدِ حیات کے اسباق لکھے تھے..... اساتذہ نہ صرف میرے اور آپ کے بلکہ تمام دنیا کے محسن ہیں۔ اساتذہ نہ ہوں تو سماج بدتہذیبی کے اندھیروں میں غرق ہو جائے۔'' (اداریہ، ص7)

اس نمبر میں ماہ بہ ماہ شائع ہونے والے مستقل کالمس کے علاوہ سید امتیاز علی تاج، مرزا ادیب، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، شکیل انوار صدیقی، محمد رفیع الدین مجاہد، سعید ریاض، ڈاکٹر شاہدہ شعیب، عارفہ خانم صالحاتی، حنا جلال فلاحی، شائستہ اعظمی اور عفیرہ سلیم کے مضامین اور کہانیاں تھیں۔ حصۂ نظم میں مرتضیٰ ساحل تسلیمی، شوکت علی مسعود، مجاہد لکھیم پوری، وکیل نجیب، حیدر بیابانی، بشریٰ مہر، پریمی کلکتہ، حیرت بستوی اور عبداللہ خالد کی منظومات شامل تھیں۔

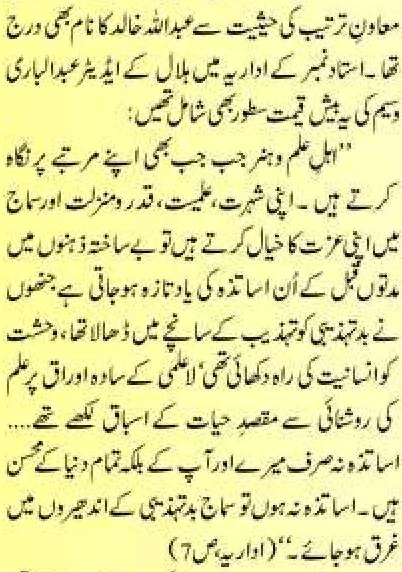

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہلال کے مذکورہ بالا 'خصوصی نمبر' دو اہم مقاصد کے پیش نظر شائع کیے جاتے تھے، اول یہ کہ ہلال کے قارئین بالخصوص نوعمر قارئین اور طلبہ وطالبات کا رسالہ سے انسلاک اور پسندیدگی و دلچسپی کا رشتہ قائم رہے اور دوئم یہ کہ ان نمبروں میں شامل مواد کے ذریعہ نوعمر قارئین کی اخلاقی تربیت اور ذہن سازی بھی کی جاسکے۔

ماہنامہ ہلال کا یہ حسن و اعجاز بھی تھا کہ تمام کہانیاں، منظومات اور دیگر مضامین کے ساتھ اسکیچ تصاویر بھی شائع کی جاتی تھیں تاکہ بچوں کو اس میں مزید دلچسپی پیدا ہوسکے۔ اس حوالے سے کئی مشہور پروفیشنل آرٹسٹ اس رسالے سے وابستہ رہے جن میں ماسٹر سید اعجاز علی، الیس فضیلات اور شکیل انوار صدیقی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ شکیل انوار صدیقی کی شہرت کا دائرہ مذکورہ دو اصحاب کے مقابلے زیادہ وسیع بھی ہے اور ہلال کے لیے ان کا وقفۂ عمل بھی زیادہ رہا بلکہ خصوصی طور سے ان کے تخلیق کردہ کارٹونی کرداروں پر ہر ماہ ایک مختصر کامک بھی شائع ہوتا تھا جس کو بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ ان مایہ ناز و مشہور آرٹسٹوں کے علاوہ کچھ عرصہ عالیہ بی نام کی مقامی نوعمر آرٹسٹ نے بھی ہلال کے لیے اپنی ہنرمندی کے جوہر دکھائے جو کافی پسند کیے گئے۔

آج ماہنامہ بچوں کا ہلال نصف صدی سے کچھ ہی کم عرصے کی مسافت طے کر کے اعتبار و افتخار کی اُن منزلوں میں داخل ہو چکا ہے جو کسی بھی رسالے کے لیے ادبی تاریخ کا حصہ بن جانے کو کافی ہے۔

امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ جب جب ادبی تاریخ رقم ہوگی اور ادبِ اطفال کے حوالے سے کچھ تحریر کیا جائے گا تو آئندہ وقتوں کے محققین ماہنامہ بچوں کا ہلال کا تذکرہ بھی نمایاں طور پر کریں گے۔

■

Sadia Saleem Shamsi
Department of Urdu
St. John's College
Agra (UP)
Mob.:9557757805

نیر سلطانپوری کا شعری اسلوب

محمد یٰسین

نیر صاحب کا اصل نام سید توکل حسین ہے، نیر آپ تخلص کی شکل میں استعمال کرتے تھے اور اسی نام سے یاد کیے گئے۔ آپ جس گھر میں پیدا ہوئے وہ ایک باوقار اور شریف تعلیم وتعلم سے مزین گھرانا تھا۔ آپ کی پیدائش 1908 میں قصبہ ایسولی تحصیل مسافر خانہ ضلع سلطانپور میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والدین کی نگرانی میں گھر پر ہی مکمل ہوئی اور وہیں پرائمری اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج کا رخ کیا اور شہر کے مشہور گورنمنٹ انٹر کالج سلطانپور سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد فیض آباد تشریف لے گئے اور گورمنٹ کالج فیض آباد سے گریجویشن نیز پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد جلد ہی جی آئی سی میں معلمی اختیار کر لی۔ لیکن ان کے پڑھنے لکھنے کا شوق پروان چڑھتا رہا۔ لکھنؤ سے ادبی مراسم رکھتے ہوئے ٹیچر ٹریننگ بھی لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدھوسودن ودیالیہ انٹر کالج میں بحیثیت اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ دوران ملازمت بھی اپنی ڈگریوں میں اضافہ کرتے رہے اور سیاسیات اور اردو میں ایم اے کیا۔ ایک مودب طالب علم کی طرح ہمیشہ اپنے اساتذہ کا احترام و ادب کرتے رہے چاہے وہ انگلش کے ہوں یا عربی کے اور جب خود استاد ہوئے تو اس میں بھی ثابت قدمی کے ساتھ زندگی گزاری۔ پہننے اور اوڑھنے میں بہت منفرد تھے۔ شمیم حنفی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''نیر صاحب اور پنڈت داتا دین تو یوں بھی اپنی خوش لباسی اور نفاست پسندی کے لحاظ سے اسکول بھر میں ممتاز تھے۔ دونوں سر سے پیر تک سفید پوش، بہت متین اور اسکول کے نظام اور روزمرہ کے معاملات میں گہرا عمل دخل رکھنے والے۔ ہر طالب علم چاہے کسی مضمون کا ہو، ان دونوں سے ڈرتا تھا۔''

(میرا پہلا اسکول: شمیم حنفی، مشمولہ نیا دور، اکتوبر 2019)

نیر صاحب کی شخصیت، شکل وصورت اور رہائش گاہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی رقمطراز ہیں:

''ان کی سنجیدہ نورانی صورت آج بھی آنکھوں میں پھرتی ہے۔ لکھنؤ ناکے چوراہے سے ذرا آگے بادی کمپاؤنڈ میں انھوں نے ایک سادہ مگر کشادہ مکان بنوا لیا تھا۔ سفید کرتے پاجامے اور کسی خاص تقریب میں شریک ہونا ہو تو اسی کے ساتھ ساتھ سفید شیروانی میں ملبوس، دھیمے متوازن قدموں سے چلتے ہوئے وہ اپنے نیم خاموش شہر میں بھی دوسروں سے زیادہ خاموش، پرسکون اور ممتاز نظر آتے تھے۔ ایک عجیب انوکھی شریفانہ وضع کے ساتھ انھوں نے زندگی گزار دی۔ اب تو اس بستی کا حلیہ بھی بہت بدل گیا ہے۔ مگر سلاطین شرقی کی یادگار وہی بستی نیر صاحب کے اٹھتے ہی ادھوری سی ہو گئی تھی۔ آج بھی ادھوری ہے۔ اب نہ وہ دور ہے، نہ وہ بستی اور نہ وہ لوگ۔'' (ایضاً)

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نیر صاحب کتنے نفاست پسند تھے اور ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی موجودگی اس شہر کے لیے باعث فخر تھی۔ یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ نیر صاحب کی وجہ سے شہر سلطانپور کو ایک نئی پہچان ملی۔ یہ اور بات ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ ان کی شاعری نے شہر سلطان پور اور اردو شاعری کو کامیابی کی منزل کی طرف قدم بڑھانے میں مدد کی۔

پلکوں سے اٹھانے کے ہیں یہ ریزۂ مینا
ٹوٹے ہوئے شیشوں سے ابھی کام بہت ہے

نیر صاحب کو تاحیات یہ شکایت رہی کہ ان کی شاعری اور ان کو جتنا سراہا جانا تھا نہیں سراہا گیا۔ البتہ ان کو یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں تو فنا ہو جاؤں گا لیکن میری کہی ہوئی ہر بات اردو شاعری کی شکل میں ہمیشہ اپنی موجودگی درج کراتی رہے گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

نیر میں جب کہ خوگرِ راحت نہیں رہا
مجھ کو تلاش کرتی ہے منزل جگہ جگہ
زندگی آج بھی ہے تشنۂ تعبیر ہنوز
چشم بیدار نے کیا خواب پریشاں بخشا

نیر سلطانپوری کے اندر شاعری کی صلاحیت بخوبی تھی۔ بڑی چابک دستی سے اپنی بات کو مصرعوں میں پرو دیتے تھے۔ ان کی یہ صلاحیت خداداد تھی انھوں نے اردو شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ باوجود اس کے کمسنی میں ہی بہت عمدہ نظمیں لکھنے لگے تھے۔ جن کو پڑھ کر ان کے فطری ذوق وشوق، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی اور بہترین اسلوب کا پتا چلتا ہے۔ جس دور میں انھوں نے شاعری شروع کی وہ زمانہ نظموں کا تھا۔ جوش ملیح آبادی پورے جوش وخروش کے ساتھ اردو نظم نگاری میں اپنی دھاک

نیر سلطانپوری نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے ۔ نظموں سے ابتدا کی کیونکہ اس دور میں نظم نگاری کا بول بالا تھا ۔ نظموں کے علاوہ قصیدہ ، غزل ، قطعہ، نعت ، منقبت ہر صنف میں انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ عشق رسول میں ڈوب کر نعت کے جو اشعار کہے ہیں وہ قابل داد ہیں ۔

جما چکے تھے۔ نیر بھی ان سے متاثر تھے جس کی تائید یں خود نیر صاحب کا قول ہے کہ:

''شعر وشاعری تو خدا داد چیز ہے جس کو خدا نے نواز دیا وہی اس دولت سے مالا مال ہوگیا۔ یہی حال ہر علم اور زندگی کی خوبی کا ہے ۔لوگوں کو میری کمسنی پر بڑی حیرت ہوتی تھی اور چونکہ اس زمانے میں جوش ملیح آبادی کا دور تھا نظموں کا زمانہ تھا اس لیے میری شاعری کا آغاز نظموں سے ہوا۔''

نیر سلطانپوری کو عربی وفارسی میں مہارت حاصل تھی جس سے ان کو اردو اشعار کہنے میں بہت مدد ملتی تھی ، وہ اکثر اپنے کلام کو علامہ صفی لکھنوی اور آرزو لکھنوی کو سناتے تھے وہ لوگ کلام سن کر داد دیتے اور حوصلہ افزائی کرتے ۔نیر صاحب بغیر کسی کی اتباع کیے اشعار کہتے تھے۔ وہ دیگر شعرا سے متاثر ضرور تھے لیکن ان کے اشعار میں کسی کا اثر بہت کم یا نا کے برابر ہے۔

آئی غنچوں میں کہاں سے یہ ادائے دلبری
اس چمن سے کون گزرا تھا حسیں پہلے پہل
مدتیں گزری ہیں دل کو آئینہ خانہ بنے
کون جانے کون تھا اس میں مکیں پہلے پہل
وہ گھنی پلکیں جو بوجھل تھیں وقار حسن سے
میری چشم شوق سے مل کر جھکیں پہلے پہل

نیر سلطانپوری نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کی اصلاح اور اسے پیغام زندگی دینے کی بھر پور کوشش کی ہے ۔وہ قوم کو بیدار دیکھنا چاہتے تھے ۔ نیر ایک ہوش مند گھرانے میں پیدا ہوئے اور زندگی کی گہرائیوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔انھوں نے اپنی زندگی کے ہر حصے کو بڑی دیانت داری سے گزارا تھا۔

اکبر الہ آبادی کی یہ خوبی تھی کہ وہ بڑی چابکدستی سے اردو اشعار میں انگریزی کے الفاظ فٹ کر دیتے تھے۔ ایسا کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جو نیر صاحب میں بخوبی دکھتی ہے۔انھوں نے کتنی آسانی سے روز ازل سے روز جزا تک اور اول نبی سے آخری رسول تک نیز ان کے کارناموں کو اردو شاعری میں بہو اتارنے کی کوشش کی ہے وہ واقعی ان کا فنی کمال ہے ۔ بہت ہی ہلکے پھلکے انداز و سادہ زبان میں انگریزی اصطلاحات کا استعمال کرکے ایک نیا تصور دیا کہ موت، قبر، جزا و سزا کا راز انگریزی کے چند الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

وہ جس کو عرف عام میں کہتے ہیں زندگی
وہ ہے عدم سے ہستی میں آنے کا پاسپورٹ
ویزا ہے کتنے دن کا کوئی جانتا نہیں
یہ موت کے فرشتے کی ڈائری میں ہے نوٹ
وہ جس کو عرف عام میں سب موت کہتے ہیں
ویزے کے ختم ہونے کی ہے فائنل رپورٹ
کہتے ہیں جس کو قبر وہ ہے سرحد عدم
اس بارڈر پہ ہوتا ہے چیک سب کا پاسپورٹ
منکر نکیر کر کے عقائد پہ کچھ سوال
اذن سفر پہ اپنا لگاتے ہیں ایک نوٹ
اچھوں کو علیین بدوں کو ہے سجین
ملک عدم کے دونوں ہیں یہ شاندار فورٹ
وہ جس کو عرف عام میں اعمال کہتے ہیں
حکم خدا پہ چلنے نہ چلنے کی ہے رپورٹ

نیر سلطانپوری نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظموں سے ابتدا کی کیونکہ اس دور میں نظم نگاری کا بول بالا تھا۔ نظموں کے علاوہ قصیدہ، غزل، قطعہ، نعت، منقبت ہر صنف میں انھیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ عشق رسول میں ڈوب کر نعت کے جو اشعار کہے ہیں وہ قابل داد ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

در در جبیں جھکائی احساس کمتری نے
لاکھوں خدا بنائے انساں کی بت گری نے
صدقے میں مصطفےٰ کے جاگے شعور ذہنی
دھو کے دیے تھے ورنہ ہر نقش آزری نے
پیدا کیا دلوں میں احساس اشرفیت
منزل بلند کر دی تیری پیمبری نے
آئے جو سر اٹھا کر اٹھے وہ سر جھکا کر
کلمے پڑھا دیے ہیں خلق پیمبری نے
اسلام تیرا ایسا آئینہ حق نما ہے
کھائی شکست جس سے رسم ستمگری نے
مغرب میں ڈوب کر پھر حکم نبی سے پلٹا
الٹا سفر کیا ہے خورشید خاوری نے

نیر صاحب نے نعت کے ساتھ رثائی کلام بھی کہے ہیں مگر ان کے شعری مزاج کی ترجمانی سب سے زیادہ غزلوں سے ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسی غزلیں نہیں ہیں کہ جن میں صرف رسمی مضامین اور روایتی موضوعات ہی پائے جاتے ہوں۔ نیر صاحب اپنے عہد کی ترقی پذیر حسیت سے اپنے آپ کو برابر جوڑے رکھتے تھے اور مختلف موضوعات کو خوش اسلوبی کے ساتھ شعری شکل عطا کر دیتے تھے۔ ان کے غزلیہ اشعار پیش خدمت ہیں۔

اک اضطراب شوق مسلسل ہے کائنات
کس کو نہیں ملا مری آشفتگی سے فیض
سجدے میں ہو جبیں کہ جبیں میں سجود شوق
پاتا ہے آستاں بھی مری بندگی سے فیض
ملتا رہا جو یوں ہی غم عاشقی سے فیض
پہنچے گا حشر کو بھی میری زندگی سے فیض
جب تشنہ لبی یوں عام نہ تھی وہ دور تو اب آنے سے رہا
ساقی کا کرم کیسا ہی سہی ہر جام کو چھلکانے سے رہا
ہنستے ہی رہے ہم اے نیر واعظ کے فریب فردا پہ
یاں دیر حرم کی سیر بھی کی اور ربط بھی میخانے سے رہا

نیر صاحب نے اردو شاعری کی ہر صنف کو احاطہ تحریر میں لانے کی جو کامیاب سعی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ نظم کی بات کریں تو ان کی زیادہ تر نظمیں اصلاحی ہیں جن کے ذریعے قوم میں بیداری کی لو جلا سکیں۔ پھر اور قصائد میں بھی اپنے فکر و فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ نیر صاحب کی نعت گوئی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ نیر صاحب کی شاعری میں جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ الفاظ و بحر کا انتخاب ہے۔ ان کے حسین امتزاج سے شعر کی شعریت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں حسن پیدا کرنے لیے بڑی کاوشیں کرتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Yaseen
A 380, GTB Nagar
Kareli Prayagraj - 211016 (UP)
Mob.: 09336084416

عمران عاکف خان

قابل اجمیری

بزمِ رفتہ کا شاعر

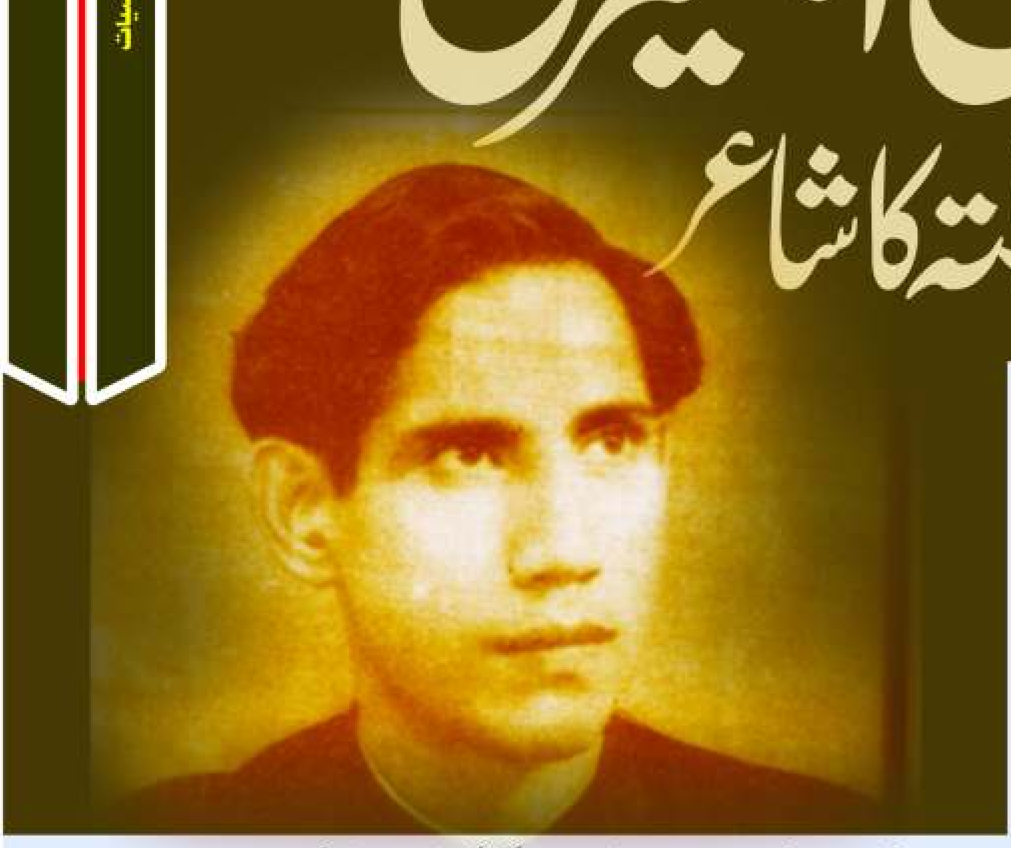

وقت کرتا ہے پرورش برسوں!
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا!!

کوئے قاتل میں ہمیں بڑھ کے صدا دیتے ہیں!
زندگی آج ترا قرض چکا دیتے ہیں!!

آج قابل میکدہ میں انقلاب آنے کو ہے!
اہل دل اندیشۂ سودوزیاں تک آگئے!!

یہ اشعار جیسے ہی سماعتوں سے ٹکراتے ہیں، بیدار اور حساس ذہن ایک دم سے چونک جاتا ہے۔ یہ آواز کس کی ہے؟ اس طرز کا خالق کون ہے؟ یہ کس شاعر کے اشعار ہیں؟ یہ نوائے درد کس کے سینے سے ابل رہی ہے؟ پھر جب سوالات ختم ہوتے ہیں تو جوابات کی تلاش و جستجو شروع ہوجاتی ہے، جو اسے عبدالرحیم قابل اجمیری تک لے جاتی ہے۔ پھر وہ قابل اجمیری کی ذات، شخصیت، حالات، زندگی، شاعری، کارناموں، زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی جدوجہد، فکر و فلسفے اور کشاکش حالات کے شرائٹے مارتے بھنور میں پھنس جاتا ہے، پھر جب وہ اس بھنور اور تموج سے باہر نکلتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایسے موتی و جواہر ہوتے ہیں جن کی تابانیوں کی عکس بندیوں سے 'قابل اجمیری... قابل اجمیری...' جھلکتا رہتا ہے، ان کو جتنا دیکھتے ہیں، اتنی ہی ان کی تابانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

اصولی بات ہے کہ فکریں جب روح اور نفسیات سے ہم آہنگ ہوجاتی ہیں، اسی طرح جب ان کا سروکار فرد اور ذات سے بڑھ کر پورے ماحول اور حالات سے ہوجاتا ہے، اس وقت ایک دردمند انسان کا درد، آفاقی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار نیز اسی طرز کے دیگر اشعار میں جو درد اور جو احساس موجود ہے، وہ اسی قبیل کا ہے جس نے رفتہ رفتہ آسمانوں سے بھی اونچا مقام حاصل کرلیا۔ اس درد کی تکمیل و ترسیل میں جو عناصر شامل ہیں، وہ ایک معمولی انسان کو زندگی اس وقت دیے جب اس کے تمام سہارے اس سے چھن گئے تھے، پھر اس سے پہلے کہ وہ ان حالات سے لڑنے کے لیے تیار ہوتا، وہ حالات اس کے اندرون میں داخل ہوگئے۔

درد بڑھتا ہوا جب روح میں اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے، اس وقت جو چیخیں شاعرانہ انداز میں اٹھتی ہیں، ان کا نام ہی قابل بانی ہے۔ یہی قابل بانی، 1951 میں، جدید نغمات، جدید موضوعات، جدید اسلوب اور جدید طرز کی شاعری کا سبب و آواز بنی۔ قابل اجمیری کی یہ فغاں اس وقت بلند ہوئی جب اردو دنیا سمیت، دیگر ادبی دنیائیں بھی جدید غزل اور جدید طرز غزل سے آشنا نہ تھیں۔ اس وقت اگر کوئی کہتا کہ 'جدید غزل' کی اصطلاح اردو میں متعارف ہونے والی ہے تو، یقین بہت مشکل سے کیا جاتا تھا، مگر قابل اجمیری نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ ایک معدوم خیال کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے قابل اجمیری کو حالانکہ زندگی کا عظیم سرمایہ لٹانا پڑا، مگر اس فنائیت کی عدم گاہ سے جو بقا ملی، اس نے آج تک ہر دو طرح دنیا کو حیران کر رکھا ہے۔

قابل کون ہیں؟ قابل کیسے قابلیت کی اس منزل پر پہنچے؟ قابل کی قابلیت کا راز کیا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات، قابل کی زندگانی بے نظیر میں ہی ملیں گے۔ یہ جوابات وہ ہیں جو ہر زمانے کے فکرمندوں اور حالات و حادثات سے لڑنے کا حوصلہ رکھنے والوں کے زرین اصول ہیں۔

زندگانی بے نظیر:

عبدالرحیم قابل اجمیری، 27 اگست 1931 کو اجمیر شریف کے محلے چرلی میں، عبدالکریم اور گلاب بیگم

کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے اجمیر شہر کے مدرسہ نظامیہ معینیہ [جو نظام حیدرآباد دکن کے زیر انتظام چلتا تھا] میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ محض 14 برس کی عمر سے شاعری کرنے لگے اور ارمان اجمیری و مولانا عبدالباری معنی اجمیری سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ ماں باپ کا سایہ سات سال کی عمر میں ہی آپ کے سر سے رخصت ہو گیا۔ والد صاحب تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو کر چل بسے اور والدہ ان کے غم میں مالک حقیقی سے جاملیں۔ قابل اس بھری پری دنیا اور کربناک ماحول میں اکیلے رہ گئے اسی ماحول میں ان کے دادا۔ دادی نے ان کی اور ان کے چھوٹے بھائی محمد شریف کی پرورش کی۔ مگر بہت جلد یہ سائے ختم ہو گئے۔ ان حالات نے قابل کے دل میں شعری عناصر کو پنپنے کا موقع دیا۔ پھر ملک آزاد ہوا جنوری 1948 میں، قابل اجمیری بھی سرحد پار جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو کر، اپنے بھائی محمد شریف کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے اور پہلے عارضی طور پر کراچی، پھر مستقل طور پر حیدرآباد، سندھ میں قیام پذیر ہوئے۔

پاکستان آنے کے بعد قابل اجمیری نے اخباروں میں قطعات نگاری کے علاوہ مشاعروں میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انھیں وہاں امید سے زیادہ حصہ ملا اور وہ مقبول ترین شاعر بن گئے۔ نیز ان کا شمار، اختر انصاری اکبرآبادی، محسن بھوپالی، سمیت حیدرآباد کے عظیم شعرا میں ہونے لگا اور انھیں محض 21 برس کی عمر میں اردو کے 'سینئر' شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ ان کی شعری عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حمایت علی شاعر جیسے عظیم ترین شعرا نے بھی قابل اجمیری کی شاگردی اختیار کی۔

قابل نے پاکستان میں تقریباً 14 سال بسر کیے۔ مگر یہ عرصہ کتنی کلفتوں میں گزرا اور کیسے کیسے گزرا، وہی جانتے تھے۔ سب سے پہلا صدمہ انھیں آمد پاکستان کے بعد، ان کے چھوٹے بھائی محمد شریف کی موت سے پہنچا تھا۔ محمد شریف تپ دق کے خاندانی مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے تھے۔ دیار جدید میں منہ پھاڑے مصائب بھرے حالات نے اکیلے قابل کو ہر جہت سے گھیر لیا۔ وہ ان سے لڑتے رہے اور مقابلہ کرتے رہے، جیتتے رہے، سرخ رو ہوتے رہے۔ مگر 1960 کی دہائی میں جب کہ وہ شاعری کی دنیا میں اپنی شہرت و ناموری کے پرچم بلند کر رہے تھے، ان کی جدید طرز و طرح پر دنیا سر دھن رہی تھی، ان کے خاندانی تپ دق کے موذی مرض نے انھیں کوئٹہ [بلوچستان] کے ملٹری اسپتال 'سینوٹوریم' میں پہنچا دیا۔ جوان دنوں پاکستان کا واحد ٹی بی اسپیشلسٹ انسٹی ٹیوٹ تھا۔ یہاں ان سے زندگی نے ایک خوب صورت کھیل کھیلا۔ اس نے اپنا حسن، اپنے جلوے اور اپنے دلکش فریب اس طرح دکھائے کہ قابل کو جینے کی چاہ ہو گئی اور وہ کہنے لگے۔

حسن ہی حسن جلوے جلوے!
صرف احساس کی ضرورت ہے!!

ہوا یوں کہ 'سینی ٹوریم' کے جس وارڈ میں قابل زیر علاج تھے، اس کی انچارج ایک پارسی نرس 'نرگس سوئن' تھیں۔ انھیں جب اطلاع ملی کہ 'قابل' بطور پیشنٹ ان کے وارڈ میں لائے گئے ہیں تو، انھوں نے ان کی تیمارداری، نگہداشت اور دیگر خدمات کی تمام ذمے داریاں اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ نرگس کے اس حسن سلوک نے قابل کو بہت متاثر کیا مگر یہ عنایت اور یہ بے خودی، بے سبب تو نہ تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قابل نرگس کی دعاؤں کی 'آمین' تھے۔ اس بے خودی کی پردہ داری میں راز یہ تھا کہ 'نرگس' ان کی غائبانہ مداح تھی اور اب تو محبوب

سامنے تھا، بلکہ دسترس میں بھی۔ قدرت نے اس بہانے سے دونوں کو ملا دیا۔ محض رسماً نہیں بلکہ نرگس نے اسلام قبول کر کے قابل سے شادی بھی کر لی۔ یہ شادی ایک کامیاب شادی ثابت ہوئی اور 'نرگس' کے بطن سے قابل کو ایک پھول 'ظفر قابل اجمیری' کی صورت میں حاصل ہوا۔

یہ قابل کی زندگی کے آخری ایام تھے، ان کی سانسیں ایک ایک کر کے کم ہوتی جارہی تھیں۔ مرض بگڑتا گیا۔ بیگم نرگس قابل نے سو جتن کیے، مگر قابل، اس درد سے نجات نہ پاسکے اور ایک دن دنیا کے تمام قابل ترین انسانوں کی طرز پر بہت مختصر زندگی پا کر بہ عمر 31 سال، عین جوانی میں اس جہان فانی سے 30، اکتوبر 1962 کو مالک حقیقی سے جاملے۔

قابل اجمیری کی ذاتی زندگی ایک طویل المیہ تھی، جس کا ہر دن کوئی نہ کوئی مصیبت اور پریشانی لے کر آتا تھا مگر ان کا صبر اور ان کا حوصلہ کمال کا تھا۔ ان کو قریب سے جاننے والے اور پاکستان میں ان کی روزمرہ کی زندگی سے واقفین تو، یہاں تک کہتے ہیں کہ جب ڈاکٹر زنے انھیں سیب کھانے کے لیے مشورہ دیا تھا تو، ان کے پاس سیب خریدنے تک کے بھی پیسے نہیں تھے۔ مگر اس کے باوجود اس ظالم دنیا میں ایک خاتون ایسی ضرور موجود تھیں جس نے کوئٹہ کے 'سینی ٹوریم' میں قابل کی شریک حیات بننے کا فیصلہ اس وقت کیا تھا جب اسے معلوم تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ موت انھیں زیادہ مہلت نہیں دے گی۔ پھر اس خاتون نے قابل اجمیری کے لیے ترک مذہب کر کے اسلام بھی قبول کر لیا۔ یہ قابل اجمیری کی خوش قسمتی تھی۔ اس خاتون کے سبب ہی قابل اجمیری کے دو شعری مجموعے 'دیدۂ بیدار' [1963] اور 'خون رگ جاں' [1966] شائع ہو سکے جو ان کی شعری عظمت کے بلند ترین مینارے ہیں۔

قابل اجمیری نے اظہار درد کے بیان کے لیے جس صنف کو چنا، وہ صنف غزل تھی اور غزل کی بھی وہ روایت، جو جدید غزل کی اساس بنی۔ ان ہی خطوط پر ان کے بعد آنے والے شعرا نے اپنی شاعری کی بنیادیں استوار کیں۔ قابل کا شعری وجدان اور خصوصیات کا احاطہ یوں تو ناممکن ہے تاہم مختصر طور پر یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے فرسودہ موضوعات سے بغاوت کرتے

قابل اس بھری پری دنیا اور کربناک ماحول میں اکیلے رہ گئے اسی ماحول میں ان کے دادا، دادی نے ان کی اور ان کے چھوٹے بھائی محمد شریف کی پرورش کی۔ مگر بہت جلد یہ سائے ختم ہوگئے۔ ان حالات نے قابل کے دل میں شعری عناصر کو پنپنے کا موقع دیا پھر ملک آزاد ہوا جنوری 1948 میں، قابل اجمیری بھی سرحد پار جانے والے ایک قافلے میں شامل ہوکر، اپنے بھائی محمد شریف کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے اور پہلے عارضی طور پر کراچی، پھر مستقل طور پر حیدرآباد، سندھ میں قیام پذیر ہوئے۔

ہوئے نئے اور وقت موجود کے سلگتے مسائل، فرد و ذات کی تنہائیوں، اقدار و مشرقی اصولوں کی پامالی اور نئی نسلوں کا پرانی نسلوں کے تئیں غلط سلوک رویے کو اپنی شاعری کا موضوع اور عنوان بنایا۔ قابل اجمیری نے اپنی شاعری میں حیات و کائنات کے عمیق مسائل کی گتھیاں نہیں سلجھائیں اور نہ ہی لاینحل عقدوں کی گرہیں کھولی ہیں، اسی طرح ناقابل فہم تصویریں و البم بنائے، بلکہ نہایت قریب اور حسب حال مسائل و کربناکیوں کو شاعری کا لباس پہنایا اور عوامی درد اسی کے سازوں پر گایا۔ قابل کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی شاعری دلوں کی شاعری ہے اور ان کی غزلوں کا آہنگ، وقت کی آواز ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات، وتجربات، ان کے شعری اسلوب میں ڈھل گئے ہیں۔ انھوں نے دل کی ہر کسک، ہر احساس اور ہر تڑپ کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری معیاری اور جدیدیت کے رنگ سے مزین تھی۔ جدید تصورات و امکانات کے رجحانات کی عکاسی ان کے اشعار میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ان کے یہاں میر کا سوز و گداز، مومن کا طرز، غالب کی خیال آفرینی اور داغ کی شگفتہ بیانی کے ساتھ جدیدیت کی لے بھر پور طریقے سے موجود ہے۔ قابل نے اسی قدیم روایت میں تجدد کا راستہ اختیار کیا اور شعر و سخن کو نئی فکروں کا محور بنا دیا۔ قدیم و جدید اور روایت میں تجدد کی آمیزش نے ان کے کلام کو سحر طرازی کا عنوان بخشا ہے۔

قابل اجمیری کی شاعری جدید فکر و رجحان کی غماز ہے۔ ان کی شاعری میں روایت سے بغاوت اور روایت سے تجدد جابجا نظر آتا ہے، جس کی جانب پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے بھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''.......آپ کو ان الفاظ سے اندازہ ہوا ہوگا کہ قابل اجمیری میں نکتہ سے نکتہ پیدا کر لینے، خیال روشن کر لینے اور روایت سے جدید روایت کو جنم دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی جدت و لطافت اور ان کے احساس میں غضب کی تازگی و انفرادیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل میں بعض حد درجہ فرسودہ اور ناموافق زمینوں میں بھی وہ ایسے آب دار نشتر نکال لیتے ہیں کہ خدا کی توفیق یاد آجاتی ہے۔''

اپنے ایک مضمون 'حساس جذبوں کا شاعر، قابل اجمیری' میں احمد رئیس لکھتے ہیں:

''قابل اجمیری ہمارے عہد کے نہایت معتبر اور منفرد شاعر تھے۔ ان کے فنی اجتہادات اور شعری کمال کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ وہ اردو غزل کے ان قابل اور ہونہار شاعروں میں شمار ہوتے تھے، جنھوں نے غزل کو اپنے انداز سے برتا، وہ جدید غزل بلکہ جدید تر غزل کے نمائندہ شاعر تھے۔ ایسے شاعروں کے سرخیل کہ جن سے جدید غزل کا اعتبار قائم ہوا۔ انھیں اپنی غزل کی انفرادیت اور اس کے حسن اور بانکپن کا مکمل ادراک تھا۔ اسی لیے تو انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ:

ہوس کے دور میں قابل سے عظمت فن ہے...'' [7]

(احمد رئیس، روزنامہ 'جنگ' کراچی، اشاعت 27 اگست 2006، پاکستان)

قابل اجمیری نے یہی راہ چنی اور وہ تاعمر اسی راہ کے مسافر رہے۔ انھوں نے جدید راہ چن کر اردو شاعری کو نئے معانی، استعاروں، لفظیات، احساسات اور فکروں سے مالامال کر دیا۔ قابل نے کسی کی تقلید نہ کی اور بلکہ اس کارگہ عمل میں انھوں نے اپنی راہ خود بنائی۔ ان کی جدت طرازی ایک وقت میں معجزہ بن گئی تھی جس پر نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے انھیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر خراج تحسین بخشا۔ چنانچہ ایک مقام پر ڈاکٹر عبادت یار خاں عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''قابل کے یہاں تقلید کا شائبہ تک نہیں ہوتا وہ نئی بات کہتے ہیں اور نئے انداز سے کہتے ہیں۔ غزل کی روایت سے پوری واقفیت رکھنے اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے باوجود وہ کبھی لکیر کے فقیر نہیں بنے۔ ان کے یہاں خاصا تنوع ہے لیکن اس تنوع کے ہاتھوں ان کی انفرادیت کو ٹھیس نہیں لگتی ان کا مخصوص زاویہ نظر اس تنوع میں بھی یک رنگی پیدا کرتا ہے''

(ڈاکٹر عبادت بریلوی: طالب علم ڈائجسٹ، قابل نمبر، [مرتب] محمد حسین قریشی، حیدرآباد سندھ، ص: 22، فروری 1970)

> قابل اجمیری ہمارے عہد کے نہایت معتبر اور منفرد شاعر تھے .ان کے فنی اجتہادات اور شعری کما ل کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ وہ اردو غزل کے ان قابل اور ہونہار شاعروں میں شمار ہوتے تھے، جنھوں نے غزل کو اپنے انداز سے برتا، وہ جدید غزل بلکہ جدید تر غزل کے نمائندہ شاعر تھے .ایسے شاعروں کے سرخیل کہ جن سے جدید غزل کا اعتبار قائم ہوا۔ انہیں اپنی غزل کی انفرادیت اور اس کے حسن اور بانکپن کا مکمل ادراک تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید انداز و احساس سے سجے، قابل اجمیری کے چند اشعار ذیل میں ثبت کیے جائیں۔

تم نے مسرتوں کے خزانے لٹا دیے!
لیکن علاج تنگی داماں نہ کر سکے!!
اک والہانہ شان سے بڑھتے چلے گئے!
ہم امتیاز ساحل و طوفاں نہ کر سکے!!

ابھی مشکل سے سمجھے گا زمانہ!
نیا نغمہ نئی آواز ہوں میں!!
مجھی پہ ختم ہیں سارے ترانے!
شکست ساز کی آواز ہوں میں!!

30 اکتوبر 1962 کا دن ایسا دن تھا جس دن یہ باکمال شاعر اپنے زخموں سے رستے لہو کی بہاریں دکھاتا ہوا چلا گیا۔ ان کی جواں سال مرگ نے انھیں دنیا کے دیگر باکمال شاعروں، فن کاروں، دنیا کو حیرت ناک تخلیقات عطا کرنے والوں کی صف میں شامل کر دیا۔

اردو میں پنڈت دیا شنکر نسیم، عبدالرحمان بجنوری، ولایت علی بمبوق، انعام اللہ خاں یقین، اسرار الحق مجاز، سارا شگفتہ، شکیب جلالی، حیات امروہوی، زخ ش، [زاہدہ خاتون شیروانیہ: دختر مزمل اللہ خاں، علی گڑھ] اور انگلش میں جان کیٹس، روبرٹ لوئیس، ہرنی ڈیوڈ، برنیٹ سسٹرز، جارج اورویل، فرانز کافکا اور دیگر ایسے کتنے ہی نام ہیں، قابل اجمیری نے جن کی مرگ میں تقلید کی اور وہی مرض انھیں بھی نصیب ہوا۔ ان علم و فن کے آسمانوں کو بھی ٹی بی نے زمین کا لقمہ بنایا اور قابل کو بھی یہی مرض لاحق ہوا۔ عمر بھی کتنی کم یعنی، 31 برس۔ مگر قابل کی قابلیت ان ہی 31 برسوں کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے اسی عمر میں زندگی کا قرض چکایا اور اس طرح کہ زندگی اب کئی نسلوں تک سے قرض نہیں مانگ سکتی۔ جس طرح بعض اقوام کے عقیدے کے مطابق مسیح ابن مریم مصلوب ہو کر اپنی ملت کے سارے افراد کے گناہوں کا کفارہ ادا کر گئے، اسی طرح قابل اجمیری نے بھی یہ کار مسیحائی کیا۔ اس طرح ان کی زندگی تو زندگی، موت بھی زندگی بن گئی۔ ان کی باتیں زندہ ہیں، ان کی راہیں جاری ہیں، ان کے تجربے باقی ہیں، ان کا کلام زندہ اور جدید اردو غزل کی روایت زندہ ہے۔ یعنی قابل مر کر بھی زندہ ہے۔

■

Imran Akif Khan
Research Scholar, JNU
New Delhi - 110067
Mob.: 9911657591
E-mail.: imranakifkhan@gmail.com

ودربھ میں معاصر اردو تنقید و تحقیق

خان حسنین عاقب

ملک کی آزادی کے تقریباً 13/14 سال بعد یکم مئی 1960 کو ایک نئی ریاست وجود میں آئی۔ یہ ریاست سابقہ تین خطوں کو ایک دوسرے میں ضم کرکے تشکیل دی گئی۔ یہ خطے تھے بامبے اسٹیٹ، برار، ودربھ اور سابقہ حیدرآباد اسٹیٹ کے شمال مغربی حصے جو پرتگالیوں سے آزاد کروائی گئی۔ اس نومولود ریاست کا نام رکھا گیا 'مہاراشٹر'۔ مہاراشٹر انتظامی، جغرافیائی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے مختلف ڈویژن میں بٹا ہوا ہے۔ یہ ڈویژن ہیں امراوتی، اورنگ آباد، کوکن، ناگپور، ناسک اور پونے۔ ودربھ میں امراوتی اور ناگپور ذیلی ڈویژن شامل ہیں۔ امراوتی ڈویژن کا پرانا نام 'برار' ہے۔ یہ ریاستِ مہاراشٹر کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ موجودہ دور میں اس علاقے میں گیارہ اضلاع شامل ہیں۔ یہ اضلاع ہیں ناگپور، وردھا، گڑھ چرولی، گوندیا، چندرپور، بھنڈارا، امراوتی، آکولہ، واشم، بلڈانہ اور ایوت محل۔

یہ تو ہوئی ودربھ کی انتظامی تشکیل۔ اگر زبان و ادب کی بات کریں تو ودربھ ہی نہیں بلکہ تمام ریاستِ مہاراشٹر کی علاقائی زبان مراٹھی ہے۔ ہم یہ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ملک میں ریاستوں کی تشکیل لسانی خطوط پر ہی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا مہاراشٹر بھی ان علاقوں پر مشتمل ہے جہاں آبادی کی اکثریت کی زبان مراٹھی ہے۔ خود ودربھ کے علاقے میں مراٹھی زبان و ادب کی ترویج کے لیے خود حکومت بھی کوشاں رہتی ہے۔ اس زبان کے فروغ کے لیے درج ذیل تنظیمیں یا تو براہِ راست حکومت کی زیرِ نگرانی یا پھر حکومت کی معاونت سے برسرِ عمل ہیں۔

1۔ ودربھ ساہتیہ سنگھ (برائے فروغ مراٹھی زبان)
2۔ ودربھ راشٹر بھاشا پرچار سمیتی (برائے فروغ ہندی زبان)
3۔ ودربھ ہندی ساہتیہ سمیلن (برائے فروغ ہندی زبان)

لیکن ودربھ میں درج بالا سطح کی کوئی تنظیم اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہے جب کہ مراٹھی کے بعد ہندی نہیں بلکہ اردو ہی اس علاقے کی سب سے مقبول اور مروجہ زبان ہے۔

جب ہم ودربھ میں اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے جو منظر آتا ہے وہ ذرا مختلف قسم کا ہے۔ ودربھ کے گیارہ اضلاع میں سے تین اضلاع اردو زبان کی تدریس اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لحاظ سے پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اضلاع ہیں ناگپور، امراوتی اور آکولہ۔ ان تین اضلاع کے بعد نمبر آتا ہے اگلے تین اضلاع کا جو ناگپور، امراوتی اور آکولہ سے نسبتاً کم لیکن دیگر اضلاع کی بہ نسبت زیادہ فعال ہیں۔ یہ اضلاع ہیں بلڈانہ، واشم اور ایوت محل۔ وردھا، چندرپور اور بھنڈارا میں مسلم آبادی متذکرہ بالا چھ اضلاع کے مقابلے میں کم لیکن بقیہ اضلاع کے مقابلے میں زیادہ ہے اس کے باوجود یہاں اردو زبان کی تدریس اور اردو زبان و ادب، دونوں شعبوں میں پیش رفت خاطر خواہ نہیں ہے۔ رہی بات باقی ماندہ اضلاع یعنی گوندیا اور گڑھ چرولی کی تو اردو زبان و ادب کے نقشے پر یہ اضلاع کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ہوسکتا ہے یہاں چند اردو اسکول ہوں لیکن اردو ادب کے تخلیقی یا غیر تخلیقی، کسی شعبے میں ان اضلاع کی نمائندگی نظر نہیں آتی۔ یہ تو ہوئی ودربھ میں اردو زبان و ادب کی Demographic situation۔

مجموعی طور پر ہم ودربھ میں تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ اس خطے میں تخلیقی ادب کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوئے۔ یہاں تخلیقی ادب کا بحرِ ذخار ہمیشہ موجزن رہا اور رہتا ہے۔ آپ شاعری کی بات کریں یا افسانہ نگاری یا کسی اور صنف کی، ہر زمرے میں میدان کبھی خالی نہیں رہا اور نہ ہی تخلیق کاروں کی کوئی کمی رہی۔ ہر دور میں ودربھ میں اردو ادب کے آسمان پر شاعری اور افسانہ نگاری کے ستارے چمکتے رہے۔ بہت اچھی شاعری بھی سامنے آئی اور اچھے افسانوں نے بھی اہلِ ذوق کو اپنی جانب منعطف کیا۔ البتہ اردو کی ادبی تحقیق اور تنقید کے شعبے میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے محنت و مشقت کے اس خارزار میں قدم رکھا ہو اور خود اپنا نام روشن کیا ہو۔ ودربھ کے جن اہلِ قلم لوگوں نے ایسا کیا ہے یہ مقالہ ان کی خدمات کا احاطہ کرنے کی ایک کوشش محض ہے۔ آیئے دیکھیں کہ ودربھ کے مختلف

اضلاع میں تحقیق وتنقید کے معاصر نام کون سے ہیں۔

ناگپور:

ناگپور ضلع جغرافیائی اعتبار سے بھی وِدربھ کے تمام اضلاع سے بڑا ہے۔ یہ وِدربھ کی راجدھانی بھی ہے اور ریاستِ مہاراشٹر کی دوسری راجدھانی ہے۔ اردو کے حوالے سے ناگپور ماضی میں بھی نہایت اہم علاقہ رہا ہے۔ غلام مصطفیٰ صوفی تبسم ناگپور سے اردو کے اولین محقق ہیں جو آزادی کے بعد پاکستان ہجرت کرگئے۔ ان کے علاوہ ناگپور میں رفیع الدین صاحب، سید عبدالرحیم صاحب، منشاء الرحمٰن منشاء صاحب، عبدالقادر صاحب، خواجہ حامد صاحب، زرینہ ثانی، فارسی کی مشہور شاعرہ خورشید آراء بیگم کے شوہر نواب صدیق علی، (مسلم لیگ کے بڑے عہدیدار، نواب زادہ لیاقت علی خان کے سکریٹری) ناطق گلاؤٹھوی، علامہ شارق جمال (فن عروض پر کتابیں) پروفیسر عبدالرب عرفان ('مقالاتِ عرفان' اور 'داراشکوہ اپنی نگارشات کے آئینے میں') عبدالرحیم صاحب (کلمات، مشاہیر برار جیسی کتابوں کے علاوہ متعدد تحقیقی مضامین) وغیرہ نے دورِ اول میں اردو ادبی تحقیق کی کہکشاں سجا رکھی تھی۔

موجودہ دور میں بھی کئی لوگ اردو زبان میں تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ تنقید اور تحقیق کے زمروں میں بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے ہم اس مقالے میں معلوم لوگوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو فی الوقت بھی سرگرمِ عمل ہیں۔

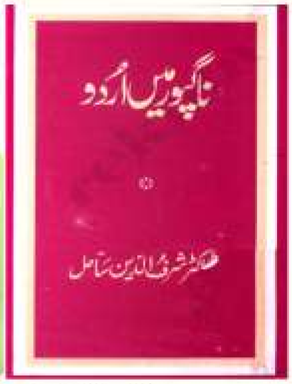

ڈاکٹر شرف الدین ساحل اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبان وادب پر ملکہ رکھتے ہیں۔ اردو ادب کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس کا احاطہ شرف الدین ساحل نے نہ کیا ہو؟ تخلیقی ادب میں شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ تنقید اور تحقیق سے انھیں خاص علاقہ ہے۔ انھوں نے فارسی زبان کے شہرۂ آفاق شاعر خاقانی شیروانی پر تحقیقی کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادبی تاریخ بھی مدون کی۔ اس ضمن میں ان کی کتابیں 'ناگپور میں اردو' اہم ہے۔ انھوں نے بیان میرٹھی پر بھی تحقیقی کام کیا ہے جو بیان میرٹھی پر اب تک کا سب سے وقیع کام مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عادل ناگپوری کی حیات وخدمات پر بھی تحقیقی نوعیت کی کتاب لکھی ہے۔ شرف الدین ساحل صاحب کی اب تک پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

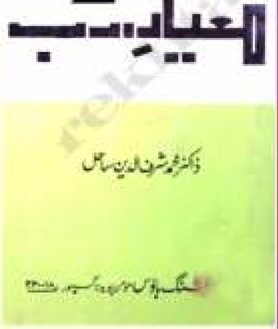

تنقید وتحقیق میں ایک اہم نام ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن کا بھی ہے۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے 'علاقۂ برار میں اردو زبان وادب کا ارتقا' نامی کتاب تحریر کی ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی تحقیقی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے تحقیقی ادب میں اہم کام انجام دیے ہیں۔ ناگپور میں اردو تحقیق کا ایک نام ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کا ہے۔ نشتر صاحب نے اپنی اکیڈمک زندگی کا بیشتر حصہ کوکن میں گزارا لیکن ناگپور سے ان کا جذباتی تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ اپنے وطن ناگپور ہی میں سکونت پذیر ہوگئے۔ نشتر صاحب شاعر بھی ہیں اور ادیبِ اطفال بھی۔ ان کی تحریر کردہ تحقیقی کتابوں میں 'کوکن میں اردو'، اور 'پونے میں اردو' اہم ہیں۔ ڈاکٹر مدحت الاختر جدید اردو شاعری کا اہم نام ہے لیکن ان کا نام اردو کے تحقیقی ادب کی تاریخ میں بھی نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ ادبی تحقیق کے زمرے میں ان کی 'کشمیری لال ذاکر۔حیات وخدمات' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ انھیں بھی ہم تحقیقی ادب کے زمرے میں شمار کرسکتے ہیں۔

دانش غنی کا تعلق ناگپور سے ہے۔ اردو تنقید اور تحقیق میں نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھیں ادب کی جاگیر اپنے والد ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر سے وراثت میں ملی ہے۔ دانش غنی نے اب تک تنقید اور تحقیق کی دو کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب 'شعر کے پردے میں' تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ریحان کوثر نے اردو

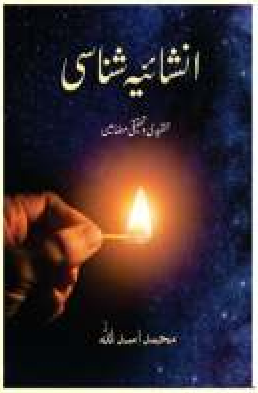

تنقید میں نئی نسل کی صف میں خود کو شمار کروایا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار تو ہیں ہی، وہ مشہور اردو ماہنامہ 'الفاظِ ہند' کے مدیر بھی ہیں۔ اظہر حیات ناگپور سے اردو تحقیق کا ایک نمایاں نام ہے۔ انھوں نے بھی اردو تحقیقی مضامین تحریر کیے ہیں جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ سروشہ نسرین قاضی ناگپور سے اردو تحقیق میں موجودہ نسل کی خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مدحت الاختر پر موصوفہ نے تحقیقی نوعیت کی کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے منور رانا پر بھی تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے 'رانا آرٹ'۔ اس کے علاوہ بھی ان کے مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ ناگپور سے ہی ایک اہم نام محمد ایوب صاحب کا ہے جنھوں نے اردو تحقیق پر مبنی کتاب 'نقشِ تحریر' لکھی ہے۔ نوجوان محقق تقی جعفری کا نام بھی اردو تحقیق کے شعبے میں تیزی سے ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ ان کی کتابیں 'کامٹی کا ادبی منظرنامہ' اور 'اردو غزل میں رثائیت' شائع ہوچکی ہیں۔

ناگپور سے ان کے علاوہ بھی کچھ نام ہوسکتے ہیں جو اردو تحقیق وتنقید میں کام کررہے ہوں لیکن ان کی تحریروں سے زیادہ ہماری لاعلمی کا احاطۂ رسائی وسیع ہے۔

کتاب 'نظیری نیشاپوری۔شخصیت اور شاعر' نہایت اہم ہے۔ انھوں نے کئی تحقیقی مقالے بھی تحریر کیے ہیں۔ محمد حفظ الرحمٰن بھی اردو تنقید وتحقیق میں اہم نام ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی مقالات پر مبنی ان کی کتاب 'بکھرے ورق' شائع ہوچکی ہے۔

ناگپور سے ہی اردو تحقیق کا ایک اہم نام ڈاکٹر محمد اسداللہ کا ہے۔ ڈاکٹر اسداللہ کا تعلق امراوتی شہر کے تعلقہ وروڈ سے ہے لیکن شکم پُری کا تقاضا انھیں بھی ناگپور لے آیا اور پھر وہ یہیں کے ہوگئے۔ ان کا تخلیقی شعبہ انشائیہ ہے اور اکثر تحقیق بھی انھوں نے انشائیے کے ذیل ہی میں کی ہے۔ ان کی تحقیقی کتابوں میں 'انشائیے کی روایت مشرق ومغرب میں'، 'پیکر وپرچھائیں' اور 'سمندر اور ستارہ' قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رفیق احمد کا تعلق پیشۂ تدریس سے ہے۔ انھوں نے ویسے تو ماحولیات پر بھی کتابیں تحریر کی ہیں لیکن اردو تحقیق میں ان کی تازہ ترین اہم کتاب

امراؤتی:

امراؤتی اردو ادب کے لحاظ سے ماضی کی ایک درخشاں روایت رکھتا ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے کچھ عرصہ بعد تک بھی یہاں اہلِ ذوق وادب اور صاحبانِ قلم موجود تھے۔ ان میں 'مرید ہندی' کے مصنف سید نعیم الدین صاحب، 'تاریخ امجدی' کے مصنف امجد حسین خطیب، 'اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر' اور 'قرآن میں اوامر و نواہی' کے مصنف اقبال احمد صاحب نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ خواجہ عبداللطیف جریر، پروفیسر حیدر علی، ذکا صدیقی، نورالعین علی صاحب نے بھی اردو ادب اور اردو تحقیق کو مالا مال کیا ہے۔ سعد اللہ خان صاحب اور سمیع اللہ خان صاحب نے امراؤتی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور پی۔ ایچ۔ ڈی گائڈ ہونے کی حیثیت سے بے شمار نوجوانوں کو محقق بنایا ہے۔ البتہ ان کے ماتحت پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیق کرنے والے ان بے شمار محققین میں سے بہت کم لوگ اردو ادب میں داخل ہو پائے۔ فی الوقت جو لوگ اردو تحقیق و تنقید کے شعبے میں امراؤتی کی نمائندگی کر رہے ہیں ان میں چند ہی نام سرِ فہرست ہیں۔ پہلا نام تو ڈاکٹر سید صفدر کا ہے۔ ڈاکٹر سید صفدر نے بہت پہلے اردو تنقید کی کتاب لکھی تھی جس کا عنوان تھا 'جدید شعری تنقید'۔ اس کے بعد انھوں نے اردو تنقید کی دوسری کتاب 'شاعری اور شیوۂ پیغمبری' کے نام سے لکھی۔ دو تین برس قبل ان کی کتاب 'بے آمیز' بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ تخلیقی ادب سے متعلق ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ شاہد رشید کا تعلق امراؤتی کے تعلقہ 'ورود' سے ہے۔ انھوں نے ادبی تحقیق کا حق 'صفدر۔ تحقیقی و تنقیدی جہتیں' لکھ کر ادا کیا ہے۔ دوسرا نام ہے ڈاکٹر ناصر الدین انصار کا۔ ان کا اصل وطن 'مانا' ہے جو آکولہ ضلع میں ہے۔ انصار صاحب گزشتہ ایک دہائی سے امراؤتی میں سکونت پذیر ہیں۔ تحقیقی مقالات پر مبنی ان کی کتاب 'ادبی مطالعات' دو برس قبل ہی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ ان کا ادبی سفر ہنوز جاری ہے۔ اس برس بھی ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

آکولہ:

ڈاکٹر محبوب راہی کا تعلق بنیادی طور پر بلڈانہ ضلع سے ہے۔ موصوف بلڈانہ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'ماتر گاؤں' میں پیدا ہوئے۔ اسی ضلع کے ایک گاؤں پیپل گاؤں میں کافی وقت گزارا۔ بعد ازاں بہ سلسلۂ ملازمت آکولہ ضلع کی ایک تحصیل 'باری ٹاکلی' میں بحیثیت مدرس مقرر ہوئے اور پھر زندگی بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ ان کی تحقیقی نوعیت کی کتابوں میں سب سے اہم 'مظفر حنفی۔ فن اور شخصیت' ہے۔ راہی صاحب کی کل کتابوں کی تعداد پچاس تک جا پہنچتی ہے۔ ان کے بعد جس شخص نے اردو تحقیق میں قابلِ قدر کام کیا ہے وہ ہیں فصیح اللہ نقیب۔ فصیح اللہ نقیب کا تعلق بلڈانہ ضلع کے پیپل گاؤں سے ہے لیکن ملازمت کی بندش انھیں آکولہ لے آئی۔ انھوں نے عثمان آزاد اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج میں بحیثیت فارسی لکچرر تقرر حاصل کیا اور اسی اسکول سے سبکدوش ہوئے۔ ایک اچھے شاعر ہیں۔ ادبی تحقیق میں انھوں نے دو اہم کام انجام دیے ہیں۔ ایک ہے برار کے غزل گو شعرا کے تذکروں پر مشتمل ضخیم کتاب 'غزلستانِ برار' اور دوسری کاوش ہے مشہور شاعر غنی اعجاز کے فن اور شخصیت پر مبنی 'غنی اعجاز۔ شخص اور عکس'۔ نقیب صاحب کو اردو تحقیق کے زمرے میں پائندہ رکھنے کے لیے یہ دو کام ہی کافی ہیں۔ شکیل اعجاز یوں تو ملک بھر میں جانے جاتے ہیں اپنی مصوری کے لیے لیکن اردو مزاح نگاری میں بھی انھوں نے وہی کام قلم سے لیا جو کام وہ مصوری میں برش سے لیتے ہیں۔ انھوں نے ادبی تحقیق کے میدان میں تو اسی وقت قدم رکھ دیا تھا جب وہ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے 'تذکرہ نثر نگارانِ ضلع آکولہ' لکھی تھی۔ اس کے بعد شکیل اعجاز نے غزلستانِ برار میں بھی معاون مدیر کے بطور خدمات انجام دی ہیں۔ تحقیق کے زمرے میں ایک نام ضمیر ساجد کا بھی ہے جو بنیادی طور پر ایک اچھے شاعر ہیں لیکن اردو تحقیق میں وہ 'غزلستانِ برار' کی اشاعت میں نقیب صاحب اور شکیل اعجاز کے ساتھ برابری سے شریک رہے۔ اس لیے آکولہ ضلع سے اردو تحقیق میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

آکولہ ضلع بلکہ آکولہ شہر سے برِصغیر میں اردو ادب کے بہت سارے زمروں کے ساتھ ساتھ اردو تنقید و تحقیق میں راقم کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن راقم دو دہائیوں سے ایوت محل میں مقیم ہے اس لیے اس کا ذکر ایوت محل ضلع کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

ایوت محل:

ایوت محل ضلع میں اردو تحقیق اور تنقید کے زمروں میں سرِ فہرست نام آتا ہے ڈاکٹر یحییٰ نشیط کا۔ انھوں نے ایوت محل ضلع کی ڈگرس تحصیل کے چھوٹے سے قصبے 'کل گاؤں' میں رہائش پذیر رہتے ہوئے ملک میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی اردو تحقیق و تنقید میں بھارت کی نمائندگی کی ہے۔ اردو تحقیق کے شعبے میں ڈاکٹر یحییٰ نشیط کے نمایاں کاموں میں 'اردو میں حمد و مناجات کی روایت'، 'اردو اور مراٹھی کے تہذیبی رشتے' اور 'اردو شاعری میں اسطوری فکر و فلسفہ' بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'ہشت پہلو فنکار۔ ف۔ س اعجاز' جیسی ضخیم کتاب بھی لکھی ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط کا نام ادبی تحقیق کے حوالے سے مراٹھی حلقوں میں بھی نہایت معتبر ہے۔ ضلع ایوت محل کے شہر پوسد سے تعلق رکھنے والی ایک شخصیت ہیں ڈاکٹر عبداللطیف سبحانی۔ موصوف مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہے اور ادبی تحقیق کے زمرے میں بھی سرگرم رہے۔ ان کے چیدہ چیدہ تحقیقی کاموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خان حسنین عاقب کا تعلق یوں تو شہر آکولہ سے ہے لیکن گزشتہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزرا کہ سلسلۂ ملازمت اور شکم پُری کے تکلف نے ایوت محل ضلع کے شہر پوسد کی لازمی شہریت عطا کر دی۔ ادبی سفر کی شروعات تو آکولہ ہی سے ہو چکی تھی لیکن ارتکازِ توجہ اور کمٹمنٹ کے ساتھ ادب کی سمت پیش رفت یہیں رہتے ہوئے کی اور پوسد ہی میں سکونت پذیر ہیں۔ عاقب نے اب تک تعلیم و تعلم، درسیات، شاعری، حمد و نعت، تنقید و تحقیق، ترجمہ وغیرہ جیسے شعبوں میں تقریباً 17 کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کتابیں یشونت راؤ چوان یونیورسٹی، ناسک اور مہاراشٹر ڈی۔ ایل۔ ایڈ کے نصاب میں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ 2019 کے آخری مہینے میں تحقیقی مقالات پر مبنی کتاب 'کم و بیش' شائع ہو چکی ہے۔

محسن ساحل کا تعلق ایوت محل ضلع کے شہر عمرکھیڑ سے

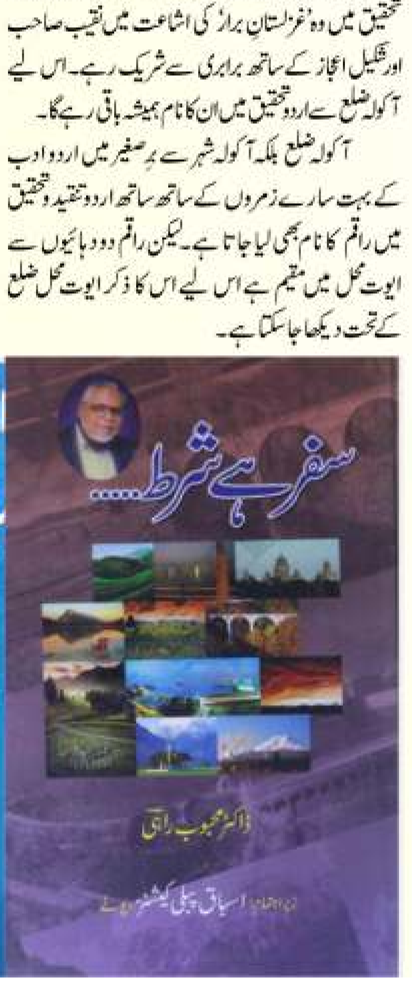

ہے۔ تقدیر انھیں ملازمت کی ڈور سے باندھ کر ممبئی لے گئی۔ انھیں ممبئی گئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے لیکن وہاں ایک نہایت قلیل عرصے میں انھوں نے اپنی ادبی شناخت قائم کرلی۔ ان کا ربط عمر کھیڑ سے اب بھی اتنا ہی توانا ہے جتنا پہلے تھا اس لیے انھیں میں ایوت محل ضلع میں شمار کرتا ہوں۔ انھوں نے اب تک تین کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی تازہ ترین تحقیقی کتاب 'ہمہ آفتاب بینم: حسنین عاقب، تقدیر و تفسیر' ایک وقیع تحقیقی کتاب ہے۔ اس کتاب نے محسن ساحل کی شناخت ایک سنجیدہ محقق کے طور پر بھی مستحکم کردی ہے۔ اس سے قبل بھی وہ ادبی تحقیق پر مقالے لکھتے رہے ہیں۔

ایوت محل ضلع سے ایک نام یعقوب الرحمٰن صاحب کا بھی ہے جو ویسے تو کل وقتی محقق نہیں ہیں لیکن بہر حال انھوں نے جو بھی کام کیا ہے، وہ قابلِ قدر ہے۔ خصوصی طور پر دو کام نہایت اہم ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے مشہور زمانہ حمد ' آغاز ہمارے کاموں کا ہے نام سے تیرے جگ داتا ' کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے پتا لگایا کہ اس حمد کے خالق مرحوم ماسٹر محمد سلیم تھے جو آزادی سے قبل امراوتی کے اسکول میں مدرس تھے۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان ہجرت کرگئے لیکن ان کی یہ حمد برِ صغیر ہند و پاک میں نہایت مقبول و مشہور ہے۔ یہ نظم سورۃ فاتحہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ انھوں نے معروف مزاح نگار شیخ رحمٰن آکولوی کی شخصیت اور فن پر ایک ضخیم کتاب تحریر کی جو ان کی قابلِ قدر ادبی تحقیق کا موضوع تھا۔ لیکن یعقوب الرحمٰن صاحب کے بعد یہ منظر نامہ خالی دکھائی دیتا ہے۔ متذکرہ بالا اربابِ قلم کے علاوہ نئی نسل میں اس ضلع میں تخلیق کار یعنی شاعر تو بہت مل جائیں گے اور اکا دکا افسانہ نگار بھی لیکن تنقید و تحقیق کے میدان میں ان کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام کم از کم ہماری چشمِ بینا کو نظر نہیں آتا۔

بلڈانہ :

بلڈانہ ضلع میں کھام گاؤں، شیگاؤں، ناندورہ اور ملکاپور جیسے شہر اردو کی تعلیم اور اردو زبان و ادب کے لیے مشہور ہیں۔ کھام گاؤں سے ضیاء الرحمٰن شبلی نے بھی سیرتِ نبی پر دو جلدوں میں 'اکمل البشر' اور 'خیابانِ شبلی' جیسی اہم کتابیں تحریر کیں۔ اردو تحقیق کے زمرے میں ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں زیرِ طبع بھی ہیں۔ اس ضلع سے اردو اور فارسی زبان و ادب کی معروف شخصیت نور السعید اختر کا تعلق رہا ہے جن کے تحقیقی کام کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ کلیم ضیا صاحب کئی دہائیوں سے ممبئی میں مقیم ہیں لیکن ان کا تعلق بلڈانہ ضلع کے شہر ملکاپور سے ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب اور درس و تدریس میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی شائع کردہ کئی کتابیں اس بات کی گواہ ہیں۔ انھوں نے اردو تحقیق میں بھی کافی کام کیا ہے۔

محمد انوار احمد بلڈانہ ضلع کے شہر شیگاؤں میں جونیئر کالج میں فارسی کے مدرس تھے۔ ان کی دو تحقیقی کتابیں علامہ اقبال سے متعلق نہایت مشہور ہوئیں۔ ان دو کتابوں میں پہلی کتاب 'انوارِ اقبال' ہے جس میں اقبال پر تحقیقی مضامین شامل ہیں جب کہ دوسری کتاب ان کے انتقال سے ایک یا دو برس قبل ہی شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے 'اشعاتِ اقبال'۔ ظاہری بات ہے کہ دونوں کتابوں کا تعلق اقبالیات سے ہے اور اقبال سے متعلق تحقیقی مضامین پر مشتمل ہیں۔ یہ کتابیں اقبال سے متعلق کسی نئی تحقیقی جہت کی کشاد نہیں کرتیں لیکن بہر حال، علاقۂ ودربھ کے پس منظر میں اسے بھی غنیمت سمجھا جانا چاہیے۔ 'اردو میں آپ بیتی نگاری' بھی ان کی تحقیقی کتاب کا عنوان ہے۔ ایم آئی ساجد کا تعلق بلڈانہ ضلع کے مردم خیز شہر اور ماضی میں ودربھ کا علی گڑھ کہے جانے والے کھام گاؤں سے تھا۔ ان کی ادبی تحقیق پر مبنی کتاب 'ودربھ میں اردو شاعری' ان کی پی ایچ ڈی کا بھی موضوع تھا۔ ان دونوں اصحاب کو اس دارِ فانی سے کوچ کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اس لیے اس مقالے میں انھیں معاصرین کے زمرے میں ہی شامل کیا گیا ہے۔

چندرپور:

اس مقالے کی تمہید میں پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ چندر پور میں اردو تنقید و تحقیق کا شعبہ تقریباً خالی ہے۔ صرف ایک معروف اور اہم نام ڈاکٹر بانو سرتاج کا ہے۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر ایوت محل ضلع سے ہے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ چندر پور میں گزرا اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد چندر پور ہی میں سکونت پذیر ہیں۔ بانو سرتاج اردو اور ہندی، دونوں زبانوں میں نسائی ادب کی ایک نمایاں اور توانا آواز ہیں۔ وہ ریاستی ہندی اکادمی کی رکن بھی رہیں۔ ادبی تحقیق پر مبنی ان کی کتاب 'اردو شاعری میں بدیہہ گوئی' زیرِ اشاعت ہے۔

واشم:

واشم میں اردو شعر و نثر کا منظر نامہ بہت روشن کبھی نہیں رہا البتہ کبھی کبھی کچھ آوازیں اٹھتی رہی ہیں لیکن تحقیق و تنقید کا میدان تو بالکل ہی خالی رہا۔ دو دہائیوں قبل تک واشم آکولہ ضلع کا حصہ تھا لیکن بعد ازاں واشم خود ضلع بن گیا اور شہر کارنجہ اس ضلع کا تعلقہ بن گیا۔ موجودہ وقت میں کارنجہ (ضلع واشم) سے وسیم فرحت کارنجوی نے یاس

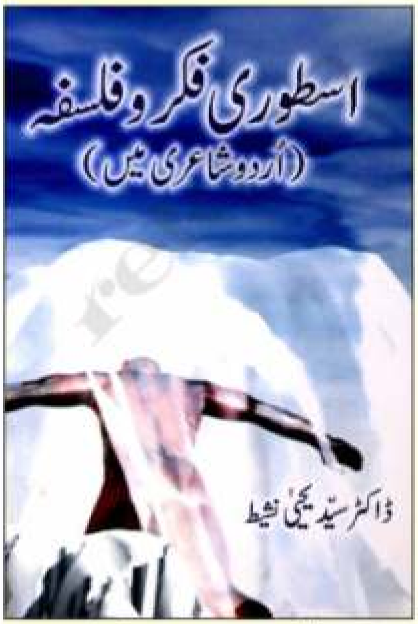

یگانہ چنگیزی پر تحقیقی کام کرکے اپنا نام واشم ضلع کے ادبی نقشے پر درج کروالیا ہے۔

وردھا، بھنڈارا، گڑھ چرولی اور گوندیا وہ اضلاع ہیں جہاں سے ہم تک اردو میں ادبی تنقید و تحقیق کی کسی کاوش کی اطلاع نہیں پہنچی۔

راقم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہے کہ اس نے ودربھ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے ایسے مقالہ نگاروں کو اس میں شامل نہیں کیا ہے جنھوں نے اردو ادب میں اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے تحریر کرنے کے بعد اپنا قلم طاق پر اٹھا کر رکھ دیا اور پھر اردو تحقیق کو سنجیدگی سے نہیں لیا ورنہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس علاقے سے اردو ادب کو اچھے اور محنتی محقق میسر آتے۔ ایسے لوگوں نے زندگی بھر ادبی تحقیق یا تنقید میں کوئی تحریر سپردِ قرطاس نہیں کی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مقالے میں جو نام شامل ہیں ہوسکتا ہے ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے نکل آئیں جنھوں نے ودربھ میں تنقید و تحقیق میں کام انجام دیا ہو لیکن میرے حافظے اور وسائل کی رسائی ان تک نہ ہوسکی ہو۔ البتہ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس مقالے کے لیے اپنے ذہن کو ذاتی تحفظات سے یکسر پاک رکھا اور جہاں کسی شخص کا کام تنقید و تحقیق کے زمرے میں معلوم ہوا، اس سے یا اس کے متعلقین سے رابطہ کرکے کوائف دریافت کیے اور انھیں شامل مقالہ کیا۔ اس مقالے میں ناموں کی شمولیت حتمی نہیں ہوسکتی کیونکہ بشری حافظہ فروگزاشت سے عبارت ہے اور یہ مقالہ نگار بھی بشری تقاضوں سے مبرا نہیں ہے۔

■

Khan Hasnain Aqib
Ghulam Nabi Azad College
Poosad - 445204 (Maharashtra)
Mob.:09423541874

محمد شاکر رضا

تاریخ عربی ادب کی مشہور کتابوں کا جائزہ

عربی ادب کی تاریخ سے مراد عربی زبان و ادب کا ارتقا اور اس کے مختلف ادوار اور زمانوں کی تاریخ ہے جس میں اس زبان کے نامور شعرا و ادبا کا تذکرہ اور ان کے ادبی شہ پاروں کو بیان کیا جاتا ہے، عربی ادب کی تاریخ میں اس کی ترقی اور تنزلی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی کبھی عربی ادب کا استعمال وسیع مفہوم میں بھی کیا جاتا ہے جس میں عربی و اسلامی تراث کا تذکرہ ہوتا ہے، (اس مقالے میں عربی ادب سے اس کا وسیع مفہوم مراد نہیں ہے)۔ عربی اور اسلامی قوموں کی سیاسی اور سماجی ترقی و تنزلی کے اعتبار سے عربی ادب کی تاریخ کو درج ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1. **دور جاہلی:** یہ دور پانچویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے جب عدنانیوں نے یمنیوں سے خودمختاری حاصل کی اور 622 عیسوی میں آغاز اسلام پر یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔
2. **آغاز اسلام تا عہد بنی امیہ:** یہ دور اسلام کے آغاز یعنی بعثت نبوی سے شروع ہو کر 132 ہجری میں عباسی حکومت کے قیام پر ختم ہو جاتا ہے۔
3. **دور عباسی:** یہ دور عباسیوں کی حکومت کے قیام سے شروع ہو کر 656 ہجری میں تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد پر ختم ہوتا ہے۔
4. **دور ترکی:** تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد پر اس دور کی ابتدا اور 1220 ہجری میں عصر النهضه یا انقلابی تحریک کے شروع ہونے پر اس کی انتہا ہوتی ہے۔
5. **دور حاضر:** محمد علی پاشا کے مصر پر حاکم ہونے سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اب تک یہی دور جاری ہے۔

عربی زبان کی تاریخ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، ہر محقق اس بحر بیکراں میں ڈوب کر موتیاں نکال سکتا ہے، اس میدان میں بے شمار علما اور اسکالروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ دور حاضر میں عربی زبان و ادب کی تاریخ پر جن اصحاب علم و فضل نے کتابیں تحریر کی ہیں ان میں جرمن مستشرق کارل بروکلمان (C. Brockelmmann)، جرجی زیدان، مصطفیٰ صادق رافعی، طہ حسین، محمود مصطفیٰ، عمر دسوقی، عُمر فرّوخ، حنا فاخوری، احمد حسن زیات، اور شوقی ضیف کافی مشہور ہوئے۔

کارل بروکلمان (1868-1956) کی پیدائش جرمنی کے شہر روستک میں ہوئی اس نے 1890 میں فرانس کی ستراسبرگ (Strasbourg) یونیورسٹی سے "ابن اثیر کی کتاب الکامل اور تاریخ طبری کے درمیان تعلقات" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، یوروپ کی جامعات میں کارل بروکلمان کو سامی علوم و فنون اور تاریخ تراث عربی میں بیسویں صدی کے نصف اول کا سرخیل اور امام تصور کیا جاتا ہے، اسے عربی کے علاوہ یونانی، لاطینی، عبرانی، سریانی، ترکی اور فارسی زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی، اس نے عربی زبان و ادب کا مطالعہ اسکول کے زمانے سے ہی شروع کر دیا تھا، بروکلمان نے عربی و اسلامی علوم و فنون پر متعدد کتابیں لکھیں، لیکن جس کتاب کی وجہ سے اسے شہرت دوام ملی وہ "تاريخ الأدب العربي" ہے، اصلاً یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، اس عظیم علمی و اسلامی امانت کو ڈاکٹر عبدالحلیم نجار، یعقوب بکر اور رمضان عبدالتواب نے عرب لیگ کی مالی اعانت سے عربی زبان میں چھ ضخیم جلدوں میں منتقل کیا، اس کتاب میں مشہور مصنفین اور مشرق و مغرب میں منتشر مختلف عربی و اسلامی علوم و فنون کی کتابیں، مخطوطات، شروح و حواشی اور دیگر تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

عرب علما و اسکالروں نے عربی ادب کی تاریخ پر اس سے پہلے جو کتابیں لکھیں ان کا مقصد تعلیمی ہوا کرتا تھا، ابن ندیم کی الفهرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور اس موضوع پر دیگر کتابیں ادبی ذوق و استعداد کو پروان چڑھانے میں معاون تھیں، لیکن مسلمانوں کی علمی، ادبی اور فکری میراث کی تحقیق و تنقید یا تحلیل و تجزیہ سے یہ کتابیں خالی تھیں، ان میں تاریخی تفصیلات، نحوی و فقہی مدارس کا پرزور بیان، شعرا کے ادبی معرکے اور ادبا و شعرا کے درمیان موازنہ و مقابلہ کی طویل داستان تو ملتی ہے لیکن اس بات کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے کہ عربی و اسلامی ادب نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا رول ادا کیا یا اس نے تہذیب و تمدن کے حوالے سے دنیا کو کیا دیا، یا حق اور بھلائی کی طرف انسانوں کی رہنمائی کرنے میں اس کا کیا حصہ رہا، مترجم کتاب ڈاکٹر عبدالحلیم نجار کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "عربی زبان کا قاری جب بھی عربوں کے علوم و فنون کو تلاش کرتا، یا یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ عربی زبان نے سائنسی علوم و فنون میں کیا خدمات انجام دی ہیں، یا دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں اس کا کیا رول رہا ہے، یا وہ دنیا کے کتب خانوں میں عربوں کے بکھرے ہوئے علمی و فکری ورثے کو اس غرض سے احاطہ کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ انھیں آیات بیّنات سمجھ کر ان پر فخر و مباہات کر سکے یا انھیں اپنی حیات و بقا کے لیے ذریعہ اور وسیلہ سمجھے، یا کم از کم یہ معلوم کر سکے کہ اس لازوال میراث سے دنیا کی زبانوں میں کیا ترجمہ ہوا ہے، اس پر کیا تحقیقی کام ہوئے ہیں جن کی وجہ سے علم و ادب کو مشرق و مغرب میں ترقی ملی۔ تو (قاری) کی دلی تمنا ہوتی کہ کاش عربی ادب کی تاریخ پر کارل بروکلمان کی کتاب عربی زبان میں ہوتی۔ یہ وہ اہم مقاصد ہیں جن پر عربی ادب کی تاریخ لکھتے وقت کارل بروکلمان کی نگاہیں تھیں اور اس کام کو انجام دیتے وقت مصنف پر جامع عالمی انسانی اقدار کا غلبہ تھا"۔

یہ اقتباس اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کارل بروکلمان نے جس وقت عربی ادب کی تاریخ لکھی شاید اس وقت اس موضوع پر اس طرز کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ لہٰذا بروکلمان کو اس زاویے سے ادب عربی کی تاریخ کے فن کا موجد اور مؤسس کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں اس نے عرب مصنفین کے اسلوب کے برخلاف عربوں کی میراث کو عقلی، فکری، علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے، اس کے بعد مشرق و مغرب میں جب بھی عربی ادب کی تاریخ لکھی گئی تو اس کتاب کے منہج کو نظر انداز نہ کیا جا سکا اور عربی ادب کی تاریخ کی تمام کتابیں اسی نہج پر لکھی گئیں۔ اس کتاب میں بروکلمان نے عربی ادب کے مختلف ادوار و اماکن اور ان میں مختلف علوم و فنون کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے جو عربی ادب کے آغاز سے عصر حاضر تک کو شامل ہے۔ یہ کتاب عربی اور اسلامی مطالعات کے حوالے سے انسائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی جلد میں ماضی میں تاریخ ادب پر لکھی گئی کتابوں، ان کے مناہج اور مصنفین کا تذکرہ ہے۔ دوسری جلد میں 750

سے 1000 صدی عیسوی کے درمیان برپا ہونے والے عرب انقلاب کو بیان کیا گیا ہے، جس میں دور عباسی میں بغداد، جزیرۃ العرب، شام اور مصر کے شعرا کا تذکرہ ہے، اس کے بعد مصنف نے نثری کاوشات کا ذکر کرتے ہوئے کوفہ، بصرہ، بغداد، ایران اور مشرقی ممالک میں عربی علوم وفنون کے ارتقا اور ان کے مختلف مدارس ومناہج پر گفتگو کی ہے۔ تیسری جلد میں تاریخ کی ابتدا، حدیث اور علوم حدیث، فقہ اور فقہی مسالک کا بیان ہے۔ چوتھی جلد میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ادب وثقافت اور علوم وفنون نے قرآن کریم سے کس طرح استفادہ کیا، اس کے علاوہ فقہ، تفسیر قرآن، عقائد، تصوف، فلسفہ، ریاضی، علم الافلاک، جغرافیہ، طب اور سائنسی علوم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں جلد میں 1010 سے 1258 کے درمیان فروغ پانے والے اسلامی ادب پر گفتگو کی گئی ہے جس میں مختلف ابواب کے ضمن میں شاعری، نثر، بلاغت اور لسانیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹی اور آخری جلد میں بروکلمان نے ملکوں، شہروں، شخصیتوں اور نبیوں کی تاریخ پر گفتگو کی ہے۔

اس طویل سفر میں بروکلمان سے کہیں کہیں لغزشیں بھی ہوائی ہیں جن کی طرف عرب علما واسکالروں نے نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان کی تصحیح وتصویب کا کام بھی کیا، لیکن اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ دنیا کے کتب خانوں میں تراث عربی واسلامی کے جو مخطوطے پڑے تھے ان کا بروکلمان نے پہلی بار تعارف پیش کرکے تنہا وہ کام کر دکھایا جو اس وقت کے بہت سارے حکومتی اور غیر حکومتی ادارے بھی نہ کر سکے۔

عصر حاضر میں عربی زبان وادب کے کارواں کو آگے بڑھانے میں جن شخصیتوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں جرجی زیدان (1861-1914) کا نام بھی شامل ہے۔

جرجی زیدان نے کارل بروکلمان کے طرز پر ''تاریخ آداب اللغة العربية'' کے نام سے ادبیات عربی کی تاریخ لکھی۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں تین سو ساٹھ صفحات ہیں جن میں دور جاہلی، آغاز اسلام اور اموی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز تمہیدی مقدمے سے ہوتا ہے جس میں زبان کے آداب، مصادر ادب، یونانی ادب اور اسلام سے قبل عربوں کے آداب کا تذکرہ ہے، جاہلی دور کے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے جاہلی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، آغاز اسلام کے دور میں عربوں کے آداب، شاعری اور خطابت میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں، شاعری کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا کیا موقف تھا، علوم وفنون میں کیا ترقی ہوئی، ان سب چیزوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ اموی دور میں اس زمانے کی خصوصیات، ادب میں ان کے اثرات، خطابت، خطبا اور انشا پردازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی دوسری جلد چار سو صفحات پر مشتمل ہے جن میں عصر عباسی کے آغاز یعنی 132 ہجری سے اس کے اختتام یعنی 656 ہجری تک کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے، عصر عباسی کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کی سیاسی اور سماجی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے اُن ادوار کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسری جلد بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے مگر یہ باقی جلدوں سے اس اعتبار سے الگ ہے کہ اس میں بے شمار علمی وادبی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اس جلد میں مصنف نے عباسیوں کے چوتھے دور کے علوم وفنون کے علاوہ مغل اور عثمانی دور کے علوم وفنون پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ چوتھی اور آخری جلد بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے جن میں دور حاضر کے عربی ادب کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

''تاريخ آداب اللغة العربية'' کو علمی حلقوں میں ادبیات عربی کے حوالے سے بڑی پذیرائی ملی، یہ کتاب ادبیات عربی کے میدان میں معلومات کا ایک خزانہ ہے کیونکہ مصنف نے اس کتاب کے ذریعے عربی زبان و ادب کے شہروں، زمانوں، شخصیتوں، امتیازی خصوصیتوں اور اسلامی تہذیب وثقافت کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے اور عربی زبان و ادب کے شائقین اور اسکالروں کو نئی دنیا سے متعارف کیا ہے۔

احمد حسن زیات بیسویں صدی میں عربی زبان و ادب کے حوالے سے بہت معروف نام ہے۔

احمد حسن زیات عصر حاضر میں عربی نثر نگاری کے امام تصور کیے جاتے ہیں، ان کا اسلوب بے حد آسان اور واضح ہوتا ہے، ان کے بعض معاصرین نے تو یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ زیات کا اسلوب عربی زبان میں بیسویں صدی کے مشاہیر مصطفی صادق رافعی کے اسلوب سے زیادہ واضح، محمود عقاد کے اسلوب سے زیادہ آسان اور طہ حسین کے اسلوب سے زیادہ مختصر ہوتا ہے۔ احمد حسن زیات نے اپنی تحریروں میں ادبی، تنقیدی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی زاویوں سے گفتگو کی ہے، انھوں نے مطلق العنانی اور جاگیردارانہ نظام پر کھل کر تنقید کرتے ہوئے جمہوریت کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے، آپ نے نام نہاد پارلیمنٹری کونسلوں کی بھی مذمت کی اور عوام کو آزادی کے لیے بیدار کیا، مستشرقین کے اس زعم کا بھی رد کیا ہے کہ اسلامی تہذیب وثقافت یونانی تہذیب وثقافت سے ماخوذ ہے، آپ نے ان دعووں کو بھی باطل قرار دیا جن میں کہا گیا ہے کہ مصری قوم دراصل فرعونی قوم ہے اور انھیں عرب سے خود کو الگ سمجھنا چاہیے۔ ادبی، تنقیدی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات پر اُن کے یہ مقالے اُن کی مشہور کتاب ''وحی الرسالة'' میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

احمد حسن زیات نے تاريخ الأدب العربي کے نام سے عربی ادب کی تاریخ 1916 میں لکھی، اس وقت تک یہ موضوع لوگوں کے درمیان اس قدر مشہور نہیں تھا۔ بنیادی طور پر انھوں نے یہ کتاب انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لیے تصنیف کی تھی، اس کے پہلے ایڈیشن میں خود مصنف نے کتاب کا ہدف بیان کرتے ہوئے لکھا تھا: ''ہم نے اس کتاب کو ادب کے اساتذہ و ماہرین کے لیے نہیں بلکہ نونہالوں کے لیے لکھا ہے اور تفاصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی ہے''۔

مصنف نے اپنی کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، ابواب سے قبل ایک مقدمہ کا اضافہ بھی ہے۔ مقدمہ میں ادب اور تاریخ ادب کی تعریف کی گئی ہے۔ ادب کی یوں تعریف کی گئی ہے: کسی زبان کے شعرا و مصنفین کا وہ کلام، جس میں نازک خیالات و جذبات کی عکاسی اور باریک معانی و مطالب کی ترجمانی کی گئی ہو، اس زبان کا ادب کہلاتا ہے، اور تاریخ ادب کی یوں تعریف کی گئی ہے: ''کوئی زبان کتنے متفرق ادوار سے گزری، مختلف زمانوں میں اسے ادبا وشعرا نے کس قدر نظم ونثر کا ذخیرہ دیا، اور وہ کون سے اسباب تھے جو اس کی ترقی یا تنزلی اور تباہی کے باعث بنے، یہی وہ علمی مباحث ہیں جنھیں ہم اس زبان کے ادب کی تاریخ کہتے ہیں''۔ مقدمہ ہی میں عرب کی بود وباش، ان کے طبقات، مشہور قبائل اور زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے سماجی، سیاسی، دینی اور عقلی احوال پر گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے باب کو مصنف نے عصر جاہلی کے لیے مختص کیا ہے، اس میں عربی زبان کے آغاز، نثر کی قسمیں، زمانہ جاہلیت کے مشہور مقررین، شعر کی انواع واصناف اور ان کی خصوصیات، شعرا کے طبقات اور ان کی شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں آغاز اسلام اور عہد بنی امیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں ادب اسلامی کے مصادر و مراجع، شعرا کے طبقات اور تقریر و ادب کے نمونے پر گفتگو ہے۔ تیسرے باب میں عصر عباسی کا احاطہ کیا گیا ہے، اس میں عصر عباسی میں عربی زبان کے ارتقا، نثر و انشا پردازی، شعر میں اس دور کی ثقافت وتمدن کے اثرات، شعری نمونے، شعرائے مولدین، شعرائے اندلس، عہد فاطمی میں مصری علوم وفنون، شعر و ادب، علوم شرعیہ، علوم عقلیہ، قصے کہانیاں اور عربی مقامات کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں سقوط بغداد کے

بعد ترکی دور اور اس زمانے کے مشہور شعرا و مصنفین کا تذکرہ ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں عربی ادب کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے وسائل و ذرائع، اس دور کے مشہور مصنفین، ادبا اور مقررین کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں مشکل و نامانوس الفاظ و تراکیب کے معانی و مطالب بھی بیان کردیے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ ادب عربی کے طالب علموں کے لیے بے حد مفید ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب مصر، عراق، شام اور ہندو پاک کی مختلف جامعات و کالجز میں داخل نصاب ہے اور اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن شاید ہو چکے ہیں۔ مصنفِ کتاب کی وفات یعنی 1968 تک ہی یہ کتاب 23 مرتبہ چھپ چکی تھی۔ ہر ایڈیشن کو مصنف نے پہلی سے بہتر بنانے کے لیے حذف و اضافہ سے کام لیا ہے۔

عمر فرّوخ (1906-1987) عربی زبان کے مشہور ادیب، مفکر، مؤرخ اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کی پیدائش لبنان کے ایک علمی گھرانے میں ہوئی، ان کے والدین کے علاوہ اس گھر کے دوسرے افراد بھی تعلیم یافتہ تھے، ایسی علمی اور پاکیزہ فضا میں عمر فروخ کی نشوونما ہوئی، بیروت کے مختلف اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی کا سفر کیا اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس دوران انھوں نے جرمنی کے علاوہ یوروپ کے دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور متعدد قابل اور نامور مستشرقین سے استفادہ کیا۔ عمر فروخ کو عربی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، انگلش، فارسی اور ترکی زبانوں پر بھی ملکہ حاصل تھا۔

عمر فروخ کی کتاب ''تاریخ الأدب العربي'' کو علمی اور ادبی دنیا میں بے پناہ مقبولیت ملی، اس کتاب کو سب سے پہلے بیروت کے مشہور پبلشر دار العلم للملایین نے 1965 میں شائع کیا۔ یہ کتاب چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد قدیم ادب یعنی دور جاہلی کے آغاز سے سقوط بنی امیہ تک پر مشتمل ہے، اس جلد میں مصنف نے دور جاہلی کی شاعری، زبان و ادب، سیاسی و ادبی خصوصیات، عرب قبیلوں کے مختلف لہجات اور ان کے طبعی و سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے، دور جاہلی کی ادبی جہتوں کی خصوصیات اس دور میں شاعری کے رواج، اس کی قدر و قیمت، شعرا کی اہمیت، شعر معلقات، شاعری کی خصوصیات اور نثر نگاری پر انھوں نے گفتگو کرتے ہوئے اس دور کے عظیم شعرا و نثر نگاروں پر اہم مباحث لکھے ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے آغاز اسلام کا ذکر کرتے ہوئے اس زمانے کی نثر نگاری اور شاعری کے بارے میں گفتگو کی ہے، پھر بنی امیہ کے دور میں شعر و نثر پر بات کرتے ہوئے مشہور شعرا اور خطبا کی سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری جلد میں چوتھی صدی ہجری تک عباسیوں کے مختلف ادوار اور ان کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسری جلد میں پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے ترکی حکومت کی تاسیس تک کے ادب کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد بلاد مغرب اور اندلس کے ادب پر مشتمل ہے جس میں فتح اسلامی کے آغاز سے ملوک الطوائف کے اختتام تک کے احوال پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں جلد میں مرابطین اور موحدین کے زمانے کے ادب پر بات کی گئی ہے۔ چھٹی جلد بلاد مغرب اور اندلسی ادب کے لیے مختص ہے جو ساتویں صدی کے آغاز سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک کے ادب کو شامل ہے، اس جلد میں بلاد مغرب و اندلس کی ثقافتی زندگی، ان شہروں میں اسلامی تمدن کے ارتقا اور نامور شعرا و ادبا جیسے ابن خلدون، معتمد ابن عباد، ابن زیدون وغیرہ کی حیات اور کارناموں کا بیان ہے۔ مصنف کا اسلوب یہ ہے کہ وہ مختلف ادوار کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور پر گفتگو کرتے ہیں، اس کے بعد اس زمانے کے شعرا و خطبا کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر ان کے شعری اور نثری نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہی اسلوب تمام جلدوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ آخری جلد کے مقدمے میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے اس ادبی، شعری، تاریخی اور سماجی ذخیرے کی تالیف کے لیے ہزاروں معلوماتی رکارڈ جمع کیے اور مشاہیر ادب کی تاریخ، سیرت، مصادر و مراجع یا دیگر معلومات کے لیے ہر بار انھوں نے ان رکارڈوں کی طرف رجوع کیا۔ اس سے اس کتاب کی تصنیف میں انھوں نے جو مشقتیں اٹھائی ہیں ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر حکومت کویت نے 1985 میں مصنف کو اعزازی سند سے نوازا۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ کتاب بے حد دلچسپ او رمواد کے اعتبار سے بے انتہا کارآمد ہے، عربی زبان کے طلبا کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

شوقی ضیف (1910-2005) عصر حاضر کے مایہ ناز محقق، ناقد اور ادیب ہیں، آپ نے ادب، بلاغت، نحو، تذکرہ، سفرنامہ، نثر و نظم اور تحقیق و تنقید میں گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں، آپ کی متعدد تصنیفات مصر اور دیگر ممالک میں داخل نصاب ہیں۔

شوقی ضیف نے معاصر ادب پر بھی لکھا، معاصر ادب پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ''الأدب العربي المعاصر في مصر'' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف نے اس کتاب میں جدید عربی ادب کے ارتقا کی تاریخ بیان کی ہے، 1850 سے 1950 تک کے سو سالہ شعر و ادب کی تصویر کشی کی اور معاصر ادب پر اثر انداز ہونے والے مختلف اسباب و عوامل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، شاعری کے ارتقا اور شعری رجحانات کی منظر کشی کی ہے، اس میں نثر کا ارتقا اور محافظین و جدت پسند مصنفین کے درمیان ہونے والے معرکوں کا تفصیلی تذکرہ بھی آگیا ہے، ان ادبا و شعرا کی کوششوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے عمدہ اور نفیس ادبی شہ پاروں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، مصنف نے یہ ساری باتیں بڑی گہرائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی ہیں جس کی وجہ سے یہ کتاب ایک عظیم ادبی ذخیرہ اور تاریخی شاہکار بن گئی ہے۔ تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اب تک اس کے ایک درجن سے زائد ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں، اسے مختلف کالجوں او ریونیورسٹیوں میں داخل نصاب کیا گیا، ہندوستان میں NET اور JRF کے امتحانات کی تیاری کے لیے اسے نہایت معاون اور مفید مانا جاتا ہے۔

صاحب تصانیف کثیرہ حنا فاخوری عصر حاضر میں عربی زبان و ادب کے عظیم مصنف، مؤرخ، ادیب اور محقق شمار کیے جاتے ہیں۔

حنا فاخوری کی کتاب 'تاریخ الأدب العربي' ساڑھے گیارہ سو صفحات اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عربوں اور عربی زبان کے ابتدائی حالات، ادب جاہلی اور شعر معلقات کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں عہد خلفائے راشدین اور عہد بنی امیہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس میں عربوں کی زندگی میں اسلام کے اثرات، خلفائے راشدین اور بنی امیہ کے عہد کی شاعری کی اہمیت، شاعری اور نثر نگاری کے اصناف اور اس زمانے کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں عہد عباسی کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس میں عہدِ عباسی کی شاعری، شاعری میں انقلابی و تجدیدی رجحانات اور نثر نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے، مشہور شعرا اور ادبا کی سوانح اور ان کی خدمات پر گفتگو کی گئی ہے، اور عہد عباسی میں علوم وفنون کے فروغ اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس دور میں شعر و ادب میں پیدا ہونے والے جمود و تعطل اور اس کے اسباب و عوامل کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں اندلسی ادب کا تذکرہ ہے جس میں فتح اندلس، اندلس کی تہذیب و ثقافت، شاعری، موشحات، مشہور ادبا و شعرا اور اندلس میں علوم وفنون کی ترقی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں باب میں ترکی دور کا بیان ہے، اس باب میں ترکی ادب میں شاعری، نثر نگاری اور اس کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں موجودہ دور پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں موجودہ دور کا تعارف، اس دور

میں عربوں کی بیداری کے اسباب و وسائل، شعری خصوصیات، نثری اصناف اور موجودہ دور کے مشہور شعراو ادبا پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیز، کالجز اور دینی مدارس میں عرصۂ دراز سے عربی ادب اور تاریخ عربی ادب پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہے، اس مضمون کی تعلیم وتعلم کے لیے عربی کتابوں پر اعتماد کیا جاتا ہے، عربی کی ان کتابوں سے استفادہ کرنا عربی کے اساتذہ اور طلبا کے لیے تو آسان ہے مگر دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبا کے لیے ان کتابوں کا سمجھنا اور ان سے استفادہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضرورت پیش آئی کہ عربی ادب کی تاریخ اردو زبان میں لکھی جائے تاکہ اردو داں حضرات جو عربی ادب اور اس کی تاریخ سے شغف رکھتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ اب تک عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر متعدد کتابیں اردو زبان میں لکھی جاچکی ہیں، عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر اردو زبان میں جو کتابیں میرے محدود مطالعے میں آئیں، ذیل میں مختصراً ان کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

اردو زبان میں عربی ادب کی تاریخ پر مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی کی ''تاریخ ادب عربی'' ایک اہم کتاب ہے جو مصری ادیب احمد حسن زیات کی مشہور کتاب ''تاريخ الأدب العربي'' کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے پاکستان سے شائع کیا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی (1987-1919) عربی اور اردو کے مشہور عالم اور باکمال مدرس تھے، آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں اور درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے۔ البتہ یہ ترجمہ عام طور پر دستیاب نہیں تھا، لہٰذا طلبا کی سہولت کے لیے ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی (لکچرر شعبۂ عربی و فارسی الہٰ آباد یونیورسٹی) نے اسی ترجمہ کو بنیاد بنا کر اس کتاب کی تلخیص کی ہے، اردو ترجمہ میں چند جدید نثر نگاروں، ادیبوں، خطیبوں اور شعرا کا تذکرہ نہیں تھا، اُن کا ترجمہ طفیل صاحب نے اصل کتاب سے کرکے اس تلخیص میں شامل کردیا ہے گویا یہ اس ترجمے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ترجمے کا اسلوب انتہائی واضح اور آسان ہے، ترجمے میں سلاست اور شگفتگی ہے اور یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے عربی ادب کی تاریخ پر اصول کتاب کا یہ بہترین ترجمہ ہے۔

اردو داں شائقین تاریخ و ادب کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، تاریخ ادب عربی میں اس قدر جامع، مختصر اور آسان کتاب اردو زبان میں موجود نہیں ہے جس میں عربی زبان کے آغاز سے دور حاضر تک کے ادبا و شعرا کا جائزہ لیا گیا ہو۔

اس موضوع پر ڈاکٹر سید ابوالفضل (1963-1914) سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے ''تاریخ ادبیات عربی'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جسے 1955 میں پہلی بار ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شائع کیا، بعد میں یہ کتاب انجمن فیضان ادب حیدرآباد سے شائع ہونے لگی، اس کا گیارہواں ایڈیشن میرے پیش نظر ہے جو مارچ 2009 میں شائع ہوا۔ یہ کتاب پونے تین سو صفحات اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں جزیرۃ العرب، عرب قوم اور ادب جاہلی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں آغاز اسلام اور عہد بنی امیہ پر گفتگو ہے، تیسرے باب میں عصر عباسی کا تفصیلی ذکر ہے، چوتھا اور پانچواں باب عصر مغلیہ اور عصر عثمانی پر مشتمل ہے، چھٹے باب میں عصر جدید کا ذکر ہے اور ساتویں باب میں نئے ادب اور جدید ادبی رجحانات کا ایک ہلکا سا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو ایک طویل زمانے تک ادب عربی کی امہات الکتب کا مطالعہ کرنے کے بعد بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا ہے، عربی ادب کی تاریخ پر انھوں نے بڑے اہم مباحث تحریر کیے ہیں جن سے اساتذہ وطلبا کی ایک بڑی تعداد نے برسوں استفادہ کیا۔ خاص طور سے حیدرآباد میں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، یہاں کے متعدد علمی اداروں میں یہ کتاب شامل نصاب ہے۔

اردو زبان میں ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی کتاب 'عربی ادب کی تاریخ' اس موضوع پر بے حد اہم مانی جاتی ہے، انھوں نے اردو داں طبقہ اور عربی زبان و ادب کے طلبا و اساتذہ کے لیے اس کتاب کو تفصیل کے ساتھ چار جلدوں میں مرتب کرنے کا خاکہ بنا کر کام شروع کیا تھا، جس میں زمانۂ جاہلیت، صدر اسلام، عہد بنی امیہ، عباسیوں کے مختلف ادوار بشمول اندلس، عبوری زمانہ، موجودہ زمانہ اور ہندوستانی عربی زبان وادب پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کا منصوبہ تھا۔ اس خاکہ کے مطابق کتاب کی پہلی جلد 1979 میں شائع ہوئی جس میں زمانۂ جاہلی کے احوال اور اس کے شعر وادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ طلبا، اساتذہ اور اردو داں حلقہ میں اسے بڑی مقبولیت ملی اور قلیل عرصہ میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ دوسری جلد دس سال کے بعد 1989 میں شائع ہوئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے پر مشتمل ہے، جس میں اس عہد کی امتیازی خصوصیات، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی وتمدنی حالات، اس عہد میں نشوونما پانے والے علوم وفنون، شعر وادب اور ان کے ممتاز فنکاروں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی تیسری جلد سنہ 2000 میں شائع ہوئی جو عہد بنی امیہ پر مشتمل ہے، اس جلد میں عہد بنی امیہ کے تاریخی احوال، اس عہد کے علمی، ادبی اور فنی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور تمام اصناف ادب کے فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، زبان و لغت کے ماہرین اور مشاہیر کا مفصل تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی مذکورہ تینوں جلدیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے بارہا شائع ہوچکی ہیں۔

ڈاکٹر شمس کمال انجم (صدر شعبۂ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں وکشمیر) نے جدید مصری ادب پر ''جدید عربی ادب'' لکھی جو ''الأدب العربي المعاصر في مصر'' کا اردو ترجمہ ہے، 'جدید عربی ادب' تین سو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے 2017 میں جدید ایڈیشن کے طور پر شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ترجمہ کیا ہے، ترجمہ سے قبل انھوں نے عربی ادب کے مختلف ادوار کی مختصر جھلک بھی پیش کی ہے، کتاب پر عربی اور اردو زبان کے مشاہیر کے تاثرات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب اردو داں طبقہ خصوصاً عربی ادب سے شغف رکھنے والے حضرات کے استفادہ کے لیے لکھی ہے۔ اس کتاب میں جدید مصری ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جو 1850 سے 1950 تک کے سو سالہ شعر وادب کی تصویر کشی اور معاصر ادب پر اثر انداز ہونے والے مختلف اسباب وعوامل پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں، اردو اور عربی دونوں زبانوں پر دسترس کے علاوہ ترجمہ کا ذوق بھی رکھتے ہیں، انھوں نے بے حد دلکش انداز میں ترجمہ کیا ہے، قاری کو کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اصل کتاب نہیں بلکہ اس کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔

ایک دوسری کتاب لاہور سے محمد کاظم نے ''عربی ادب کی تاریخ'' کے نام سے لکھی جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے 2004 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ایک تمہید اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں جاہلی، آغاز اسلام، اموی، عباسی، اندلسی، فاطمی، ترکی اور موجودہ دور کے سیاسی، سماجی اور تمدنی احوال وکوائف، عربی زبان وادب کی اہم شخصیات اور مختلف اصناف ادب پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب اردو داں حضرات خصوصاً ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو عربی زبان کا علم نہیں رکھتے، مگر عربی ادب کی تاریخ سے انھیں دلچسپی ہے اور اس سے وہ واقف ہونا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب اردو کے کتب خانے میں ایک اہم اضافہ ہے، اس کے عمدہ اسلوب اور قیمتی مواد سے ادب کے شائقین کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

■

Dr. Mohammed Shakir Raza
Asst Prof, Dept of Arabic
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032 ,Mob.:9704967694
Email: shaikir@manuu.edu.in

محمد اکمل خان

علی گڑھ میں اردو سفرنامہ نگاری

اردو میں سفرنامے کی روایت عربی اور فارسی کی مرہونِ منت ہے۔اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف حسین خاں کمبل پوش کے 'عجائباتِ فرنگ' کو قرار دیا جاتا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے میں لندن کی داستان ہے اور اس میں وہاں کی طرزِ معاشرت کے علاوہ دیگر تفصیلات کا بیان ملتا ہے۔اس کے بعد بہت سے سفرنامے لکھے گئے، جن سے اردو میں سفرنامے کی روایت کی توسیع ہوئی اور سفرنامے میں کچھ نئے رنگ و نور داخل ہونے لگے۔

علی گڑھ نے سفرنامہ کی توسیع و تجدید میں اہم کردار ادا کیا۔اس سلسلے میں سب سے پہلا نام تو خود بانی درسگاہ سرسید احمد خاں کا ہے۔ جنھوں نے 'مسافرانِ لندن' کے نام سے اپنا سفرنامہ تحریر کیا اور اپنے مشاہدات و تجربات پر مشتمل ایک ایسی کتاب لکھی، جس سے نہ صرف لندن کی تہذیب و معاشرت کا علم ہوتا ہے بلکہ سرسید کو اس سفر سے ایک نئی روشنی اور نئی تحریک بھی ملی اور لندن کے اس سفرنامے نے نہ صرف ان کے طرزِ فکر و احساس کو بدلا بلکہ ان کے اندر ایک ایسا شعور اور جذبہ پیدا کر دیا، جس کی وجہ سے انھوں نے جدید تعلیم پر زور دیا اور انگلستان کے نظامِ تعلیم کو ہندوستان میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی۔اگر یہ کہا جائے کہ سرسید نے لندن کا سفر نہ کیا ہوتا تو ان کے ذہن میں کیمبرج یونیورسٹی کے طرز پر ایک ادارہ تعمیر کرنے کا خیال نہ پیدا ہوا ہوتا۔

سرسید کا سفر دراصل ایک بڑی ذہنی تبدیلی کا باعث بنا اور اسی سفر کا رہینِ منت ہے وہ تعلیمی تصور جس کی بنیاد پر آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی عظیم درسگاہ قائم ہے۔سرسید کا رسالہ 'تہذیب الاخلاق' بھی اسی سفرنامے کی ایک کڑی ہے جس نے مسلمانوں کے ذہن و فکر کی تبدیلی میں ایک اہم رول ادا کیا۔سرسید کے اس سفرنامے میں ان کے سوز دروں اور اپنی قوم کے تئیں مکمل فکرمندی کا جذبہ نظر آتا ہے۔انھوں نے یہ سفر بلا مقصد نہیں کیا تھا بلکہ وہاں کے احوال و نظام کی تفہیم کے لیے کیا اور پھر وہاں کے نظامِ تعلیم کو ہندوستان میں رائج کرنے کا منصوبہ بنایا۔سرسید نے سفرنامے میں وہاں کی عمارتوں سے زیادہ علمی احوال و مراکز پر روشنی ڈالی اور ایک طرح سے انگلستان سے تعلیمی تحریک حاصل کی۔ان کا مقصد وہاں کی سیاحت نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کی عمارتوں کی تفصیل کا اندراج کرنا تھا بلکہ انگریزوں کی ترقی کا راز معلوم کرنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ سرسید کے اس سفرنامے میں نہ ادبی چاشنی ہے اور نہ ہی بے جا تخیل آرائی بلکہ وہ پختہ حقائق ہیں جن کے ذریعے کسی بھی قوم کو ایک نئی روشنی مل سکتی ہے۔ان کے سفرنامے میں ایسا محسوس نہیں ہوتا جیسے وہ قاری کو لندن کی سیاحت سے محظوظ کرا رہے ہوں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قاری کو ایک نئے مشن سے آگاہ کر رہے ہوں۔

سرسید کے اس سفرنامے میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے ذہنی نظام کا موازنہ ہے اور یہ احساس بھی کہ تعلیمی سطح پر انگریز ہندوستانیوں سے بہت آگے ہیں اور ان سے ہندوستان کو روشنی حاصل کرنی چاہیے۔یہ ایک بامقصد سفرنامہ ہے۔جب یہ سفرنامہ شائع ہوا، تو اس کے خلاف متشدد مسلمانوں کی جانب سے ردِعمل سامنے آیا اور یہ بات مشہور کر دی گئی کہ لندن جا کر سرسید 'عیسائی' ہو گئے ہیں۔سرسید جستہ جستہ اپنے سفر کے احوال لکھتے تھے۔وہ شروع میں اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' میں شائع ہوتے رہے اور پھر بعد میں 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوئے۔اس سفرنامے کو مکمل طور پر مولوی اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا پھر بھی یہ سفرنامہ مکمل اور مربوط نہیں ہے۔

سرسید کے اس سفرنامے سے بہت ساری حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔حالی نے گویا سرسید کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ان کے لندن کے سفر کا ارادہ سیر و سیاحت کی غرض سے نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے قوم کی ترقی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:

''ان کے اصل مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی سے بڑی چیز اور چھوٹی سے چھوٹی چیز جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی، اس پر غور کیا اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا۔تعلیم نسواں کو غور سے دیکھا اور اس تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا، اس کو نگاہ میں رکھا۔''

(الطاف حسین حالی، حیات جاوید،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 1999، ص858)

اس سفر سے انھیں مادری زبان کی اہمیت کا بھی

اندازہ ہوا، جسے انھوں نے اپنے سفرنامے میں بھی لکھا ہے۔ انھوں نے انگلستان کے نظام تعلیم اور وہاں رائج مادری زبان میں طریقۂ تعلیم سے تحریک پا کر لکھا:

''پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں، وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانہ کی یادگاری کے لیے کھود دیے جائیں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کی اسی کی زبان میں نہ دیے جائیں گے، تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔''

(محمد اسماعیل پانی پتی، مسافران لندن، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1961، ص 198-197)

سرسید کے اس سفرنامے میں جہاں انھیں ہندوستانیوں کی کمتری کا احساس ہوا، وہیں انگریزوں کی برتری کا بھی پتہ چلا۔ سرسید احمد خاں کے اس سفر نے ان کے اندر جذبے کی روشنی پیدا کی، ان کے ہاتھ میں ایک نئے عزم اور ایک نئے مشن کی مشعل تھما دی۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا کا فیصلہ بھی اسی سفر کا رہین منت ہے۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستان کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانوروں کو قابل تعظیم یا لائق ادب کے سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے ساتھ اخلاقی اور بداخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے۔ بس ہمارا کچھ حق نہیں ہے (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔'' (ایضاً، ص 184)

سرسید کے اس سفرنامے کو موجودہ تنقید کے معیار پر پرکھا جائے تو یقیناً اسے اچھا سفرنامہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس میں داستان یا ناول کی طرح پرکشش منظر نگاری نہیں ہے بلکہ ایک مقصد پنہاں ہے اور قاری کو معلومات کے خزانے سے آگاہ کرنا ہی اس کا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک تحریک کو جنم دینا بھی ہے اور باطنی سطح پر پڑھنے والے کے ذہن و احساس کو مرتعش کر کے ایک ایسے مشن سے آگاہ کرنا ہے، جس میں قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

اسی طرح سرسید کا 'سفرنامۂ پنجاب' بھی ہے۔ حالانکہ یہ تقاریر کا مجموعہ ہے اور اسے مکمل طور پر سفرنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی حیثیت سفرنامے سے زیادہ ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ اس میں سرسید کے وہی خیالات ہیں، جو قوم کی تعلیم اور ترقی سے متعلق ہیں۔ اس میں انگریزی تعلیم کی افادیت اور مسلم قوم کی تنزلی کے حوالے سے سرسید کے جذبات و خیالات مندرج ہیں۔ چونکہ یہ تقاریر پنجاب میں کی گئی تھیں اس لیے اسے 'سفرنامۂ پنجاب' کا نام دے دیا گیا ہے۔

سرسید کے یہاں جو معروضیت اور منطقیت ہے اور تخیل کے بجائے حقیقت بیانی کا جو جذبہ موجود ہے، وہی ان کے ہم عصر سفرنامہ نگاروں اور ان کے رفقا کے سفرناموں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں علی گڑھ سے وابستہ سرسید کے معاصرین اور ان کے احباب میں جس نے بھی سفرنامے لکھے ہیں، ان میں تخیل کی رنگ آمیزی سے زیادہ حقیقت آفرینی اور جذباتیت کے بجائے سنجیدگی اور مقصدیت نمایاں ہے۔ ان سفرناموں سے نہ صرف قوم میں بیداری آئی بلکہ ان سفرناموں نے قومی و ملی شعور کو بیدار کیا۔ ان سفرنامہ نگاروں کے پیش نظر اپنی تخلیقی جولانیوں کی نمائش نہیں تھی بلکہ ان حقائق کا اظہار تھا، جن سے آگاہ ہوئے بغیر پوری قوم انحطاط کی دلدل میں دھنسی ہوئی اور خوابِ خرگوش میں محو رہتی۔ یہ سفرنامے انھیں خواب سے بیدار کرنے کا ایک ذریعہ اور ان کے خفتہ ذہن و ضمیر کو جگانے کا وسیلہ بھی بنے۔

حاجی سمیع اللہ خاں بہادر کے سفرنامے کا نام بھی 'سفرنامۂ لندن' ہے اور اس سفرنامے کا بھی وہی مقصد ہے، جو سرسید کے سفرنامے کا ہے۔ یہ سفرنامہ پہلے 'تہذیب الاخلاق' کے دو شماروں میں شائع ہوا اور پھر کتابی شکل میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ سفرنامہ کی افادیت، اہمیت اور معنویت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کنور جوالا پرشاد بہادر نے 1882 میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے کلکتہ سے شائع کیا۔ سرسید کے رفیق کار مولوی سمیع اللہ نے لندن کا یہ سفر انگلستان کی اعلیٰ تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے اور وہاں کی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لیے کیا تھا اور اس کے پیچھے بھی یہی ایک جذبہ کارفرما تھا کہ ہندوستانیوں میں انگلستان کے طرز پر اعلیٰ تعلیم کا شوق پیدا کیا جائے۔ گویا سرسید اور سمیع اللہ کے سفرناموں کا بنیادی مقصد تعلیمی ترقی سے جڑا ہوا تھا۔

کنور عبدالغفور خان کا 'سفرنامۂ عالم' اگرچہ اب دستیاب نہیں ہے لیکن یہ پہلا سفرنامہ ہے جو 34 ممالک کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ زبان و بیان اور مواد کے اعتبار سے انتہائی متاثر کن ہے۔ امریکہ، آسٹریلیا، جرمنی، اسپین تمام ممالک کا احوال نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کنور صاحب کو زبان و بیان پر مکمل عبور تھا اور ان کے اسلوب میں روانی بھی تھی۔ ان کے سفر کا مقصد شاید مختلف قوموں کی تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی صورت حال سے آگہی حاصل کرنا تھا اور اس آگہی کے ذریعے وہ ہندوستانی قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ حاجی مولوی محمد اسحاق خان مائل کے 'سفرنامۂ مائل' اور راحل شیروانی بنت حاجی عیسیٰ خان شیروانی، رئیس دتاولی علی گڑھ کی 'زادالسبیل' اور 'رحلة الراحل' کے سفرنامے کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ سفرنامے حج اور زیارت سے متعلق ہیں۔ اس طرح کا ایک اور سفرنامہ محمد زبیر کا بھی ہے، جس کا نام 'چند دن حجاز میں' ہے۔ اس میں بھی زبان و بیان کا حسن ہے۔ اسی ضمن میں سید علی نقوی کے سفرنامۂ حج کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے بعد بیسویں صدی کے آغاز سے ہی علی گڑھ میں سفرنامہ نگاری کو ایک نئی جہت ملی اور سفرنامے کے فنی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے سفرنامے تحریر کیے گئے۔ یہ سفرنامہ لندن کے علاوہ دوسرے ممالک اور مراکز سے متعلق

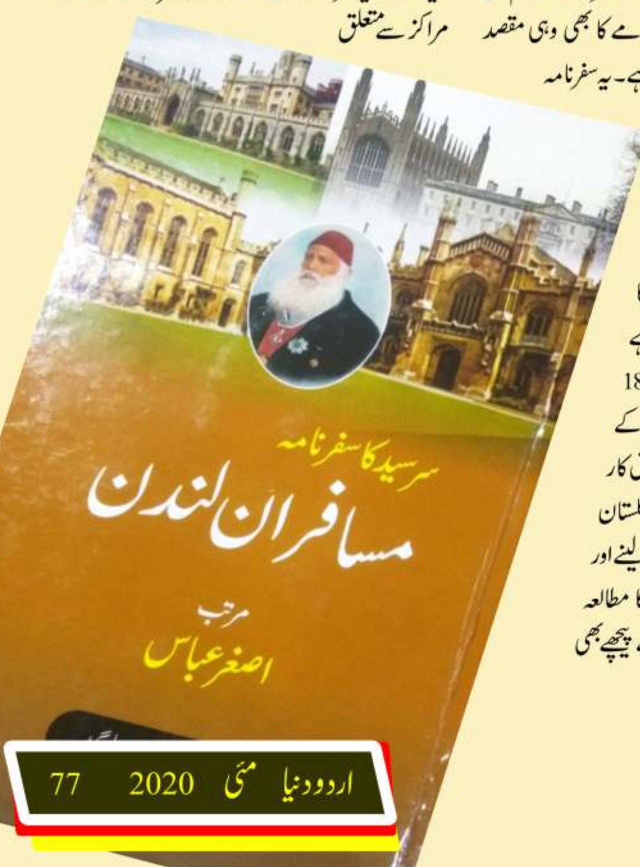

تھے۔ گویا سر سید کے یہاں لندن کو جو مرکزیت حاصل ہے، اس مرکزیت سے انحراف کرتے ہوئے دوسرے ممالک کو بھی محور بنایا گیا اور وہاں کی صورت حال کے مشاہدے کے لیے سفر کیے گئے اور پھر سفرناموں کی تشکیل عمل میں آئی۔ پروفیسر ثریا حسین کا سفرنامہ 'پیرس و پارس' اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ ثریا حسین کا تعلق شعبۂ اردو سے ہے اور انھوں نے 1979 سے 1984 کے درمیان شعبے میں صدر کی حیثیت سے اردو ادب کی خدمات کے فرائض انجام دیے۔

ثریا حسین کا سفرنامہ 'پیرس و پارس' کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے نام میں جو حسن ہے، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 'پیرس و پارس' گویا مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا وصال ہے۔ یہ جدید و قدیم دو متضاد لہروں اور سمتوں کا حسین امتزاج بھی ہے۔ گویا ثریا حسین نے 'پیرس و پارس' کے ذریعے دو مختلف اور متضاد تہذیب و تمدن سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں کے تضادات اور مماثلات کو بھی روشن کیا ہے۔ ثریا حسین کے اس سفرنامے میں ان کی مشاہداتی قوت اور تجزیاتی صلاحیت کے سارے نقوش موجود ہیں۔ انھوں نے تمام تر جزئیات کا مطالعہ نہایت باریک بینی سے کیا ہے اور اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں سبھی کو شامل کیا ہے۔

ثریا حسین کا یہ سفرنامہ بنیادی طور پر ان کے پیرس کے قیام پر محیط ہے۔ انھوں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، جس طرح کے افراد سے ملاقاتیں ہوئیں، جیسے جیسے مقامات مشاہدے میں آئے، جیسے جیسے افکار و خیالات کے جزیروں سے آشنائی ہوئی، ان سب کو انتہائی خوبصورت پیرایے میں ڈھال کر اسے سفرنامے کی شکل عطا کر دی۔ اس میں جہاں پیرس کی تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی صورت حال سے آشنائی ہوتی ہے وہیں وہاں کے رنگ و بو سے بھی ذہن کو نئی روشنی ملتی ہے۔ انھوں نے ہر چیز کو انتہائی تحقیقی نظر سے دیکھا اور اسے اس طرح بیان کر دیا کہ پیرس کی پوری تاریخ اور تہذیب اجمالی طور پر کتاب میں سمٹ آئی ہے۔ اس کے لیے جس دقت نظر اور تجزیاتی نگاہ کی ضرورت ہے، وہ ان کے پاس موجود ہے۔ وہاں کے دریا، محلات، مصوری اور گیت، غرض یہ کہ ہر چیز کا ذکر تمام تر تفصیلات کے ساتھ موجود ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ کتاب محض جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے، بلکہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس ملک کا سفر کر رہے ہیں اور ایک ایک ذرے سے آشنا ہو رہے ہیں۔ وہاں کے جتنے تاریخی مقامات ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔ چونکہ پیرس مصوری کا مرکز رہا ہے، تو وہاں کے مصوروں کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ شہر دل ربا سے ایک داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ شہر دل ربا پیرس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

''رات کے دو بجے پیرس سے پندرہ میل دور 'اورلی' ایئرپورٹ طیارہ کی کھڑکی سے دیکھا، دور دور تک پیرس چمک رہا تھا۔ دل کی شکل یہ سحر آفریں، روشنیوں کا شہر! پیرسیائی نام کے کیلٹک قبیلہ نے پہلی صدی قبل مسیح دریائے سین کے کنارے ایک گاؤں آباد کیا جو لوٹیشیا کہلاتا تھا، بعد میں اس جگہ رومن سپاہیوں نے اپنی چھاونی چھائی۔ تیسری صدی عیسوی میں جرمن قبائل کے حملوں سے بچنے کے لیے لوٹیشیا کے باشندے دریائے سین کے جزیروں پر چلے گئے۔ ان کی یہ بستی بہت جلد پیرسیوں کا شہر کہلانے لگی اور اس قبیلہ نے Sle De La Cite جزیرے کے شہر کو قلعہ بند کیا (اسی جزیرہ پر آج نوتردام کا کلیسا اور پولیس کا ہیڈ کوارٹر موجود ہے)۔ پیرس بہت جلد ایک اہم مسیحی مرکز بن گیا اور یہاں بہت سی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ کئی بادشاہوں نے اس شہر کو اپنی راجدھانی بنایا۔ نویں صدی میں نارمنڈین حملہ آور اپنے جہاز لے کر سین پر اترے لیکن جزیرہ کے قلعے کو فتح نہ کر پائے۔''

(پروفیسر ثریا حسین، پیرس و پارس، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1981، ص 15)

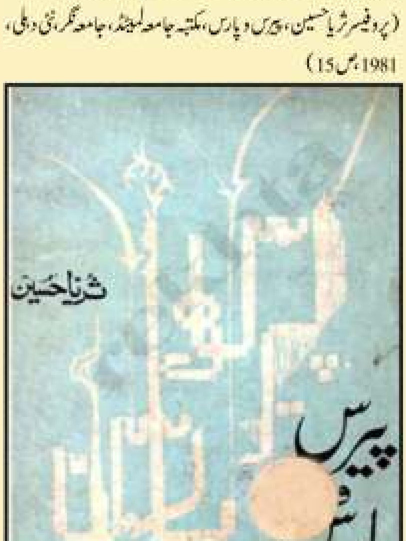

ثریا حسین نے اس سفرنامے میں بہت سے ادیبوں کا ذکر بھی کیا ہے، جن میں موپاساں، برگ ساں، موزاٹ اور فرائڈ شامل ہیں۔ ان ممالک میں ہندوستانی طلبا سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ وہ حصہ جو پیرس پر مشتمل ہے اس میں وہ ہر چیز کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اس سفرنامے میں پیرس کے سیاسی حالات پر بھی گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ وہاں کے ادبا قومی، عالمی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر ضرور پیش کرتے ہیں، وہ معاشرے سے علاحدہ نہیں ہیں بلکہ معاشرے کا ضمیر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ صورت حال نہیں ہے، یہاں زیادہ تر ادیبوں کے لب سلے ہوئے ہوتے ہیں اور خاموشی میں ہی وہ اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ عصری سیاسی مسائل میں ان کی دلچسپی برائے نام ہوتی ہے، جبکہ فرانس کے معاملات اس سے مختلف ہیں۔

اس سفرنامے میں پارس کا ذکر بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے اور وہاں کی تاریخ کو چھوتے ہوئے آج کی صورت حال کا نہایت خوبصورت جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں کے مختلف مقامات کا ذکر ان کی جزئیات کے ساتھ ہے۔ انھوں نے شاہ عباس کبیر کے شہر کا ذکر بھی کیا ہے یعنی اصفہان، جو نصف جہان کہلاتا تھا۔ یہیں انھوں نے قصر چہل ستون بھی دیکھا، جو شاہان صفویہ کی جائے رہائش تھی، یہاں وہ ندی ہے جس کا ذکر فارسی شعر و ادب میں آیا ہے یعنی زندہ رود۔ انھوں نے شیراز کا بھی ذکر کیا ہے، جہاں حافظ و سعدی مدفون ہیں۔ انھوں نے اس علاقے کی رومانیت اور دلکشی کا اس طرح بیان کیا ہے:

''شیراز پہنچے۔ یہ شہر حافظ اور سعدی کے پرستاروں کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزار سعدی کو بھی دوبارہ تعمیر کروایا گیا تھا، جس کے اطراف میں وسیع باغ تھا۔ یہ پورا علاقہ سعدیا کہلاتا ہے۔ مقبرے کی دیواروں پر بوستاں کے اشعار اور گلستاں کی حکایتیں کندہ ہیں۔''

(ایضاً، ص 30-29)

انھوں نے فردوسی کے شہر طوس کا بھی ذکر کیا ہے، جو ایران کے قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ انھوں نے ماژندراں، گل افیون کے کھیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ استنبول اور مصطفی کمال پاشا وغیرہ کا ذکر بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بغداد، نجف اشرف، الکاظمیہ، المدائن اور سلوسیہ، قصرہ اور کوہ بے ستوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

ثریا حسین کا یہ سفرنامہ نہایت معلوماتی اور مشاہداتی ہے۔ انھوں نے مختلف ممالک کے اسفار کے دوران جو کچھ بھی دیکھا ہے اور جو چیزیں انھیں تحیر خیز یا معلوماتی لگیں، ان کا ذکر کر دیا ہے۔ ان کی زبان میں سلاست اور وضاحت بھی ہے اور وہ تہذیب و شائستگی بھی، جو اردو زبان کی خصوصیت ہے۔ ایسا کہیں نہیں لگتا کہ انھوں نے قاری کو بیزار کیا یا اپنی زبان و بیان سے اس کے ذہن کو مکدر کیا

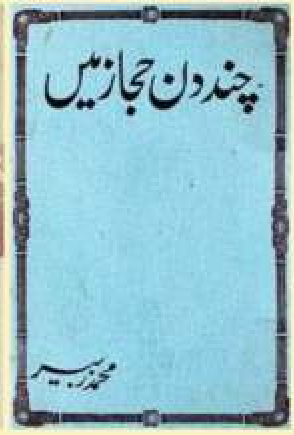

ہے۔ان کی نثر بڑی خوبصورت ہے اور منظر نگاری بھی نہایت دلکش ہے۔مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہاں جب میں اور کیتھرین پہنچے،تو پارٹی عروج پر تھی۔لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے۔آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ میزیں فرانسیسی کھانوں اور مشروبات سے لدی تھیں۔ جارڈن کی لڑکی ہالہ وہاں ہماری منتظر تھی،کئی طالب علموں سے تعارف ہوا۔سب ایک برادری معلوم ہو رہے تھے۔ حالانکہ مشرق و مغرب کے دور دراز ملکوں سے آئے تھے اور پیرس میں خود کو موجود پا کر بے حد مسرور دکھائی دیتے تھے۔مجھے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔نیم تاریک علی گڑھ اس منور حال سے کتنا دور رہ گیا تھا۔'' (ایضاً،ص18)

پروفیسر ثریا حسین کا سفرنامہ'پیرس و پارس' اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے سرسید کی طرح مغربی ممالک کے مسائل کا سنجیدگی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔یہ سفرنامہ زبان و بیان،اسلوب،انداز نگارش اور اپنی معروضیت کی وجہ سے قابل ستائش ہے۔وہ چونکہ جمالیات کی پروفیسر بھی رہی ہیں اس لیے مشرق و مغرب کی جمالیات پر ان کی گہری نظر ہے اور ان کی تحریروں میں جمالیاتی عناصر کی جستجو بھی کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر ثریا حسین کے علاوہ جن لوگوں نے علی گڑھ میں اردو سفرنامہ نگاری کو فروغ دیا،ان میں خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ'مسافر کی ڈائری'،قرۃ العین حیدر کا سفرنامہ 'جہاں گرد'اور'دکھلائیے لے جاکے اسے مصر کا بازار'،عابد حسین کا سفرنامہ'رہ نوردِ شوق'،خواجہ غلام السیدین کا 'دنیا میرا گاؤں' جاوید دانش کا 'آوارگی' اور خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ'روزنامچۂ سیاحت' وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ تمام سفرنامے مختلف نوعیت کے ہیں۔ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو خطوط پر مشتمل ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو روزنامچے کے طرز پر لکھے گئے ہیں۔

علی گڑھ میں روزنامچہ کے طرز پر لکھے جانے والے سفرناموں میں ایک نام'خوابوں کا جزیرہ،موریشس' کا بھی ہے۔یہ سفرنامہ شعبۂ اردو علی گڑھ کی پروفیسر دردانہ قاسمی کے سفر موریشس کی روداد ہے،یہ 2014 میں علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔اس میں شعوری طور پر سفرنامہ کی تکنیک کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھا گیا بلکہ مصنفہ نے اپنی ڈائری کے ذریعے روزمرہ کے معمولات کو تفصیل سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں موریشس کی مشہور ہستیوں کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہاں کی تہذیب،تمدن،ثقافت اور جغرافیہ نے بھی اپنی جگہ بنالی ہے۔

دردانہ قاسمی نے موریشس کے علاوہ امریکہ،برطانیہ اور کینیڈا کا سفر بھی کیا لیکن انھوں نے ان تمام اسفار کو اپنی تحریروں میں محفوظ نہیں کیا۔دردانہ قاسمی مشہور نقاد ابوالکلام قاسمی کی زوجہ ہیں اور چونکہ قاسمی صاحب نے موریشس کا بارہا سفر کیا ہے،تو گویا یہ ان کے لیے کوئی نئی دنیا نہ تھی۔علی گڑھ سے موریشس کا گہرا تعلق ہے۔وہاں کے طلبا علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔دردانہ قاسمی کا یہ سفران کے موریشس میں چھ ہفتوں کے قیام پر محیط ہے۔اس دوران انھوں نے نہ صرف اردو کی خدمت کی بلکہ وہاں کی زبان اور تہذیب و ثقافت کو بھی قریب سے دیکھا۔

اس سفرنامہ میں دردانہ قاسمی نے موریشس کی تاریخ اور اس کے جغرافیہ پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد موریشس کے بعض اہم لوگوں کا تعارف کرایا ہے،جن سے علمی و ادبی اعتبار سے شناسائی ہے یا جن لوگوں نے اس سفر میں ساتھ دیا ہے۔اسی طرح وہاں کے ادارے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ اور اردو اسپیکنگ یونین کا تعارف کرایا اور اس کی تاریخی و تعلیمی حیثیت و اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور کتب خانہ سے استفادہ،شاگردوں سے ملاقاتیں، شناساؤں کی محبتیں، مختلف مقامات کی سیر و سیاحت، رہن سہن اور عادات و اطوار وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ موریشس کے ایک اہم مقام،ہرن گھاٹی کی دلچسپ سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ یوں لکھتی ہیں:

''تقریباً سارا کا سارا پہاڑی علاقہ ہے۔کبھی چڑھائی ہے،کبھی اتار،غرض اس گھاٹی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک پیالہ کی طرح معلوم ہوتی ہے اور پیالہ اتنا گہرا ہے کہ اس کا پیندا یا دوسرے لفظوں میں نچلا حصہ، بالکل نظر نہیں آتا، چاروں طرف بے انتہا ہریالی، حسین اور خوبصورت پیڑوں کا گہرا گھیرا اس کے علاوہ نظر کچھ نہیں آتا۔نیچے جھرنا بہنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔''

(دردانہ قاسمی،خوابوں کا جزیرہ،موریشس،مسلم ایجوکیشنل پریس،علی گڑھ، 2014،ص62)

چونکہ دردانہ قاسمی کا مادر علمی علی گڑھ سے دیرینہ تعلق ہے اس لیے موریشس کے حالات اور علی گڑھ کے حالات کا موازنہ کرکے دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں مقامات کے حالات میں کس قدر فرق پایا جاتا ہے۔ایک جگہ علی گڑھ کی شام کو یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''آج کی شام خالی تھی اور ہم لوگ گیسٹ ہاؤس میں ہی تھے اس لیے دو تین ضروری فون کیے اور ٹہلنے چلے گئے۔موریشس میں شام 6 بجے سے ہی ڈنر شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد خاموشی اور سناٹا۔ہم لوگ ڈنر اتنی جلدی کھانے کے عادی نہیں ہیں،اس لیے ٹہلنے نکل جاتے اور خوب لمبی سیر کے بعد ہر چیز کا جائزہ لیتے ہوئے واپس آتے،شام کے وقت گیسٹ ہاؤس میں بالکل اچھا نہیں لگتا۔سب کھانا کھا کر کمروں میں جا چکے ہوتے۔ہم لوگ زبردستی دس بجے تک ٹی وی کے آگے بیٹھے رہتے،اس کے بعد مجبور ہو کر ہمیں بھی اپنے کمرے میں جانا پڑتا۔علی گڑھ میں دس بجے سے شام شروع ہوتی ہے۔بہرکیف اپنے معمولات میں اس جلدی سونے کو بھی قبول کرلیا تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔وہاں اکثر ہندوستان اور موریشس کے اندازِ ترقی کا موازنہ کرتی۔'' (ایضاً،ص71)

علی گڑھ میں ادب کو ہمیشہ افادیت اور مقصدیت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔یوں تو اردو ادب میں سفرناموں کی تعداد بے شمار ہے لیکن علی گڑھ میں لکھے جانے والے سفرناموں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں بیک وقت سیاحت اور قوم کی فلاح دونوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔'مسافران لندن' سے 'خوابوں کا جزیرہ،موریشس' تک جو بھی سفرنامے لکھے گئے ہیں،ان سے اردو کی علمی و ادبی ترقی کے ساتھ قوم کی فلاح و بہبود بھی مقصود ہے۔

■

Mohd Akmal Khan
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderaba (UP) Mob.: 8328467861

تفسیر حسین

اردو میں مذاہب و ملل کی ترجمانی

ہندستان ایک کثیر مذہبی اور کثیر تہذیبی ملک ہے۔ یہاں زبانوں اور بولیوں کی انگنت شکلیں اور صورتیں موجود ہیں۔ اسی طرح مذاہب بھی قسم قسم کے پائے جاتے ہیں۔ تہذیب کی تشکیل میں مذہب کے کردار سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ کسی ملک میں مذہب کی کثرت ہی تکثیریت کو ناگزیر کرتی ہے۔ ترقی کے لیے ایک پرامن زندگی ناگزیر ہے جو ملک کی ذہنی قوت کو ترقی کی راہ کھوجنے اور اس پر قائم رہنے میں تعاون کرے۔ یہی ضرورت بقائے باہم کے اصول کو بھی قائم کرتی ہے۔ جب ہم اردو کے مزاج اور اس کے خلاق اذہان کے مالک تخلیق کاروں کے منہاج کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک تکثیری سماج کے ترقی پسند اور انسان دوست مزاج کی تیاری میں کیا اہم کردار ادا کیا ہے۔

جب اردو طباعت میں تہذیب کے ناگزیر جز یعنی مذہب کی نمائندگی اور مذہبی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو، جس کی اردو میں نمائندگی نہ ملتی ہو۔

ہندستان کا سب سے بڑا اور قدیم مذہب ہندو مذہب ہے۔ اس مذہب میں سناتنی اور غیر سناتنی پرمپرائیں ہیں، جن سے مذہب کی کئی دھارائیں متشکل ہوتی ہیں۔ ہندو مذہب میں کائنات کی تفہیم کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ الہ، انسان، روح اور کائنات سے متعلق ایک ایسا عقیدہ موجود ہے، جہاں کائنات کے خالق کے ساتھ، اس کے فرستادے اور کائناتی مظاہر اس نظام عالم کو چلانے میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب میں عبادتوں کے موسم اور اشیا کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ماحولیاتی کائنات سے وابستہ ہر چیز ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ہندو مذہب کی ایک خصوصیت، اس کے دیوتا بھی ہیں۔ اس دھرم کے پیرووں میں یہ کشادگی پائی جاتی ہے کہ ہر پیرو اپنی افتاد طبع اور مزاج کے مطابق کسی ایک دیوتا کی بھگتی کرتا ہے۔

اس مذہب میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں کو اہم مذہبی کتابوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندو مت میں ویدوں کو اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو میں ہندو دھرم کی اساسی کتب اور اس کی مختلف شاخوں، تحریکوں اور برگزیدہ شخصیات پر مشتمل کتابوں کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ منوسمرتی، شریمد بھگوت گیتا، رامائن، وشنو پران، گنیش پران، رگ وید، جیسی بنیادی کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ محمد عزیز نے ہندو مذہب کی 105 کتابوں کے نام اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔

(محمد عزیز، اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1989، ص 305 تا 299)

ہندو مذہب کے ماننے والوں نے انسانی تہذیب وتمدن اور علم وادب میں بہت سے اضافے کیے۔ قدیم عہد میں طبابت، ریاضی، مصوری، مجسمہ سازی اور ادبی شعریات وسیاسی اصولیات میں ناقابل فراموش کارنامے ان کے رہین منت ہیں۔

ہندو مذہب کے بعد جین مذہب کو اہمیت حاصل ہے۔ اس مذہب کی ابتدائی تبلیغ کا زمانہ 557 ق م، 527 ق م بتایا جاتا ہے۔ اس مذہب کے مطابق انسان مادہ اور روح کا مجموعہ ہے۔ انسان کامل نہیں ہے۔ وہ روحانی ترقی کے ذریعے کمال حاصل کرسکتا ہے۔ روح مادے پر فتح پا سکتی ہے۔ انسان اپنے اعمال کے لیے بذات خود ذمے دار ہے۔ روح جب کمال کو پالیتی ہے تو اننت اربعہ پر متمکن ہوتی ہے۔ اننت درشن، اننت گیان، اننت ویرج اور اننت سکھ۔

جین مت کے پیروکاروں نے مختلف علوم وفنون اور سیاست کے مختلف میدانوں میں جو خدمات انجام دیں، ان کا تعارف کراتے ہوئے عماد الحسن آزاد فاروقی لکھتے ہیں:

''زبان، ادب، فنون لطیفہ، فلسفہ، اخلاقیات اور دیگر علوم وفنون میں خدمات کے علاوہ جین مت کے پیروکاروں نے ہندستان کی سیاسی اور معاشی زندگی میں بھرپور حصہ لیا۔ ایک مدت دراز تک جین طبقے سے لائق بادشاہ، وزرا، سپہ سالار اور امرا پیدا ہوتے رہے، اور ملک کی معاشی زندگی میں تو آج بھی جین فرقہ مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح سماجی خدمت اور فلاح وبہبود کے عوامی کاموں میں حصہ لینا ابتدا سے ہی جین روایت کا حصہ رہا ہے۔ اور اس طرح سے بھی انھوں نے بلا تفریق مذہب وملت ہندستانی عوام کی بہت خدمت کی ہے۔''

(عماد الحسن آزاد فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1986، ص 151)

جین مت سار، سناتن جین درشن پرکاش، جین کرم فلاسفی، جین دھرم وپرماتما، جین رتن مالا، گیان سورج ادے، جین تتو درپن، نوتت، ویراگ پرکاش، جین کتھا رتن مالا، نرگرنتھ پروچن جیسی کتابیں اردو میں لکھی گئیں جو جین مت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔

(محمد عزیز اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1989، ص 311،312)

بودھ مذہب ایشیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک ہے۔ اس مذہب کی جائے پیدائش ہندستان ہے۔ یہ ایک زمانے میں ہندستان کا ایک بڑا مذہب رہا ہے۔ یہ آج ایشیا کے کئی ممالک کا اکثریتی مذہب ہے۔ مہاتما بدھ نے اپنے مجاہدے سے جس عرفانی منزل کو خود پر منکشف کیا وہ نروان کے نام سے متعارف ہوئی، جس میں ایک طرح سے نجات کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ مہاتما نے آٹھ ایسے اصول بنائے جو دکھوں کے ازالے کو آسان کرتے ہیں۔

سمیک درشٹی (صحیح اعتقاد)، سمیک سنکلپ (صحیح نیت یا خیال)، سمیک واک (قول صحیح)، سمیک کرمانت (صحیح کرم یا رویہ)، سمیک آجیوکا (صحیح ذریعۂ معاش)، سمیک ویایام (مناسب جدوجہد)، سمیک اسرتی، (اچھی یادداشت، صحیح لحاظ) سمیک سمادھی (خدا میں کامل محویت) ان آٹھ صفات یا اصول کی پابندی یا حصول اسی وقت ممکن ہے جب انسان اچھے اخلاق وکردار کا حامل ہو اور یہ کردار دس طرح کے قاعدوں کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اہنسا، ستیہ، برہم چریہ، ناچ گانے اور نشے سے پرہیز، خوشبودار اشیا سے پرہیز، نرم ونازک بستر سے پرہیز، اسباب تعیش جمع نہ کرنا، بلاوقت کھانا نہ کھانا، برے خیالات کو ترک کردینا۔ (ہندوستانی مذاہب نمبر سہ روزہ دعوت، جلد نمبر 41، شمارہ نمبر 27، 22 مارچ 1994) اردو

میں بدھ مت سے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ ’بدھ اور اس کا مت‘ مصنفہ مسٹر اسٹراس مترجمہ شیونرائن شمیم حصہ اول اور حصہ دوم طبع ثانی 1926 کاشی رام پریس لاہور بدھ مت سے متعلق اہم کتاب ہے۔ حصہ اول میں مترجم نے امریکی مصنف مقیم سوٹزرلینڈ کے بارے میں سرسری گفتگو کی ہے۔ بدھ ازم کے اہم مقامات اور احوال و تاریخ کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ:

”1900 میں راقم آثم نے سوانح عمری گوتم بدھ لکھی تھی۔ جس کی طبع ثانی نہیں نکلی۔ بدھ نہ صرف ہندوؤں کی طبیعت پر اثر کرتا ہے۔ بلکہ اہل اسلام سے بھی خراج تحسین لے رہا ہے۔

(الف) بیگم صاحبہ والیِ بھوپال نے سانچی ٹوپ صرف کثیر سے مرمت کرا کے اس کے قریب سیاحوں کے لیے قیام گاہ بنا دیا ہے۔

(ب) اعلیٰ حضرت نظام والیِ حیدرآباد دکن نے الورا اور اجنتا کی سیر کے واسطے سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور محکمۂ آثار قدیمہ قائم کر دیا ہے جو نہایت مفید کام کر رہا ہے۔

(ج) ایک مسلم شاعر سارناتھ دیکھ کر ایسا متاثر ہوا کہ ایک نظم اس نے رسالہ ہمایوں میں شائع کی۔

(د) مولوی محمد اسماعیل صاحب ہاتف بھوپالی نے بدھ کی تعلیم رسالہ زمانہ دسمبر 1923 میں لکھی۔

(ر) مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے جنھوں نے طبع ثانی ہذا کو اصلاح دی ہے، نہایت پاکیزہ بدھ کی سوانح عمری لکھی ہے۔ جو ”الناظر“ لکھنؤ میں شائع ہوئی۔

(ز) ایک مسلم ادیب نے انگریزی کے ایک رسالے کو اردو کا جامہ پہنایا اور اس کا نام ”بدھ کی کہانی پتھروں کی زبانی“ رکھا جو لاہور کے عجائب گھر کے دروازے پر بکتی ہے۔“ (ص، 22،21)

مترجم کے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سارے ہی مذاہب کے ذی ہوش اور باشعور لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ سائنس نے جو تعقلاتی طریقۂ کار اختیار کیا، مذہب اس کی زد پر ہے۔ اس لیے مذہبی رویے اور معتقدات کی خدمت میں جدید علوم کو لگانا ناگزیر ہے کہ ان کی منطقی اور عقلی تعبیر سامنے لائی جا سکے۔ اس سلسلے میں مصنف نے تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے محسن الملک کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ حالی کی ایک رباعی بدھ مت کے فلسفے کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ آخر میں مترجم نے بدھ مت کو ہندستان میں موجود کئی مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا ہے۔

بدھ مت سے متعلق منشی امیر احمد علوی کا ذکر اس مترجم نے بدھ مت سے متعلق ان کی کتاب کے حوالے سے کیا تھا۔ امیر احمد کی کتاب کا حجم مختصر ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر جو عبارت درج ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ’الناظر‘ میں گوتم بدھ سے متعلق شائع ہونے والے مضامین کی تلخیص ہے۔

منشی احمد الدین کی کتاب ’سوانح عمری مہاتما بدھ‘ 1903 میں کشمیر پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

ٹی ڈبلیو، ریس، ڈیویس کی کتاب ’بدھسٹ انڈیا‘ کا ترجمہ مولوی سید سجاد صاحب ایم اے نے کیا اور یہ ترجمہ دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد سے 1922 میں طبع ہوا۔

ڈاکٹر، م حفیظ سید ایم اے کی کتاب ’گوتم بدھ سوانح حیات و تعلیمات‘ انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے 1942 میں شائع کی۔

گوتم بدھ سے متعلق بچوں کے ڈراموں کا ایک مجموعہ خدیجہ بیگم نے تصنیف کیا۔ یہ مجموعہ عبدالقادر سروری اینڈ سنس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پبلشر سے 1939 میں شائع ہوا۔

دھرما نند کوسمبی کی مراٹھی کتاب ’بھگوان بدھ‘ کا ترجمہ پرکاش پنڈت نے کیا جو ساہتیہ اکادمی دہلی سے 1960 میں شائع ہوا۔

اس معلوم تعداد کے علاوہ بھی ایک امکانی تعداد ایسی کتابوں اور مضامین کی ہو سکتی ہے جو پردۂ خفا میں ہوں۔

سکھ مت ہندستان میں اصلاح اور انسانی مساوات اور وحدت رب کی خصوصیات کے ساتھ جانا جاتا ہے۔ اس مذہب کے بانی حضرت گرونانک صاحب ہیں۔ آپ کے احوال میں جو باتیں ملتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک برگزیدہ ہستی تھے اور بلاتفریق رنگ و نسل انسانوں کو عرفان ذات اور رب سے جوڑنے کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ آپ کے جانشینوں کا ایک سلسلہ چلا جو اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کے عہد تک جاری رہا اور گروگووند پر منتہی ہوا۔

سکھ مت کی بنیادی کتاب گروگرنتھ صاحب ہے جس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منظوم اقوال و مقولات پر مشتمل ہے۔ یہ اقوال چھ گروؤں اور چودہ بھگتوں سے منسوب ہیں۔

سکھ مت سے متعلق کئی کتابیں اردو زبان میں تصنیف کی گئیں، جن میں سکھ مت کی تعلیم، ہدایات، معتقدات، اخلاقیات، اوراد و وظائف کے ساتھ مذہب اور اس کے پیشواؤں کی تاریخ ملتی ہے۔ محمد عزیز نے سکھ مت سے متعلق جن کتابوں کی فہرست تیار کی ہے، ان کی تعداد 26 ہے۔

ہندستان میں برطانوی تجارتی کمپنی کی آمد اور اس کے اثر و رسوخ کے مستحکم ہو جانے کے بعد عیسائی مشنریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استشراقی کاوشوں نے اہالیان ہند کے تمام مذہب پرستوں کو اپنے مکالمے میں شامل کرنا شروع کیا۔ اس طرح مکالمے، مباحثے اور مناظرے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ سناتن پرمپرا کے ماننے والوں، آریہ سماجیوں اور مسلم علماء نے مسیحی مبلغین سے بہت سے مناظرے کیے اور ان مناظروں نے مذہبی علم کلام کو ایک نیا رخ دیا اور مذہب کی تعبیر و تفسیر کے نئے منہج ہندستان میں دریافت کیے گئے۔ مسیحی مبلغین اور مشنریوں نے اپنے مقدس صحیفوں کے علاوہ اپنی تبلیغی کاوشوں کے لیے اردو میں خاصا لٹریچر تخلیق کیا۔ مسیحیت سے متعلق اردو کی معلوم کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہوگی۔

ہندستان میں مذہب کی جدید تعبیر و تشریح کا سلسلہ شروع ہوا اور سماجی اصلاح کی مہمیں شروع ہوئیں تو مختلف تحریکات اور مکاتب فکر نے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ برہمو سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، دیو سماج، رادھا سوامی مت اور آریہ سماج جیسی تحریکات نے ہندستانی الاصل مذاہب کی جدید تعبیر و تشریح پر مبنی خاطر خواہ لٹریچر اردو زبان میں تیار کیا۔

اسلام، پیغمبر اسلام، قرآن اور اسلامیات سے متعلق کتابوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو مختلف اداروں اور سوسائٹیوں کے علاوہ انفرادی سطح پر تیار ہو کر سامنے آیا۔

اردو طباعت میں مذہبی ادب کے ذخیرے کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا اور کہنا مشکل نہیں ہے کہ اردو طباعت کی تاریخ ایک ایسے سماج کی تاریخ رہی ہے جو تکثیریت پر یقین رکھتا تھا اور اس تکثیری مزاج کی تشکیل، باہمی تعارف اور بقائے باہم میں اردو طباعت کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

مراجع

- اے ماوی، ڈاکٹر، اردو میں ہندو دھرم، انصاری آفسٹ الٰہ آباد، 2000
- پنڈت سکھ لال اپدیشک، دسم گرنتھ صاحب، راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور، 1915
- خاں، نادر علی، ہندوستانی پریس، ص، 11، اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنؤ، 1990
- علوی، منشی امیر احمد، گوتم بدھ، دارالناظر پریس لکھنؤ
- فاروقی، عمادالحسن آزاد، دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1986
- محمد عزیز، اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1989
- مسٹر اسٹراس، مترجم، شیونرائن شمیم، بدھ اور اس کا مت، کاشی رام پریس لاہور 1926

■

Tafseer Husain
Room No: 27, Periyar Hostel, JNU
New Delhi - 110067

حمید الماس

بحیثیت مترجم

زلیخا بیگم

حمید الماس ایک خوددار اور حساس طبعیت کے مالک تھے۔حمید الماس وقت شناس اور زمانہ شناس تھے۔ جس طرح سر سید احمد خان نے ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھا۔حمید الماس نے بھی ریاست کے مسلمانوں کے لیے کنڑی زبان کو ترقی کے لیے ضروری مانا ھے۔اسی لیے آپ نے اردو داں طبقہ کے لیے کنڑی زبان و ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مضامین لکھے۔جس کے ذریعہ اردو زبان والوں میں کنڑی زبان سیکھنے کا جذبہ پیدا کرنا چاھتے تھے۔

حمید الماس کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا کم عمری میں ہی کی۔ چودہ پندرہ سال کی عمر سے ہی آپ کی شاعری شائع ہونے لگی۔ آپ نے شاعری کے مختلف اصناف میں اپنے قلم کا زور دکھایا۔ آپ کو بیک وقت نظم اور غزل دونوں میں مہارت حاصل تھی۔

حمید الماس ایک خوددار اور حساس طبعیت کے مالک تھے۔ حمید الماس وقت شناس اور زمانہ شناس تھے۔ جس طرح سر سید احمد خان نے ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھا۔حمید الماس نے بھی ریاست کے مسلمانوں کے لیے کنڑی زبان کو ترقی کے لیے ضروری مانا ہے۔اسی لیے آپ نے اردو داں طبقہ کے لیے کنڑی زبان و ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مضامین لکھے۔جس کے ذریعہ اردو زبان والوں میں کنڑی زبان سیکھنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کی زندہ مثال آپ کی کتابیں اور رسائل میں شائع ہونے والے مضامین ہیں۔آپ کی کتاب 'سر دلیز' ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ جس میں حمید الماس نے کنڑا ادب کے ناول، افسانے اور کنڑا شاعری وطنز و مزاح پر پرمغز مضامین قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ ہمیں کنڑا ادب کی مختصر تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں آپ نے اردو والوں کو کنڑا ادب سے متعارف کروایا وہیں آپ نے کنڑا والوں کو بھی اردو ادب سے متعلق مختصر وضروری معلومات کنڑا زبان میں 'نے سے' لکھ کر فراہم کیں۔ آپ کی تصانیف سے اردو ادب کا خزانہ وسیع ہوا اور کنڑا ادب کے سرمائے میں بھی ترقی ہوئی۔ترجمہ نگاری میں بھی آپ نے چند کتب یادگار چھوڑی ہیں۔

حمید الماس کی جملہ پانچ کتابیں ترجمہ شدہ ہیں۔ ان میں تین نثری اور دو منظوم ترجمہ ہیں۔ان میں آپ کا شاہکار کارنامہ شرن بسویشور کے وچنوں کا منظوم ترجمہ ہے۔ جو 'فرمودات' کے نام سے 1975 میں شائع ہوا۔ 'فرمودات' میں آپ نے شرن بسویشور کے 108 وچنوں کا انتخاب کرکے انھیں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ 'فرمودات' حمید الماس کا کنڑا سے اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔ اس منظوم ترجمہ میں انھوں نے وچنوں کو نظم میں ڈھالا ہے۔ جو ترجمہ کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ ترجمہ سے کہیں زیادہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ 'فرمودات' کی اردو دنیا میں بے حد پزیرائی ہوئی۔ اس پر کئی تبصرے بھی لکھے گئے۔ مختلف انعامات سے بھی نوازا گیا۔ان کی اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کے اہم محقق پروفیسر گیان چند جین نے بھی اپنے تاثرات کچھ اس طرح قلمبند کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

"قدیم کنڑا کی روحانی موضوعات کو حمید الماس نے اس سلاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کہ ترجمہ کے بجائے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ان میں شاعری کی جملہ خوبیاں ہیں۔ اردو شاعری کی روایتی غالب موضوعات کے بعد جب ان تازہ روح پرور مطالب کو دیکھا جائے تو واقعی ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے۔"

(یادِ رفتگاں: حمید الماس از ملنسار اطہر احمد، ص 78)

حمید الماس کنڑا ادب اور شعری اسالیب کے نبض شناس تھے۔ آپ نے پوری دلجمعی سے اردو میں وچنوں کا

ترجمہ پیش کیا ہے۔ آپ کا یہ ترجمہ دیگر مترجمین کے تراجم سے منفرد نظر آتا ہے۔ آپ نے ترجمے میں اصل مضمون کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ شعر کی روح کو قائم رکھا۔ آپ کے اس منظوم ترجمہ میں لفظیات کا انتخاب بھی جداگانہ ہے۔ جس میں آپ نے ایجاز واختصار سے کام لیا ہے۔ ترجمہ میں آپ نے اردو زبان وشعر کی فضا کو قائم رکھا۔ آپ نے ترجمے میں سنسکرت اور کنڑا کے کم سے کم الفاظ کا استعمال کیا بلکہ ان کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ زبان کی اصطلاحات کی چابکدستی سے مدد لی گئی ہے۔

خدا کی حمد وثنا میں مہاتما بسویشور نے کئی وچن کہے ہیں۔ ان میں چنندہ وچنوں کو حمید الماس نے 'فرمودات' میں ترجمہ کر کے شامل کیا ہے۔ وچن کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

وچن

مری نظر نے ہر ایک سمت تجھ کو پایا ہے
بس ایک تو ہے فقط یونہی کائنات کی روح
ہیں کائنات میں آنکھیں، تو تیری آنکھیں ہیں
ہے کائنات میں چہرہ، تو تیرا چہرہ ہے
جہاں میں ہیں تو فقط تیرے دست وبازو ہیں
مرے عزیز مرے دیوا کوڈلا سنگم
ہیں کائنات میں پاؤں تو تیرے پاؤں ہیں

(فرمودات، ص 18)

اس وچن کے مطالعہ کے بعد کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ بلکہ خود حمید الماس کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ ہر سمت خدا کی موجودگی، اسی کی آنکھیں، چہرہ، دست وبازو کی موجودگی کا ذکر ہے۔ سوائے کوڈلا سنگم کے اس ترجمہ میں کوئی لفظ کنڑا کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ حمید الماس بے شک لفظ شناس تھے۔ یہ ترجمہ انگوٹھی میں نگینہ جڑنے کے مترادف ہے۔ کنڑا الفاظ کے ہو بہو مفہوم دینے والے الفاظ کو یہ حسن وخوبی استعمال کیا گیا ہے۔

فرمودات کا ایک اور وچن ملاحظہ کریں۔

زر پاس ہے جن کے وہ بناتے ہیں شوالہ
میں مفلس وقلاش بھلا کیسے بناؤں
مندر ہے مرا جسم تو یہ پیر ستوں ہیں
اوپر جو مرا سر ہے وہ سونے کا کلس ہے
اب سنیے مرے دیوا کوڈلا سنگم
دنیا کی ہر چیز تو فانی ہے مگر روح
مرتی نہیں مرتی ہی نہیں اس کو بقا ہے

(فرمودات، ص 53)

حمید الماس نے کمال کا ترجمہ کیا ہے۔ لفظوں کو لڑی میں پرو کر ایک ہار کی مانند اس وچن کو اردو نظم میں ڈھالا ہے۔ اصل وچن سے زیادہ ترجمہ کیا گیا وچن مزہ دیتا ہے۔ یہ حمید الماس کی ہنرمندی ہے کہ وہ وچن کی اصل روح تک پہنچ کر قاری کے ذہن کے پردے کھول دیتے ہیں۔ اس وچن میں روح کے لافانی ہونے کی بات پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جو بندے اور خدا کے رشتہ کو قائم رکھتا ہے۔ خدا کی اصل عبادت روح سے ہوتی ہے۔ مال وزر سے انسان دنیا میں عبادتگاہیں تو بنا سکتا ہے۔ مگر جو مال و دولت نہیں رکھتے وہ پوری عقیدت کے ساتھ دنیا و آخرت میں بھی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ حمید الماس کی ہنرمندی ایسی کمال کی ہے کہ وہ ترجمہ کو تاج محل اور الفاظ کو سنگ مرمر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی یہ مہارت ہی انفرادیت کی ضامن ہے۔

حمید الماس کا دوسرا منظوم ترجمہ 'شب گرد' ہے جس میں انھوں نے کنڑا کے قدیم وجدید شعرا کا انتخاب کر کے ان کی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ میری دانست میں 'شب گرد' شاعری کی وہ مکمل کتاب ہے جس کے مطالعہ کے بعد قاری کنڑا شاعری کی روایت اور تاریخ، کنڑا شاعری کے رجحانات و ادوار، موضوعات اور کنڑا

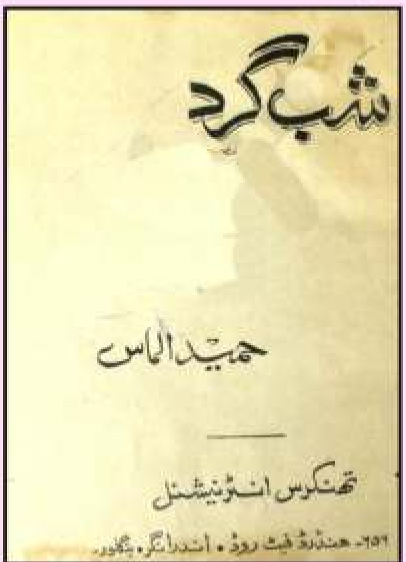

شاعروں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ حمید الماس نے ابتدا ہی میں کنڑا شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس سے آپ کی کنڑا شاعری کی معلومات اس سے دلچسپی اور گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد ان سترہ شاعروں کے نام درج ہیں جن کی نظموں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ پھر ترجمہ شدہ نظمیں دی گئی ہیں۔ اور آخر میں ان تمام شعراء کا مختصر سا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

شب گرد پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلم عمادی ماہ نامہ 'سب رس' میں یوں رقمطراز ہیں:

''شب گرد میں شریک نظموں سے یہ احساس اور مضبوط ہوتا ہے۔ شاعری کی بنیاد سماج سے ہٹ کر فرد تک آ پہنچی ہے۔ نظموں کے ترجمے اتنی سندرتا سے کیے ہیں کہ کہیں ترجمہ ہونے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس لیے حمید الماس مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

(حمید الماس فن اور شخصیت، ص 236)

اردو شاعری کی طرح کنڑا شاعری بھی ترقی کے مراحل طے کرتی رہی۔ ابتدا میں روایتی شاعری، ادب برائے زندگی، ادب برائے ادب کے بدلاؤ آتے رہے۔ رومانی شاعری کی جگہ انسانی وسماجی مسائل نے شاعری میں جگہ بنالی۔

شب گرد میں حمید الماس نے نظموں کا ترجمہ کس طرح کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

وی۔جی۔ بھٹ کی نظم کا ترجمہ

مجھے ساری دنیا کے حالات کا علم ہے
مرے روبرو
جو بھی ہوتا ہے
اسکی خبر ہے
مگر میرے اندر جو جوہر ہے
میں اس کے عرفان سے محروم ہوں

(شب گرد، ص 48)

شب گرد کی ہر نظم عمدہ ہے۔ اس نظم میں شاعر نے خودی کی لاعلمی کو ظاہر کیا ہے۔ کہ دنیا میں جو ہو رہا ہے لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا تو علم رکھتے ہیں مگر خود کیا کر رہے ہیں اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ جو ہم باہر تلاش کرتے ہیں وہ خود میں موجود ہوتا ہے۔ جس سے ہم بے خبر رہتے ہیں۔ حمید الماس نے کنڑا شاعری کو اردو والوں تک پہنچایا ہے۔

شب گرد میں چندر کانت کسوری کی سترہ نظمیں جو قابل ذکر ہیں۔ کسوری کنڑا کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری عصر حاضر کے مسائل کی ترجمان ہے۔ ان کے کلام کا انداز منفرد ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں اپنے اندر معنویت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ کسوری کی شاعری میں فطرت کی عکاسی نظر آتی ہے جیسے سورج، زمین، ہوا، پہاڑ، جنگل، سبزہ، پھول، کھیت کھلیاں وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کے ساتھ ندی 'سمندر' پر بھی کلام ملتا ہے۔ شاعر کبھی سورج کی بات کرتے ہیں تو کبھی چاند کی گفتگو کرتے ہیں۔ حمید الماس کا یہ خوبصورت ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

کوئی عصمت مآب دوشیزہ
ایک عرصہ سے برہنہ پیکر
پھر رہی ہے اندھیری راتوں میں

اس کولانا ہے اک سفید لباس
کیا میرے ساتھ تم بھی آؤ گے

(شب گرد ص 71)

ایک اور نظم کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

چاند کے نرم تیز ناخن سے
تیرگی کا لباس پھٹتے ہی
زانوئے شب سے روشنی پھوٹی

(شب گرد ص 73)

کسوری کی ایک تمثیلی نظم کا ترجمہ حمید الماس نے بڑی خوبی سے کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

سر پہ ہے
مچھلیوں کا ایک طبق
ہاتھ میں مچھلیاں تو پشت پہ بھی
اجلی اجلی سی مچھلیاں ہیں بندھیں
اور کندھوں پہ ہے بڑا سا جال
ایک مچھلی مگر سمندر کے
جوڑے سینے پر تیرتی آئی

(شب گرد ص 77)

حمید الماس نے کنڑا ادب کے مسلم شاعر کے ایس نثار احمد کی نظموں کو بھی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ نثار احمد کی شاعری کا مجموعہ 'بے نام انگریز' کنڑا ادب میں بے حد داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ کنڑا ساہتیہ اکیڈمی نے اس مجموعہ کو انعام سے نوازا۔ اس کتاب سے حمید الماس نے دو نظموں کا ترجمہ کیا ہے ایک 'خالی جگہ' اور 'بے نام انگریز'۔ ان نظموں کو اردو میں ترجمہ کر کے حمید الماس نے اپنی وفنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

حمید الماس کی نثری تراجم میں 'پنچے منگیش راؤ' پہلا ترجمہ ہے۔ جو 'ہندوستانی ادب کے معمار' کے سلسلے میں ایک مونوگراف کنڑا کے معروف ادیب شری وی سیتا رامیا نے لکھا تھا۔ اسی مونوگراف کا ترجمہ حمید الماس نے کیا۔ کنڑا کے ادیب ایچ۔ تپے ردرسوامی کا مونوگراف جو شری بسویشور پر کنڑا میں لکھا گیا ہے۔ حمید الماس نے 'بسویشور' کے نام سے اسکا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ حمید الماس کا دوسرا نثری ترجمہ ہے۔ آپ کا تیسرا نثری ترجمہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ ترجمہ 'ماستی کی کہانیاں' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب کنڑا کے ادب مین اونچا مقام رکھنے والی شخصیت ماستی وینکٹیش آئنگار جو بیک وقت ایک بہترین افسانہ نگار، شاعر اور نقاد کہلاتے ہیں۔ آئنگار کے منتخب پندرہ افسانوں (کہانیاں) کا ترجمہ الماس صاحب نے کیا ہے۔ ایک کہانی کا ترجمہ جو وینو گوپال سرب کی کنڑا کی تخلیق ہے۔ جس کا ترجمہ حمید الماس نے اردو میں 'جلوس' کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ رسالہ 'شعر و حکمت' میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ کہانی شہر منڈالور کے بادشاہ وکرم رایا کے عجیب و غریب فرمان پر مبنی ہے۔ وکرم رایا ریاست کے نوجوانوں کا ایک جلوس نکلواتا تھا۔ جو سالوں سے رواں دواں ہے۔ ہر روز اس جلوس کے لیے نئے نئے احکام صادر کرتا تھا۔ ایک عرصہ سے جلوس گشت کرنے کی وجہ سے گھروں میں مرد نام کو بھی نا تھے۔ اور یہ جلوس راستہ میں کبھی آرام نہیں کر سکتا تھا۔ حکم تھا کہ اگر راستہ میں کوئی مر بھی گیا تو اس کی نعش کو روندتے ہوئے جلوس آگے بڑھیا اور جس باغ، گاؤں سے یہ جلوس گذرتا وہاں کے لوگ ان کی خدمت کریں۔ ریاست کی ساری عورتیں پریشان تھیں۔ گھروں کی دیکھ بھال عورتوں کے ذمہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے مردوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ ہر عورت اپنے بچے کی حفاظت کے لیے فکر مند تھی۔ اسی کا ایک اقتباس جس کا ترجمہ حمید الماس نے مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

ترجمہ ''رایچگا اپنے ایک نور نظر کو پہلے ہی کھو چکی تھی۔ اب آٹھ سال کا دوسرا لڑکا ہی اس کا واحد سہارا تھا۔ وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں سنکی مہاراج اور اسکے مصاحبین کی نظریں اس بچے کو بھی نہ کھالیں۔''

(شعر و حکمت 1، کنڑا کہانی 'جلوس'، افسانہ نگار: وینو گوپال سرب، مترجم: حمید الماس، ص 620)

اسی ریاست کا ایک دانشور کشپ جس کے دو لڑکے جلوس کا شکار ہو گئے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا تیسرا لڑکا بھی اس کی نذر ہو۔ اس لیے اس نے اپنے لڑکے موہن کو زنانی لباس و زیورات پہنانے لگا تھا۔ تا کہ کوئی پہچان نہ

پائے۔ ریاست کا یہ حال تھا کہ ایسی ایک دو مثالیں ہر گھر میں موجود تھیں۔

اس سلطنت کا سپہ سالار سنگامیا پریشان تھا کیونکہ عورتیں بغاوت پر اتر آئی تھیں۔ انھیں مرد کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کر لیا۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

ترجمہ ''پھر جلوس نکلا۔ مردوں کے بجائے عورتوں کا جلوس تھا۔ منڈالور کی خوابیدہ نسائیت بیدار ہو چکی تھی۔ لڑکیوں نے اپنی دادیوں اور ماؤں کے ساتھ سنگامیا کا گھیراؤ کیا۔ ہم شوہر چاہتے ہیں ہم شوہر چاہتے ہیں۔ ہمیں مرد دوست چاہیے۔ عورتوں کے اس نعروں سے سارا شہر گونج رہا تھا۔ جلوس میں چند عورتیں برہنہ تھیں۔''

(ایضاً، ص 621)

یہ جلوس محل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ محل کے داروغہ کیمپا کو عورتوں نے اغوا کر لیا۔ اور ایک مرد نے ہزاروں عورتوں کو آسودہ کیا۔ سنگامیا بھی نہ بچ پایا۔ اس جلوس کے ہنگامہ میں چھپے مرد جو زنانی لباس میں تھے۔ اپنے کپڑے اتار کر عورتوں کے بغل گیر ہو گئے۔ ایک مرد اور کئی عورتیں۔ اس طرح سو بچوں کے ایک والد ہوئے۔ اس کے بعد رایچگا خوش ہو گئی۔ اور سپہ سالار کو موت کی سزا دی گئی۔ اور بادشاہ ورم رایا بھی نہ رہے۔ نئے بادشاہ کے ساتھ نیا فرمان بھی جاری ہوا۔ اس ترجمہ کا آخری اقتباس ملاحظہ کریں:

ترجمہ ''نئے مہاراجہ کی تخت نشینی سے پہلے ہی ریاست کے دستور میں تبدیلیاں کی گئی۔ کہ عورتوں کی اجازت کے بغیر کوئی جلوس نہ نکالا جائے۔ اگر چند صورتوں میں جلوس کی تکمیل اور اس کی گشت ضروری ہو تو صف اول میں عورتیں رہیں۔ اور چند کو سپہ سالار بنایا جائے اور جلوس کی طوالت ایک میل سے زائد نہ ہو۔''

(ایضاً، ص 622)

حمید الماس نثر نگاری میں بھی ماہر نظر آتے ہیں۔ آپ نے بے حد عمدہ و شائستہ ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ کم ہی محسوس ہوتا ہے۔ تخلیق کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ مترجم اصل تصنیف کے الفاظ کا استعمال ترجمہ میں کرتے ہیں۔ مگر حمید الماس نے پوری ایمانداری سے ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم کے ذریعہ آپ نے مترجم ہونے کا حق ادا کیا ہے۔

■

Zuleqa Begum (RS)
Dept of Urdu and Persian
Gulbarga University
Gulbarga-585106(Karnataka)
Mobile:9008129182

تبصرہ وتعارف

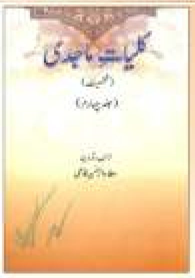

کلیات ماجدی (جلد چہارم)

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527، قیمت: 230 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
محلہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی)

زیر نظر کتاب ان نادر و نایاب مکتوبات کا ایک علمی ذخیرہ ہے جو اردو کے مایہ ناز وصاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی اور کاروان صفوت و سنت کے سالار و نقیب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے درمیان تقریباً سولہ برس تک ہوتی رہی، مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط کا سلسلہ ایک مرشد کامل کی تلاش وجستجو میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کو لکھے گئے مکتوب سے شروع ہوا اور بعد میں اس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی سے استفسارات کیے، اس کا نام مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے 'حکیم الامت نقوش وتاثرات' رکھا اس میں خطوط کے ذریعہ حاصل، حضرت حکیم الامت کے ملفوظات اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے سوالات کے انتہائی عالمانہ ومدبرانہ انداز میں جوابات ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کلیات ماجدی کے مرتب مولانا عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی ایک بہترین عالم دین اور ادیب ومحقق ہیں۔ 'کلیاتِ ماجدی' یہ خالص علمی وادبی کتاب صرف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ بعض انتہائی لذیذ ذائقے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو چکھے بغیر ان کا سواد بتا ہی نہیں سکتے اور دوسرے کے بتانے سے وہ لذت و چٹخارے لے ہی نہیں سکتے، 'کلیات ماجدی' کی علمیت وافادیت کا اندازہ تو خود ہی پڑھ کر کیا جاسکتا ہے۔ آپ خود تصور کیجیے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے خداداد صلاحیتوں والے صاحب طرز ادیب کے سوالات اور انبیا کے وارث حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی جیسے جلیل القدر عالم دین کے جوابات کی تعریف وتوصیف یا تعارف کے لیے تو ایک دفتر نہیں دفاتر درکار ہیں۔ میں تو جیسے جیسے کتاب 'کلیات ماجدی' کا مطالعہ کرتا رہا ویسے ویسے جادوئی نثر کی جادوئی سحر انگیزی میں محو ہوتا گیا۔ معانی کا جہان اپنے اندر سمیٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوب صورت پر تاثیر جملے۔ عرض ہے 'کلیات ماجدی' کو میں نے تین مرتبہ اس طرح پڑھا ہے جیسے اپنی مرتب کردہ کسی کتاب کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں؛ لیکن مجھے کسی مقام پر بھی غیر دلچسپی کا احساس اور اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

محترم مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے 'کلیات ماجدی' کی موجودہ اشاعت کے ذریعہ اردو ادب بلکہ شائقین علم وادب پر ایک احسان کیا ہے۔ زیر نظر کتاب حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی کے قلم معجز رقم کی ترتیب وتدوین سے آراستہ ہے اگر چہ اس سے قبل اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، یہ کتاب اب تک خواص کے لیے خاصے کی چیز تھی مگر اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ یہ عوام الناس تک پہنچی ہے، اگر مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی اس کتاب میں در آئے عربی وفارسی عبارات اور فارسی اشعار اور قرآنی آیات مبارکہ کا اردو ترجمے بھی حواشی میں فرما دیتے تو عوام اور زیادہ استفادہ کرتے جو ایک تدوین وترتیب کار کا کارِ منصبی ہے۔

تحقیق و تنقید

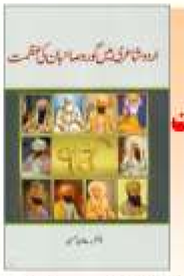

اردو شاعری میں گورو صاحبان کی عظمت

مصنف: ڈاکٹر ریحان حسن

صفحات: 216 قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: خان محمد رضوان، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

اردو زبان مشترکہ تہذیب وثقافت کی نہ صرف ترجمان ہے بلکہ امین بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر ہندستانی زبانوں کی بہ نسبت اردو زبان نہ صرف مقبول ہے بلکہ یہ تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے قابل قبول بھی ہے۔ اردو کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا بھر میں بولی جانے والی تمام ہی زبانوں کے مقابلے میں اتحاد، یکجہتی، رواداری اور بھائی چارہ کی فضا اس میں خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔

لیکن اردو یہ زبان ہے جس میں تمام ہی مذاہب کے ادبا وشعرا اور علما نے طبع آزمائی کی ہے ان میں سکھ مذہب کے شعرا اور پیشوا پیش پیش رہے ہیں۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ اس طبقے کی زبان فارسی زدہ ہے اور ان کے مذہبی پیشواوں نے ابتدا سے صوفیا اور اولیاء کی تعلیمات کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکھ برادری شروع سے اردو کے قریب رہی اور اس کیا دبا اور شعراء نے اردو زبان وادب کے ارتقا اور فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

کتاب 'اردو شاعری میں گورو صاحبان کی عظمت' کی اشاعت کا مصنف کے پیش نظر اولین مقصد یہ ہے کہ گورو نانک جی کی عظمت کے ساتھ ساتھ نو گورو صاحبان کی عظمت، ان کا پیغام انسانیت واخوت کو عام کیا جائے اور اردو داں طبقہ میں ان کی اس فکر کو پہنچایا جاسکے۔ اس کتاب کے شروع میں مصنف نے گورو نانک دیو جی، گورو گرنتھ صاحب انگ، 2 سے ایک اشلوک نقل کیا ہے۔

'سبھنا جیاں کا اک داتا' (تمام انسانوں کو دینے والا ایک ہی خدا ہے) جس سے ان کا پیغام بالکل واضح ہوجاتا ہے، یہ وہ قیمتی اور گراں قدر درس ہے جس سے گورو صاحب کے فکری رویے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ریحان حسن نے محنت شاقہ اور عرق ریزی کی بدولت تقریبا سیکڑوں ایسے شعرا کے کلام کو اس کتاب میں یکجا کردیا جنھوں نے گورو صاحبان کو نذرانہ عقیدت پیش کرکے قومی یکجہتی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس اہم تصنیفی کارنامے کی تکمیل کے لیے انھوں نے متعدد کتب ورسائل کے ذریعہ سکھ مذہب کی تاریخ کا غائر مطالعہ کیا تاکہ اردو شعرا کے کلام کے مفہوم کو موزوں انداز میں پیش کیا جاسکے۔ ساتھ ہی مصنف نے اہم ماخذ تک رسائی حاصل کرنے اور مواد کی فراہمی کے لیے ملک اور بیرون ملک کی لائبریریوں اور کتب خانوں تک سے معلومات فراہم کیں۔ وجہ سے یہ کتاب گورو صاحبان پر ایک ماخذ کی حیثیت حاصل کرسکی ہے۔

'اردو شاعری میں گورو صاحبان کی عظمت' ڈاکٹر ریحان حسن کی تحقیقی کتاب ہے۔ یہ کتاب کل گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب: 'اردو اور گورو صاحبان' کے عنوان سے ہے، دوسرا باب: 'اردو شاعری میں گورو نانک جی کی عظمت' پر ہے، اس میں 67 اہم لوگوں کے مضامین شامل ہیں، جس میں اللہ یار خان جوگی، برق دہلوی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، جوش ملسیانی، ساحر ہوشیار پوری، شفقت کاظمی، منور لکھنوی، مہدی نظمی، نظیر اکبرآبادی، وویا ساگر آنندی وغیرہ خاص ہیں، تیسرا باب: 'اردو شاعری میں گورو انگد دیو جی کی عظمت' کے موضوع سے ہے جس میں دو مضمون، 'پنڈیداس قمر اور مہدی نظمی' کا ہے، چوتھا باب: 'اردو شاعری میں گورو امرداس جی کی عظمت' پر ہے، اس میں دو مضامین ہیں، پانچواں باب: 'اردو شاعری میں گورو رام داس کی عظمت' پر ہے اس میں تین مضامین ہیں، چھٹا باب: 'اردو شاعری میں گورو ارجن دیو جی کی عظمت' کے عنوان سے ہے اس میں دو مضامین ہیں، ساتواں باب: 'اردو شاعری میں گورو ہرگوبند جی کی عظمت' کے نام سے ہے اس میں تین مضامین شامل ہیں، آٹھواں باب: 'اردو شاعری میں گورو ہررائےجی کی عظمت' سے ہے جس میں دو مضامین ہے، نواں باب: 'اردو شاعری میں گورو ہرکشن جی کی عظمت' کے موضوع سے ہے جس میں دو مضامین ہے اور دسواں باب: 'اردو شاعری میں گورو تیغ بہادر جی کی عظمت' سے متعلق ہے اس میں بھی دو مضامین ہیں، اسی طرح گیارہواں باب: 'اردو شاعری میں گورو گوبند سنگھ کی عظمت' کے موضوع سے ہے جس میں کل بائیس مضامین شامل ہیں ان میں اخگر فیروزآبادی، امر چند قیس، برہم ناتھ دت، پرتھوی راج ہوش، پنڈیداس قمر، تیجیندر گلاٹی ادا، صابر ابوہری، کرشن موہن، گیان چند منصوری، مہدی نظمی اور یعقوب مسیح سلام قابل ذکر ہیں۔ اس توضیح کے بعد یہ اندازہ بحسن خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کیا ہے، ساتھ ہی اس کی قدر وقیمت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو کے شعرا نے جہاں اپنا کلام حضرت محمد مصطفیٰ، حضرت علیؓ ودیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی اجمعین کی شان لم یزل میں نعت اور منقبت کی شکل میں کہے، وہیں رام کرشن جی، رام چندر جی اور گورو نانک دیو جی کی عقیدت وعظمت کے اعتراف میں نظمیں بھی کہی ہیں ابوظفر نازش کی ایک خوبصورت نظم 'حق آگاہ نانک' کے عنوان سے گورو جی کی شان میں کہی ہے جس کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

درس یکجہتی سے مردانہ کو بالا کردیا　　دم میں یہ دو ہستیاں مشہور دوراں ہوگئیں
اور دونوں سے یہ فرمایا سنوائے دوستو　　کاوشیں اپنی غم عالم کا درماں ہوگئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

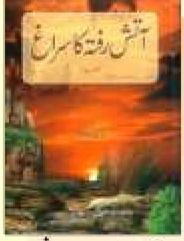

آتش رفتہ کا سراغ (اداریے)

مصنف: ڈاکٹر حسن رضا، مرتب: ساجد انصاری ندوی

صفحات: 255، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ادارہ ادب اسلامی ہند، نئی دہلی

مبصر: محمد حسین، روم نمبر: 312، کاویری ہاسٹل جے این یو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر حسن رضا کے اداریوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر حسن رضا رانچی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور ادارہ ادب اسلامی ہند دہلی کے صدر کی حیثیت سے ادارے سے شائع ہونے والے رسالے 'پیش رفت' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ یہ کتاب ماہنامہ پیش رفت میں شائع ہونے والے اداریوں کا مجموعہ ہے جسے ساجد انصاری ندوی نے ترتیب دیا ہے۔

اداریہ کسی بھی رسالے کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ بعض رسالے اپنے اداریوں کی وجہ سے ہی مشہور ہوتے ہیں۔ تو بعض رسالوں میں اداریے محض خانہ پری اور ذمے داری نبھانے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن رضا ایک علمی شخصیت کا نام ہے اس لیے ان کے اداریے علم وآگہی، فکر ونظر اور بصیرت سے بھرپور ہوا کرتے ہیں۔ ان کے اداریے مختصر ہوتے ہیں لیکن اختصار میں جامعیت ہوتی ہے۔ خاص بات یہ کہ ان کے اداریے

پڑھنے کے بعد آپ کو یہ احساس ضرور ہوگا کہ اگر مدیر اس موضوع پر مزید لکھتے تو بھی آپ ضرور پڑھتے۔ ہر شمارے کا اداریہ الگ الگ موضوع پر لکھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر حسن رضا کے اداریوں میں ایک منطقی ربط موجود ہے اس لیے ان اداریوں کو مرتب نے تین بڑے موضوعات میں سمویا ہے:

1. ادب کا اسلامی پس منظر، مسائل اور حل
2. ادبی تخلیقات اور تحریک اسلامی کا حصہ
3. مختلف اصناف ادب اور نمائندہ شخصیات

ادب، اسلامی ادب اور تحریک ادب اسلامی پر ڈاکٹر حسن رضا نے اپنے متعدد اداریوں میں بڑی عالمانہ اور فاضلانہ گفتگو کی ہے۔ دلچسپ یہ ہے کہ ان کی باتیں دلائل سے بھی مزین ہوتی ہیں۔ خوبصورت الفاظ اور پرکشش تعبیرات کے ذریعے قاری کو اپنے حصار میں لینے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ادبی ناقدین اور محققین اسلامی ادب کو ادب کے خانے میں اکثر نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کی نظر میں زندگی میں جتنے رنگ ہیں ان سب رنگوں کی گنجائش ادب میں ہوتی ہے جبکہ اسلامی ادب کا مطلب ایک خاص مذہب کے خاص نظریے کی تبلیغ ہے۔ اس لیے ادبا و ناقدین کے یہاں 'اسلامی ادب' نام کی شے کی گنجائش نہیں۔ لیکن اسلامی ادب کے شیدائی بھی اپنی باتوں کو مدلل طریقے سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر حسن رضا تخلیق، تنقید اور ادبی تحریکات کی تاریخ کو اردو کے ادیب و ناقد کی طرح پیش کرنے کے ساتھ اسلامی ادب کو بھی اسی صف میں جگہ دیتے ہیں۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، تانیثیت تمام تحریکات و رجحانات پر اپنی رائے رکھنے کے ساتھ اسلامی ادب کو بھی ان رجحانات کی صف میں جگہ دیتے ہیں۔ بات اتنے سلیقے سے کرتے ہیں کہ ان سے اتفاق نہ کرنے والے بھی ایک بار ان کی بات کو سننا اور پڑھنا ضرور چاہیں گے۔ مثلاً ڈاکٹر حسن اپنے ایک اداریے میں تخلیق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ادب کے مسائل ٹریڈ یونین کے مسائل نہیں ہیں اور ادب کی تخلیق فیکٹری کے پروڈکشن سے بہت مختلف ہے۔ ہم پر یہ بات بالکل واضح رہنی چاہیے کہ تالاب کو گہرا، صاف ستھرا اور اس کی گھیرابندی کر کے مچھلی تو پالی جاسکتی ہے لیکن اس کی تہوں میں موتی نہیں اگائے جاسکتے۔'' (ص 37)

ایک مقام پر فن کار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''فن کار اپنے دھڑکتے ہوئے دل کی ایک دھڑکن، شعور کے رو کی ایک کرن، جذبے کی گرمی کی ایک آنچ فن کی کسی ایک صنف کے قالب میں ڈال دیتا ہے۔ جس سے لفظوں اور کہانی کے پلاٹ میں ایک نئی حرارت، ایک نئی چمک اور زندگی آجاتی ہے، جس سے شعور سرشار ہوتا ہے اور طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔'' (ص 38)

ایک اداریے میں ادب کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے ادراک واحساس، خواب وخیال، شعور کی اخلاقی اور جمالیاتی ساخت کا تخلیقی توانائی سے حرارت لے کر حسن اظہار کے مختلف اسالیب میں ڈھل جانے کا نام ادب ہے''

تانیثی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے شہناز نبی، پروین شاکر اور کشور ناہید کی شاعری سے چند مثالیں پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر حسن رضا لکھتے ہیں کہ:

''اگر ایسی فن کار خواتین اور زرخیز صلاحیتوں کی حامل عورتوں کے ادب کو اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعے کے بعد نسائی ادب کے خانے میں رکھا جائے تو اسلامی ادب کی تعمیر میں ہمارا ایک مثبت اور تعمیری رویہ ہوگا اور اس طرح نسائی ادب کے مطالعے میں تخصص کے لیے ایک علاحدہ باب رکھا جائے تو تعمیری ادب کے دامن میں ایک وسعت پیدا ہوگی اور اس کو ترچھی نظر سے دیکھنا، تنگ نظری کا ثبوت ہوگا''

میرے خیال سے اسلامی ادب کے حلقے سے تعلق رکھنے والے کسی قلم کار کے قلم سے اس طرح کا تاثر اپنے آپ میں حیرت انگیز ہے۔ میر، اقبال اور فیض کی شاعری، اکبرالہ آبادی کے طنز و مزاح کی معنویت، محمد حسن عسکری کی تنقیدی بصیرت اور اسلامی ادب، تہذیبوں کے میل جول میں ادب کی معنویت (امیر خسرو کے حوالے سے) جیسے موضوعات پر لکھے گئے اداریے بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

حاصل یہ کہ ڈاکٹر حسن رضا کے اداریوں کا مجموعہ (آتش رفتہ کا سراغ) علم وادب کے شیدائیوں کے لیے، بالخصوص اردو ادب، تنقید، تحقیق اور ادبی رجحانات کے ساتھ اسلامی ادب کے ارتقا اور اسلامی ادب کے تخلیق کاروں سے واقفیت کے لیے معاون ثابت ہوگا۔

شاعری

لمحوں کے قدم

شاعر: ڈاکٹر معصوم شرقی

صفحات: 160 قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز دہلی

مبصر: ایم نصر اللہ نصر' ہوڑہ

ڈاکٹر معصوم شرقی اردو شعر و ادب کا ایک معروف نام ہے۔ اردو کے عالمی قلمکاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک زمانے سے اردو ادب کے اوراق کو اپنی نادر تخلیقات سے زینت بخش رہے ہیں۔ ان کی مطبوعہ تصنیفات میں عکس تاب (شعری مجموعہ) نظیر ثانی۔ اشک امرتسری (تحقیقی مقالہ) تراوش قلم (فن اور شخصیت) ادب واحتساب (تحقیقی، علمی وادبی مضامین) کلکتے کا ادبی ماحول بیسویں صدی میں، ادب جہاں (تحقیق، تنقید اور تفہیم) اور لمحوں کے قدم (نظموں کا مجموعہ) شامل ہیں۔ یہ ساری کتابیں ڈاکٹر معصوم شرقی کی ادبی وعلمی نیز شعری' تنقیدی اور تحقیقی صلاحیت اور شعور وفہم کی وکالت کرتی ہیں۔

پیش نظر کتاب 'لمحوں کے قدم' نظموں پر مشتمل ہے جس میں ان کی مختلف اقسام کی نظمیں شامل ہیں جو قارئین کو کافی متاثر کرتی ہیں ان کی نظموں میں عصری آگہی' ذاتی مسائل اور تجربات حیات ومشاہدات ذات نیز معاشرے وسماج کی عکس ریزی موجود ہے۔ نظم نگاری سے متعلق شاعر کا اپنا خیال ہے:

''نظم کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ غزل اور اردو شاعری کی ہے۔ نظم بنیادی طور پر شاعرانہ تجربے کی داخلی پیشکش کا نام ہے۔ یہ شاعر کے انفرادی ردعمل کا فنکارانہ اظہار ہے۔ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نظم ایک ایسے منظوم جذبے کے اظہار کا نام ہے جس میں خیالات و واقعات کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ جذبات کا اظہار انسان کا فطری عمل ہے۔ ایک حساس شاعر اپنے احساسات کو رنگ روپ دینے پر قادر ہوتا ہے۔''

(لمحوں کے قدم ص 25)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنے بیان کو ملحوظ خاطر رکھ کر اچھی اور خوبصورت نظم نگاری کی ہے۔ ان کی نظموں میں جہاں سادگی ہے وہیں فکر کی بالیدگی بھی ہے۔ توازن اور اعتدال ہے۔ بلند فکر ونظر کے عناصر کے تناسب سے ان کی نظموں میں کافی نکھار در آیا ہے۔ بصری حسیات پر ان کی گرفت اتنی چست ہے کہ نظم کا شعری آہنگ بلند ہوگیا ہے۔ خیال کی تازہ کاری بھی ان کی خصوصیات میں اضافہ کرتی

ہے۔ ایسی نظموں میں 'لمحوں کے قدم' 'کلکتہ' 'مجرم' 'آگہی' 'ضرب اور تقسیم' 'مذہب' 'لب جاں بخش کے بوسے' 'روح اور رشتۂ جسم و روح' قابلِ توجہ اور قابلِ تحسین ہیں۔

'لمحوں کے قدم' اس مجموعے کی کلیدی نظم ہے جس میں ڈھلتی ہوئی عمر اور ضعیفیت کے شکار شخص کی تشویش ناک سوچ اور جاں گسل احساس کو سلیقے سے نظم کیا گیا ہے۔ ماضی اور حال کے نامساعد حالات سے گزرتے ہوئے اسے احساس ہو رہا ہے کہ اس کے مستقبل کے سینے پر بھی انھیں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دے گی اور زندگی کے آخری لمحات کو بھی سکون میسر نہیں ہوگا جو ایک کھلی حقیقت ہے۔

'مجرم' ان کی دوسری ایسی نظم ہے جس میں اس جرم کا احساس دلایا گیا ہے کہ جب کسی معصوم انسان سے کسی بے گناہ شخص کو نقصان پہنچتا ہے تو وہ احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کے جرم کا راز فاش نہ ہو جائے اور وہ سر بازار رسوا نہ ہو جائے۔

'آگہی' میں ایک ایسی حقیقت کا خلاصہ کیا گیا ہے جس کا احساس ہوتے ہوئے بھی لوگ جشن سالگرہ سے باز نہیں آتے۔ ہر سالگرہ کے موقع پر وہ یہ جانتے ہوئے بھی جشن مناتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ایک سال کم ہو گیا اور وہ اپنی موت کے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نظم میں ایک خوبصورت فکر کو نہاں سے عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

'ضرب اور تقسیم' بھی کچھ اسی طرح کی سوچ کا عکس ریزہ ہے۔ اللہ کی نعمتوں کو ہم اپنی زندگی کے دن سے ضرب دیتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے لیے کتنے لوازمات فراہم کیے ہیں جن کا ہم جتنا بھی استعمال کریں کم نہ ہوں گے لیکن پھر انھیں سے جب ہم عرصۂ حیات کو تقسیم کرتے ہیں تو اس کی مدت کافی کم ہو جاتی ہے۔ انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن اللہ کے اکرام میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لیکن انسان کے پاس صبر اور قناعت کہاں۔ ان کی نظمیں ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں۔ استعاروں اور اشاروں میں بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ روح فرسا حادثات و تجربات کی دلکش تصویر کشی بھی کرتی ہیں۔ سب سے بڑی بات ان کی نظموں کا دلکش اسلوب ہے جو کافی پسندیدہ ہے۔

موضوعاتی نظموں میں ان کی بیشتر نظمیں فن نظم نگاری کے تقاضے کو پوری کرتی ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنی نظموں میں مہارت اور فنکاری سے اپنے گرانقدر خیالات 'گہرے جذبات' فکری تصورات اور تاثرات کو نظموں کے حوالے کیا ہے۔ ان کی نظموں کی سادگی اور سنجیدگی سے متاثر ہو کر حقانی القاسمی رقم طراز ہیں:

''معصوم شرقی کی نظمیہ شاعری احساس و آگہی کی نئی لہروں سے روبرو کرانے کے ساتھ تازہ امکانات سے بھی روشناس کراتی ہے۔ انھیں ماضی کی اذیتوں اور مستقبل کی آہٹوں کا ادراک ہے۔ پرانی قدروں کے ساتھ ہی نئی قدری ترجیحات کا بھی علم ہے۔''

بیشک بڑی معصومیت سے کہی گئی ان نظموں میں متانت 'ملاحت نیز تنبیہ و تاکید کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ عصری آگہی اور معاشرتی سوجھ بوجھ کے جگنو بھی رقص کرتے نظر آرہے ہیں۔ بوقلمونی کی جگمگاہٹ بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی نظم 'روشنی کا المیہ' ملاحظہ فرمائیں:

شب کے خاموش ماحول میں/ حوصلے کی ردا اوڑھ کر
سوختہ جاں پتنگوں کا لشکر/ جذبۂ عشق دل میں لیے
بے خبر ہو کے انجام سے/ شمع کا کر رہا تھا طواف
رات خاموش بہتی رہی!!

انھوں نے موضوعاتی نظموں کے علاوہ شخصیاتی اور تاثراتی نظمیں بھی رقم کی ہیں۔ نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ قومی یکجہتی اور بچوں کے تعلق سے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ کثیر الجہات شخصیات کو بھی دام سخن میں لیا ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

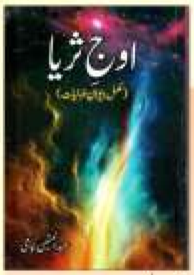

اوج ثریا (مکمل دیوان غزلیات)

مصنف و ناشر: عبدالمتین جامی
صفحات: 176 قیمت: 200 سنہ اشاعت: 2019
ناشر: روشان پرنٹرس، دہلی
مبصر: حبیب سیفی، فرسٹ فلور حوض رانی E12/51B مالویہ نگر، نئی دہلی 17

عبدالمتین جامی کا تازہ شعری مجموعہ اوج ثریا (مکمل دیوان غزلیات) میں اس دور کی سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تصویر واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے تو وہ مشاق لکھاری ہیں۔ کرنوں کی لہر، رنگیں محل، طوفان، جھونپڑی، حقیر لوگ، محو رقص، اپنی روایتیں، خوش فہم دوستوں، بغض و عداوت، حیوانیت، اندھیرے، قطرۂ شبنم، چیخ، امن و امان، پامال، عافیت، شخصیت، دھول، پتھر وغیرہ جیسے بے شمار لفظوں کو ایک نئے ڈھنگ سے برت کو اپنی شاعری کا لوہا منوانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جامی کہنہ مشق شاعر ہیں، نشاط آگہی، بساط سخن، مونس سخن، ترانہ جاویدان کے شعری مجموعے ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ پرانے کپڑوں کا سوداگر اور ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ بعنوان نئی تنقیدی جہات شائع ہوا۔ آپ کے مضامین اور شاعری ملکی ادبی رسائل میں خاص وقعت کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ اوج ثریا کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی خیال آیا کہ جامی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نئی سمت دینے اور ان کے ذہنی افق کو وسعت بخشنے میں جامی کی صحبیات کا بڑا دخل ہے، جس سے مفید اضافے علم میں ہوئے اور اوج پر یہ شاعری دکھنے کی چاہت انھوں نے اپنے دل و دماغ میں بٹھالی یہ کہتے ہوئے کہ۔

قدر کہن ہے مرے مزاج کا ضامن ۔۔۔ وقت کے سانچے میں تو نہ ڈھال مجھے
اب سادگی فکر گئی اور خلوص بھی ۔۔۔ معنی بدل چکی ہے ابھی عید کی زباں

خونی رشتوں، میل ملاپ والوں اور رابطہ کاروں میں سادگی کے گم ہو جانے، خلوص کے کم ہو جانے، خوشی کے لغوی معنی بدل جانے کی جو بات آج کے زمانے کو دیکھتے ہوئے کہی ہے وہ وہی لکھ سکتے ہیں، کیوں کہ اب سے 20 یا 30 برس پہلے تک بھی سادگی، خلوص، عید کی خوشی مل جایا کرتی تھی۔ عبدالمتین جامی آزاد ہندوستان کے شہری ہیں، جولائی 1950 میں آپ کی پیدائش ہوئی اور اب تک زندگی کی 70 بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جس سے آپ کا اندرونی کرب، زخمی احساس اور آرزومندی کا جذبہ جھلکتا ہے۔ کچھ کم نصف صدی شعور کی پختگی اور بلوغ فکر میں صرف کر دی تب جا کے کہیں یہ بات جامی کھل کر کہہ پائے کہ۔

لفظوں کی ادائیگی میں وقت ۔۔۔ لہجے میں زبان چھوڑتا ہوں
خوف دہشت ہے سدا کیا باعث ۔۔۔ ہم کو ملتی ہے سزا کیا باعث

اپنے عہد کے اجتماعی شعور کی ترجمان شاعری کو بھلے ہی قدر کہن کا نام عبدالمتین جامی دیں مگر سچائی یہی ہے کہ موجودہ سماج کی یہ شاعری آئینہ دار ہے۔ میری نظر میں طائر فکر کا دم گھٹنے سے اس لیے بچ گیا کہ خیالات کا محدود آسمان ہونے کے بعد بھی جامی نے جرأت و ہمت سے کام لیا اور اس معیار کے شعر کہے ہیں جن کے مصرعوں پر گرہ لگانا تک مشکل ہے۔ اپنے عہد کو جینے والا اگر کوئی ادیب یہ کہے کہ میں کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں، یا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے، تو کون یقین کرے گا، یہی وجہ ہے کہ عصری حالات یا عصر حاضر کے بہت سے مسائل سے انہیں شکایت ہے، اور ہر سطح پر ہونے والی ناہمواری کا احساس انھوں نے بخوبی بیان کیا ہے، مثلاً

مشکل سے ہوں حیات کی رہ پر میں گامزن ۔۔۔ ہر ہر قدم پہ دیتا رہا ہوں میں امتحاں

فضا میں سنتا ہوں میں اضطرار کی آہٹ — خموشیوں میں نہاں انتشار کی آہٹ
پڑھنا ہے مجھ کو وقت کا اک اور اقتباس — اے زندگی تو اپنی مقدس کتاب کھول
پیار کے کھیت میں نفرت کی شجر کاری ہے — آپ کے ذہن کی اوقات سمجھ سکتا ہوں
ہر طرف اٹھنے لگی ہے اک صدائے احتجاج — سانس لینا بھی ہوا اس دور میں کتنا گراں

ملک و قوم کا احوال بیان کرنے سے گریز نہیں کیا ہے، بلکہ یہ ذمے داری بھی خلوص کے ساتھ ادا کی ہے۔ وہ جانتے ہیں صداقتوں کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھنے والے بہت سے شعرا رہے ہیں اور آتے رہیں گے، اپنے مشاہدات و تجربات سے بھی نئی گل کاریاں دکھائیں گے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاعری کے اوجِ ثریا پر وہ پہنچ پائیں گے یہ کہنا قبل از وقت مشکل ہے۔

عبدالمتین جامی کی شاعری پر مشاہیر نے جس طریقے سے رائے دی ہے اس کا نقل کیا جانا یہاں غیر مناسب ہے۔ بلراج کومل، پروفیسر عبدالمغنی پٹنہ، علی احمد جلیلی، پروفیسر کرامت علی کرامت، مصور سبز واری، ظہیر غازی پوری، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر محفوظ الحسن، ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری، سعید رحمانی، ناوک حمزہ پوری، رشید حسن خاں، رام پرکاش راہی، زین رامش، عتیق احمد عتیق، ساحل احمد، ظفر ہاشمی، ابن فرید، جلیس سہسوانی، اقبال متین، تاج پیامی، شکیل گوالیاروی، احتشام اختر، راہی فدائی، فضا ابن فیضی، خاور نقیب، اظہر نیر اور بمع شہناز انجم نئی دہلی سبھی کی تحریروں کے اقتباس بھی دیے جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے خط کا حوالہ اس لیے شامل کیے لیتا ہوں تاکہ ایک سطر میں جو بات ہے، ہوسکتا ہے کسی کی سمجھ میں ساری شاعری کے بعد بھی نہ آئے۔ فاروقی کے مطابق: آپ کی زبان بہت شستہ اور شائستہ ہے۔ کلام میں روانی اور شگفتگی ہے۔ بڑے عموماً نپے تلے جملے ہی لکھتے ہیں'' وقت کے سانچے میں خود کے نہ ڈھلنے دینے کا اشارہ اپنے کلام میں دینے کے باوجود فاروقی صاحب سے عبدالمتین جامی نے جامِ سند حاصل کر ہی لیا، اسے کہتے ہیں قسمت کا دھنی ہونا۔ مجموعہ کے نام کا حق بھی بخوبی ادا کیا ہے۔ نئی نئی تشبیہات و نادر استعارات نے اوجِ ثریا مجموعہ غزلیات میں بڑی دلکشی پیدا کردی ہے، اس کا ثبوت یہ اشعار ہیں۔

گرچہ لفظوں نے کھوئے ہیں معنی — پیش کرتا ہوں بے خودی کا جواز
خورشید علم و فن کی شعاعیں ہیں ہم سفر — محدود روشنی کی وہ محفل سجائے کیوں
بساطِ زیست پہ مہرے بہت ملے لیکن — پہنچ گیا ہوں وہاں ہم زباں نہیں ہے کوئی
بحرِ یقیں نے سارے جہاں کو کیا تھا غرق — ہم رہ گئے تھے موجۂ جذبات دیکھتے

بہرحال اوجِ ثریا شعری مجموعہ اپنے سرورق، طباعت اور کمپوزنگ کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے، جس کی خاطر خواہ پذیرائی کی جانی چاہیے۔ میرے نزدیک یہ شاعری اردو شاعری کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس سے آنے والی نسلیں اکتساب کرتی رہیں گی۔

مکاتیب

نقش ہیں سب نا تمام

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی

صفحات: 314، قیمت: 300 روپے

ناشر: گونج پبلی کیشنز، نظام آباد

مبصر: زرقا رحمٰن، پرنسپل علامہ اقبال اسکول، سنبھل یوپی۔ 244302

یہ کتاب ڈاکٹر محمد ناظم علی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو گاہے بہ گاہے رہنمائے دکن، سیاست، منصف، اعتماد، راشٹریہ سہارا، ہمارا عوام، صحافی دکن، نظام آباد مارننگ ٹائم، آج کا نظام آباد، آج کا تلنگانہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خطوط مذہبی، سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، اخلاقی و معاشرتی، لسانی اور ادبی موضوعات و مسائل پر مبنی ہیں۔ موضوعات دیکھ کر ان مراسلات کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مصنف کتاب ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار قلم کار ہیں۔ اس سے قبل آئینۂ عصر، روحِ عصر، عکس ادب، حیدرآباد کے ادبی رسائل، آل احمد سرور فکر و فن، ادبی بصیرت، تنقیدی فکر، افکارِ جدید کے عنوانات سے آپ کی آٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

یہ کتاب چونکہ مراسلوں پر مبنی ہے اور مراسلوں میں زیادہ تحقیق و تفصیل تو ہوتی نہیں پھر ایسے مراسلے جو اخبار و رسائل کے لیے تحریر کیے جائیں ان میں تو اختصار کو ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان مکتوبات میں کوئی تحقیقی و تفصیلی بات تو ہے نہیں تاہم اپنے موضوعات کی بنیاد پر ان کی اہمیت ضرور تسلیم کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ 'حرف آغاز' میں مصنف نے خود ہی اس کا اعتراف کیا ہے:

''مراسلے اپنے دامن میں عصری حسیت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وقتی اور عصری حالات اور حادثات و حوادث کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ مراسلے میں تازہ عصری کوائف کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت اور تاریخی بن جاتی ہے۔ خاص کر نوجوان طبقے کے لیے پیغام ہے۔'' (ص6)

اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر سیادت علی نے تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے مراسلوں کی اہمیت کا اعتراف کچھ اس طرح کیا ہے۔

''کوئی بھی اہل علم اپنے ماحول میں ناہمواریوں اور ناانصافیوں کو دیکھ کر خاموش نہیں رہتا۔ پہلے دماغ میں جنبش ہوتی ہے۔ پھر قلم کے ذریعے کتاب، رسالہ یا اخبار کو اپنا ذریعہ بناتا ہے۔ مراسلات تو اس کی انتہائی شکل ہے۔'' (ص7)

اگرچہ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر مشتمل مراسلوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ تاہم ان کی کسی طرح کی زمرہ بندی یا ابواب بندی نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی ان کی الف بائی (حروف تہجی) کے اعتبار سے کوئی ترتیب ہے۔ جس کی وجہ سے قارئین کو کسی خاص موضوع کے تحت مراسلے تلاش کرنے میں دقت و پریشانی ہوسکتی ہے۔ مگر کتاب پڑھنے پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کچھ خطوط بڑے اہم و گراں قدر بھی ہیں۔ جن کے توسط سے مکتوب نگار نے قارئین کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر تعلیمی نوعیت اور سماجی برائیوں اور غلط رسومات کے تدارک کے سلسلے میں لکھے گئے مراسلات بڑے ہی اہم ہیں۔ جن کے ذریعے مکتوب نگار نے قوم کے نوجوانوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلانے اور ان کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اور سماج میں پھیلی ہوئی غلط رسومات اور بیہودہ رسم و رواج پر نہ صرف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ بلکہ ان کو سماج کا ناسور قرار دیتے ہوئے پوری طرح سے ختم و نابود کرنے کی پرزور سفارش کی ہے۔

کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ثبوت ہی کافی ہے اس کی اشاعت کے لیے 'تلنگانہ اردو اکادمی' کا مالی تعاون شامل رہا ہے۔ یہ کتاب طباعت و اشاعت کے اعتبار سے پوری طرح معیاری ہے۔ اور عمدہ کاغذ پر طبع کی گئی ہے۔ ■

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

آزادی کے بعد مرثیے کی جمالیات

سنبھل: شعبۂ اردو ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی اشتراک سے بتاریخ 8 فروری 2020 کو ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کا موضوع 'آزادی کے بعد مرثیے کی جمالیات' تھا۔ مجلس منتظمہ ایم جی ایم کالج سنبھل کے نائب صدر، ممبر پارلیمنٹ الحاج ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے اس سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی جبکہ سنبھل کے ضلع مجسٹریٹ جناب

اویناش کرشن سنگھ اس اجلاس کے مہمان خصوصی تھے۔ اس اجلاس میں مہمان ذی وقار کی حیثیت سے فارسی و اردو کے مستند و معتبر ادیب پروفیسر عراق رضا زیدی (صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) موجود تھے۔ اس اجلاس میں کلیدی خطبہ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین (سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) نے پیش کیا، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف اور ڈاکٹر فہیم احمد نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ کالج کے پرنسپل اور سمینار کے کنوینر ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے کہا کہ شاعری کی جمالیات کے کینوس کی بھرپور طریقے سے جو صنف نمائندگی کرتی ہے وہ مرثیہ ہے۔ مرثیہ انسانی اقدار سے لے کر فنی جمالیات کے ہر تقاضے کو پورا کرتا ہے جس کا اشارہ بہت پہلے انیس نے اپنی شاعری میں پیش کیا تھا۔ اس موقعے پر استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کالج مجلس انتظامیہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب سنجے اگروال نے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام قومی یکجہتی کے فروغ میں معاون ہوتے ہیں جو وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور ادیبہ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین نے کہا کہ شروع سے ہی اس صنف کے تعلق سے بے اعتنائی برتی گئی لیکن ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے شبلی جیسے صاحب نظر کا جس نے مرثیے کی جمالیات کو محسوس کیا۔ انھوں نے مرثیے کی جمالیات کے ادراک کے لیے مرثیے کے دو عظیم شاعروں انیس و دبیر کا انتخاب کیا اور پہلی بار مرثیے کو عقیدت سے نکال کر فن کی حیثیت سے پیش کیا۔

فارسی و اردو کے مشہور ادیب پروفیسر عراق رضا زیدی نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ موضوع ہماری شاعری کے فنی جمالیات اور اس کی سمت کے تعیین کی راہ ہموار کرتا ہے۔ انھوں نے اردو مرثیے سے متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے مرثیے کی جمالیات کی تفہیم کرتے ہوئے کہا کہ آج کا شاعر جمالیات سے بخوبی واقف ہے اور اس کے شعری جمالیات کا کینوس بہت ہی وسیع ہے۔

افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی ضلع مجسٹریٹ جناب اویناش کرشن سنگھ نے کہا کہ مرثیے کی جمالیات کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ مرثیہ تمام ہندوستانیوں کو ایک کرنے کا کام کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی فن پارے کا جمالیاتی پہلو یہی ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ مرثیے میں ہر مذہب و ملت کے شعرا کا ہونا ہی اس کے جمالیاتی پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس موقع پر اپنی صدارتی تقریر پیش کرتے ہوئے مشہور سیاست داں اور سنبھل کے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے کہا کہ مرثیہ وہ فن ہے جو ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ فن ہے۔ دوسرا اجلاس 11:30 بجے شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر احتشام عباس حیدری، ڈاکٹر ڈی این شرما اور ڈاکٹر عبدالرب نے کی۔ اس اجلاس میں کلب عباس اشہر نے عصر حاضر میں لکھنؤ کے اردو مرثیے کی جمالیات، محمد عامل نے جدید اردو مرثیوں میں اسلحوں کی جمالیات، ڈاکٹر شیخ نگینوی نے سراج سکراج مل کے شخصی مرثیوں کی جمالیات، عظمیٰ ریاض نے روپ کماری کے مرثیوں کی جمالیات، شمائلہ علیم نے طیب کاظمی کے مرثیوں کی جمالیات، ندا علیم نے نجم آفندی کے مرثیوں میں جمالیات کے اشارے اور ڈاکٹر اکرم پرویز نے اردو مرثیوں کے لباس کی جمالیات پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ہما فاطمہ نے کی اور ڈاکٹر این شرما اور احتشام عباس حیدری نے مقالات پر اپنے تاثرات پیش کیے۔

دوسری طرف مساوی اجلاس اردو بھون میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر پربھا شرما، ڈاکٹر اکرم پرویز اور ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے کی۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر نشاں زیدی نے مہدی نظمی کی جمالیاتی جہات، ڈاکٹر ریحان حسن نے مراثی نسیم کی جمالیات، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برکاتی نے روہیل کھنڈ کی شاعرات کے مرثیوں کی جمالیات، ڈاکٹر ارشد رضوی نے رام پور کے مرثیہ نگاروں کی جمالیات، میر شاہ حسین نے میر نظیر باقری کے مرثیوں کی جمالیات، سلمان نبی اشرفی نے کیفی سنبھلی کے مراثی کی

جمالیات، ڈاکٹر فرقان سنبھلی نے جمالیات اور جدید مرثیہ موضوعات پر اپنے مقالات پیش کیے۔

چائے کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس اردو بھون میں منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر عباس رضا نیر، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر محمد ارشد رضوی، ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے مشترکہ طور پر کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر احتشام عباس حیدری نے پیام اعظمی کے مرثیوں کی جمالیات، ڈاکٹر عبدالرب نے ثمر ہلوری کے مرثیوں کی جمالیات، ڈاکٹر عباس رضا نے وحید اختر کے مرثیوں میں جمالیاتی پہلو، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے امروہہ کے جدید مراثی میں جمالیاتی عناصر، ڈاکٹر مرزا شفیق حسین نے جمیل مظہری کے مرثیوں کی جمالیات، ڈاکٹر عفت ذکیہ نے قیصر بارہوی کے مرثیوں کے جمالیات کی انفرادیت، نصرت مہدی نے نوگاواں سادات کے مرثیوں کی جمالیات پر مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر ہما فاطمہ نے کی۔

لنچ کے بعد سہ پہر تین بجے اختتامی اجلاس کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مشہور ادیب و محقق پروفیسر حسن عباس (ڈائرکٹر رامپور رضا لائبریری رامپور) نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تشریف لائے مشہور نقاد پروفیسر مولا بخش تھے۔ اس اجلاس میں مہمان ذی وقار کی حیثیت سے مشہور شاعر ڈاکٹر نسیم الظفر، کالج کے خزانچی جناب گیان پرکاش گپتا اور استاد شاعر سید اظہر حسین آہ موجود تھے۔

مہمان خصوصی پروفیسر مولا بخش نے کہا کہ مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس کی لفظی جمالیات پر بحث کرنے کے لیے ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔ وہیں معنوی جمالیات کی تفہیم کے لیے قرآن، حدیث اور تاریخ جیسا وافر ذخیرہ ہے۔

صدر جلسہ پروفیسر حسن عباس نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو مرثیے کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہماری شعریات کی تفہیم اور اس کے تعین قدر کے لیے مرثیہ سے خوبصورت مواد کسی شاعری میں نہیں ہے۔ اس موقعے پر تمام مقالہ نگاروں اور معزز مہمانوں کو یادگاری نشان اور شال شعبہ کی طرف سے پیش کی گئی۔ آخر میں شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر محمد عمران خان نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ اختتامی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر فہیم احمد نے کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، پرنسپل/کنوینر سیمینار، سنبھل، 18 فروری 2020

خمار بارہ بنکوی – حیات وخدمات

نئی دھلی: خمار کسی بھی مشاعرے کی جان ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے مقبول

ترین شاعر تھے۔ خمار ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری اور آواز دونوں اچھی تھی۔ یہ باتیں معروف ادیب و ناقد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم نے خمار بارہ بنکوی کی حیات وخدمات پر منعقدہ ایک سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔ یہ سیمینار معروف سماجی تنظیم چراغ فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) جیت پور اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے اشتراک سے غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں منعقد کیا گیا تھا۔ سیمینار میں دہلی، بہار، اتر پردیش، پنجاب اور چھتیس گڑھ سے تشریف لائے اردو کے مندوبین نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سبھی نے خمار کی شاعری کو منفرد قرار دیا اور موجودہ وقت میں ان کے اشعار کی اہمیت واضح کی۔ سبھی مقررین نے خمار کے صد سالہ یوم پیدائش کے تناظر میں منعقدہ اس سیمینار کے لیے چراغ فاؤنڈیشن کی چیئر پرسن محترمہ سکینہ پروین کی ستائش کی۔

سیمینار میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد اور چندر دھاری متھلا کالج، للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد نے کہا کہ خمار اس دور کا شاعر ہے جب شاعری عوام سے دوبارہ رابطہ قائم کر رہی تھی۔ خمار کی نظمیں بھی اچھی ہیں اور ہمیں انھیں صرف غزلیہ شاعری تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔ بلاسپور چھتیس گڑھ سے تشریف لائے ساؤتھ ایسٹ سنٹرل ریلوے کے چیف کنٹرولر اور معروف افسانہ نگار و ناقد جناب خورشید حیات نے تکنیکی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ خمار کی شاعری میں کلاسیکی روایات تو ہیں ہی لیکن عصری معاملات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ خمار کی شاعری پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ معروف ادیب و ناقد جناب حقانی القاسمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ خمار کی شاعری میں خیال کی رعنائی اور رنگ کی ایسی آمیزش ہے جو قاری کو ایک نئی سرشاری سے شرابور کر دیتی ہے۔ حسن و عشق خمار کی شاعری کا محور و مرکز ضرور ہیں لیکن ان کی شاعری میں آج کے سماجی سروکاروں کی بھی بازگشت ہے۔ ان کے علاوہ گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر سے ڈاکٹر ریحان حسن، دہلی سے جناب منیر انجم، ڈاکٹر تسنیم بانو، گریٹر نوئیڈا سے ڈاکٹر نشاں زیدی، حیدرآباد سے ڈاکٹر شاہانہ مریم شان وغیرہ نے بھی مقالے پیش کیے۔ چراغ فاؤنڈیشن سے وابستہ محترمہ نسیم بانو کے اظہار تشکر پر یہ سیمینار اپنے اختتام کو پہنچا۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر عبدالحی نے کی۔ سیمینار میں خمار کی شاعری سے محبت کرنے والوں اور اردو زبان و ادب کے شیدائیوں کی مناسب تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز: عبدالحی، اسسٹنٹ پروفیسر، دربھنگہ، بہار، 4 اپریل 2020

مہاراشٹر میں اردو تحقیق وتنقید: ماضی، حال اور مستقبل

رتناگری: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور شعبۂ اردو گوگٹے جوگلے کر کالج رتناگری کے اشتراک سے 'مہاراشٹر میں اردو تحقیق وتنقید: ماضی، حال اور مستقبل' کے عنوان سے یک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی احمد شمسی نے کہا کہ خطۂ کوکن جہاں پہلے اردو کی تعلیم وتدریس کا کوئی نظم نہیں تھا، وہاں اب اردو زبان پھل پھول رہی ہے اور اس وقت اس خطے میں اردو کی سیکڑوں تعلیم گاہیں مصروف خدمات ہیں۔ معروف محقق و ناقد شمیم طارق نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ مہاراشٹر میں تحقیق وتنقید کی طویل تاریخ رہی ہے، اس خطے کے کئی تحقیقی وتنقیدی فن پاروں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر نے اپنے صدارتی خطاب میں مہاراشٹر میں اردو کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے اطمینان بخش قرار دیا۔ اس سیمینار میں کویت سے میمونہ چوگلے اور رتناگری کے معروف معالج ڈاکٹر علی میاں نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور ڈاکٹر مسرت فردوس (اورنگ آباد) ڈاکٹر شفیع ایوب (دہلی)، پروفیسر سلیم محی الدین (پربھنی)، ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)، ڈاکٹر رونق رئیس (بھیونڈی)،

رفیق جعفر (پونے)، ڈاکٹر عبدالباری (پونے)، ڈاکٹر عبدالرحیم اے ملا (بیجاپور)، ڈاکٹر صفیہ بانو (احمد آباد)، خان حسنین عاقب (پوسد)، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی (شیموگہ)، پرویز احمد (کامٹی)، جویریہ قاضی (بھیونڈی) اور دیگر اہل قلم و ریسرچ اسکالرز نے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر محبینِ اردو کثیر تعداد میں موجود رہے۔

روزنامہ ’سیاسی افق‘ 9 مارچ 2020

مجروح سلطانپوری: شخصیت اور شاعری

نئی دهلی: مجروح سلطان پوری ترقی پسند غزل کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ جب تک غزل زندہ رہے گی مجروح کو یاد رکھا جائے گا۔ یہ باتیں معروف ادیب و شاعر اور دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول

نے مجروح سلطانپوری کی شاعری پر منعقدہ قومی سیمینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔ یہ سیمینار معروف سماجی تنظیم پہل ورشٹی (رجسٹرڈ) آزاد پور اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے اشتراک سے غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں منعقد کیا گیا تھا۔ سیمینار کا آغاز خالد رضا خاں کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے تنظیم کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس موضوع پر سیمینار کرانے کی غرض و غایت بیان کی اور مجروح کی شخصیت اور شاعری پر بھی مختصراً اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے مہمان ذی وقار سی ایم کالج دربھنگہ کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد نے کہا کہ مجروح کی شاعری میں ایک موسیقی نظر آتی ہے۔ مجروح کی شاعری میں عصری حسیت کی گونج نغمگی کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ سیمینار کے دوسرے مہمان ذی وقار صفدر جنگ ہسپتال کے شعبہ یونانی کے صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مجروح نے ایک طبیب کے طور پر اپنا کیریئر شروع کیا اور بعد میں بطور ایک عظیم شاعر اپنی شناخت قائم کی۔ سیمینار میں کلیدی خطبہ معروف ناقد اور دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد کو پیش کرنا تھا لیکن اچانک درپیش آئی کسی مصروفیت کے سبب وہ شریک نہ ہوسکے اور ان کا مقالہ جناب عبدالباری قاسمی نے پڑھا۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد کے کلیدی خطبہ میں مجروح کی شعری انفرادیت پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ سیمینار کے افتتاحی سیشن میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ افتتاحی سیشن کے لیے کلمات تشکر معروف صحافی زبیر خان سعیدی نے ادا کیے۔

سیمینار کے تکنیکی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ مجروح سلطانپوری کا نام غزل کے ایک اہم شاعر کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مجروح اور فیض ترقی پسند شاعری کے دو اہم لعل و گہر ہیں۔ انھوں نے سبھی مقالوں پر اظہار خیال کیا اور مقالہ نگاروں کی تعریف کی اور کہا کہ سبھی نے محنت سے مقالے تحریر کیے ہیں۔ بلاسپور چھتیس گڑھ سے تشریف لائے ساؤتھ ایسٹ سنٹرل ریلوے کے چیف کنٹرولر اور معروف افسانہ نگار اور ناقد خورشید حیات نے اپنے مقالہ میں کہا کہ مجروح کے یوم پیدائش کو اکتوبر 2019 میں سو سال پورے ہوگئے اور اس شاعر پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے اپنے مقالے میں مجروح کی شاعری میں سیاسی رمزیت پر اظہار خیال کیا اور بتایا کہ مجروح احتجاج کی ایک توانا آواز تھے۔ ان کے علاوہ دوردرشن نیوز کے سابق ڈائرکٹر ادریس احمد خاں، گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر میں اردو ادب کے استاد ڈاکٹر ریحان حسن، کولکاتہ سے آئے سہ ماہی مژگاں کے مدیر نوشاد مومن، بچوں کے اہم ادیب سراج عظیم، ڈاکٹر محمد اسداللہ، ڈاکٹر یوسف رامپوری، غلام نبی کمار، محترمہ سریتا چوہان اور قمر جہاں نے مجروح کی شاعری کے حوالے سے پرمغز مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض جے این یو کے استاد ڈاکٹر شفیع ایوب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ تکنیکی اجلاس کی نظامت خان محمد رضوان نے کی۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے وابستہ ڈاکٹر ضیاء الرحمان کے کلمات تشکر سے یہ سیمینار اختتام کو پہنچا۔ سیمینار میں ممبئی کے معروف افسانہ نگار اور ناقد اشتیاق سعید، معروف شاعر احمد علی برقی اعظمی، ادب سلسلہ کے مدیر محمد سلیم علیگ، صدائے انصاری کے مدیر اطہر انصاری، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، سیاستداں جناب بادل خان، سماجی کارکن احسان احمد خاں، تھانیشور جی، اشوک گپتا، ڈاکٹر عبدالحی، سید کوثر حسین اور محمد زید کے علاوہ دہلی کی یونیورسٹیوں کے طلبا اور عمائدین شہر کی بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ ’قومی تنظیم‘ لکھنؤ، 9 مارچ 2020

مغربی اترپردیش میں اردو زبان وادب کا حالیہ منظرنامہ

ٹانڈہ رامپور: اردو کے فروغ کے لیے اردو سے محبت رکھنے والوں کو سنجیدہ ہونا ہوگا اور زمینی سطح پر کام کرنے ہوں گے۔ بچوں کی تعلیم سے لے کر دکانوں پر لگے بورڈوں تک میں اردو کو شامل کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار میرٹھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون

سے مدرسہ ضیاء الاسلام ٹانڈہ رامپور کے زیر اہتمام 15 مارچ 2020 کو منعقدہ سیمینار بعنوان ’مغربی اترپردیش میں اردو زبان وادب کا حالیہ منظرنامہ‘ میں کیا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے صدارتی تقریر کے دوران مقالہ نگاروں کے مقالوں پر بھی تبصراتی گفتگو کی۔ اردو کے معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے اپنے خطاب میں مغربی اترپردیش میں اردو کے ماضی وحال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مغربی اترپردیش میں اردو کا ماضی بہت تابناک رہا ہے لیکن موجودہ منظرنامہ اتنا خوشگوار نظر نہیں آتا، البتہ کچھ کرنیں ضرور ایسی دکھائی دیتی ہیں جن سے بہتر مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر سید اختیار

جعفری نے اپنے مقالے میں مغربی اتر پردیش کی حالیہ اردو صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فی زمانہ مغربی یوپی میں اردو صحافت کی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ نایاب حسن قاسمی نے اظہر عنایتی کی شاعری پر پُر مغز مقالہ پیش کیا۔ ہندو کالج مرادآباد کے لیکچرر جناب ڈاکٹر سمیع الدین شاداب خان نے بھی رامپور کی شاعری پر گفتگو کی۔ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر غلام نبی کمار نے مغربی اتر پردیش کی غزلیہ شاعری پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ وہیں پنجابی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر سالک جمیل براڑ نے مغربی یوپی کے ادب اطفال پر اپنا مضمون پیش کیا اور تازہ صورت حال سے بحث کی۔ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد یونس انصاری نے اتر پردیش کے مدارس اور عصری اداروں میں اردو کی تعلیمی و تدریسی صورت حال کا جائزہ لیا۔ مرکزی جمعیۃ علماء نئی دہلی کے سکریٹری مولانا فیروز اختر قاسمی نے مغربی یوپی میں اردو کے فروغ کے تعلق سے قیمتی سفارشات پیش کیں۔

سمینار میں دبستان رامپور کے نمائندہ شاعر سلیم تانڈوی کے شعری مجموعہ 'یہ کہانی ہے مختصر میری' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر سلیم تانڈوی نے اپنے شعری مجموعے کے حوالے سے اجمالی گفتگو کرنے کے بعد اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کے شاگردوں شہاب تانڈوی اور کمسن تانڈوی نے ان کی کچھ غزلیں اپنی آواز میں سنائیں جنھیں سامعین نے بہت پسند کیا اور بھرپور لطف اٹھایا۔ آخر میں مدرسہ ضیاء الاسلام کے صدر مدرس مفتی جعفر قاسمی نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر یوسف رامپوری نے انجام دیے۔ سمینار میں سامعین کی اچھی خاصی تعداد موجود رہی۔

پریس ریلیز: یوسف رامپوری، رامپور، 25 مارچ 2020

اردو کے فروغ میں مدرسۃ الاصلاح کا کردار

نئی دھلی: مرکز جماعت اسلامی ہند نئی دہلی میں واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سینٹر میں اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'اردو کے فروغ میں مدرسۃ الاصلاح کا کردار'' کے موضوع کے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ سمینار کل تین سیشن پر مشتمل رہا۔ پہلے سیشن میں کل 6 مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوت کلام پاک سے اس اہم تقریب کا آغاز کیا گیا، جب کہ کلمات تشکر ڈاکٹر فیضان احمد اصلاحی نے پیش کیے۔ سمینار میں شامل تقریباً سبھی اسکالرس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اپنی اپنی حیثیت اور بساط بھر ہندوستان کی تمام ریاستوں اور شہر و گاؤں میں دینی خدمات انجام دے رہے مدارس اسلامیہ اردو کی آبیاری میں قابل ستائش کوششیں کر رہے ہیں۔ تاہم اس شعبے میں کچھ امتیازات و اختصاصات چند خوش نصیب اسلامی دانش گاہوں کے حصے میں آئے ہیں، جنھیں نظر انداز کر کے زبان و ادب کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی۔ اس مہتم بالشان قومی سمینار میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے عنایت اللہ اسد سبحانی نے کہا کہ مدرسۃ الاصلاح کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے اکابر کی قرآنی تفاسیر پر گہری نظر تھی، جس کی مثال نظام القرآن اور تدبر قرآن ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے کہا کہ اردو کے فروغ میں مولانا فراہی کا اہم کردار ہے۔ دوسرے اور تیسرے سیشن میں اہم مقالات پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاروں میں مولانا عبدالسلام اصلاحی، ڈاکٹر سکندر اصلاحی، ڈاکٹر اورنگ زیب اصلاحی، ڈاکٹر ذکی فہمی ڈاکٹر عرفات ظفر، حکیم شمیم ارشاد اصلاحی، ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی، محمد مرسلین اصلاحی، محمد عاصم اصلاحی کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اصلاحیوں کی ایک بڑی تعداد سمینار میں شریک رہی۔ سمینار کے کنوینر محمد عاصم اصلاحی اور آرگنائزنگ صدر حکیم نازش احتشام اعظمی تھے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 16 مارچ 2020

فراق یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ہندوستان کا لسانی منظر نامہ اتنا ہی بھرا پُرا ہے جتنا کہ اس کا ادبی منظر نامہ، جو کم و بیش چار ہزار برسوں، نو سو زبانوں اور دو ہزار بولیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستانی ادب کو ایک وحدت کی طرح نہیں بلکہ کثرت کی ایک مثال کی طرح دیکھنا چاہیے، کیونکہ یہ ادب لسانی اور ثقافتی ہمہ رنگی کا ادب ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ

اسلامیہ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شعبۂ سنسکرت، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سمینار ہال میں 12 مارچ 2020 کو منعقدہ فراق یادگاری خطبے میں 'ہندوستانی ادب: تصور اور تناظر' کے عنوان سے معروف ترجمہ نگار اور نقاد پروفیسر انیس الرحمٰن نے کیا۔ خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے ممتاز نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ہندوستانی ادب کے حوالے سے فراق یادگاری خطبے کے ذریعے فراق کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ چوں کہ ہندوستانی ادب خود فراق کا ایک محبوب موضوع تھا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی کا شمار ہمارے عہد کے ممتاز ترین نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت ادیب، شاعر، ڈراما نگار، ترجمہ نگار، کالم نویس اور ماہر ثقافت ہیں۔ فراق یادگاری خطبے کے مہمان مقرر پروفیسر انیس الرحمٰن ہمارے عہد کے معروف اسکالر، ترجمہ نگار اور نقاد ہیں اور وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اہم خطبے کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کلمات تشکر پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد مبشر فراق کا تعارف پیش کیا۔ نظامت کے فرائض فراق یادگاری خطبے کے کنوینر پروفیسر ندیم احمد نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوت سے ہوا۔ سامعین میں پروفیسر شہناز انجم، پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، پروفیسر رضوان قیصر، پروفیسر حبیب اللہ، پروفیسر گریش چندر پنتھ، ڈاکٹر ابھے کمار شانڈلیہ، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر خالد جاوید، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر محمد آدم، ڈاکٹر سمیع احمد، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی اور ڈاکٹر سلمان فیصل کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات موجود تھے۔

پریس ریلیز، خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 13 مارچ 2020

پروفیسر رشید احمد صدیقی - حیات وادبی کمالات

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبۂ اردو کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے رشید احمد

صدیقی یادگاری خطبہ کا انعقاد 7 مارچ کو کیا گیا، جس کے تحت ممتاز صاحب قلم، ادیب و شاعر پروفیسر خالد محمود، سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شعبۂ اردو کے کانفرنس ہال میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی حیات اور ادبی کمالات پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر خالد محمود نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی جونپور میں ابتدائی تعلیم، وہاں کے تہذیبی وادبی ماحول، 1915 میں بطور طالب علم علی گڑھ آمد، زمانۂ طالب علمی میں ان کی معاشی پریشانی، گرمیوں کی چھٹیوں میں دیوانی عدالتوں میں کلرکی اور 1926 میں بطور مستقل لیکچرر تقرری سمیت دیگر سوانحی کوائف بیان کرتے ہوئے کہا کہ رشید احمد صدیقی کی حیات اور ان کی طرز نگارش کو سمجھنے کے لیے ان کی سوانحِ حیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ طنز وظرافت نگار کے علاوہ بطور ناقد بھی پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مرتبہ کم نہیں ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے اپنے مقالے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مختلف کتابوں اور مضامین کے مجموعوں کا تفصیلی ذکر کیا اور ان کے معاصرین وشاگردوں نے جو کچھ ان کے بارے میں لکھا ہے ان کے چیدہ اقتباسات پیش کرتے ہوئے کہا کہ رشید احمد صدیقی کا ادبی سرمایہ معیار اور مقدار دونوں پہلو سے قابل رشک ہے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی قدیم روایات اور قدروں کے امین تھے۔ وہ کم لوگوں سے ملتے تھے، مگر علی گڑھ کے ایسے مغنی تھے جو اس کا نغمہ ہمیشہ گاتے رہے۔ فیمیل ایجوکیشن سوسائٹی کی صدر اور ویمنس کالج کی سابق پرنسپل مہمان خصوصی پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خاندان سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ 1961 میں جب وہ اور اطہر صدیقی امریکہ سے تعلیم حاصل کرکے علی گڑھ آئے، تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مکان کے سامنے ہی ذاکر باغ میں انھیں مکان الاٹ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی ملتے کم تھے مگر محسوس سب کرتے تھے اور حالات وواقعات سے باخبر رہتے تھے۔ اس سے قبل صدر شعبۂ اردو پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ انھوں نے مہمان مقرر اور دیگر خاص مہمانوں کا تعارف کرایا۔ انھوں نے بتایا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے ہر سال 'رشید احمد صدیقی یادگاری خطبے' کے انعقاد کے لیے اپنی منظوری دی ہے۔ اس سلسلے کا یہ پہلا خطبہ ہے۔ پروفیسر سراج اجملی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر پروفیسر خالد محمود نے اپنی نظم در مدح آم بھی پیش کی جس سے حاضرین محظوظ ہوئے۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مارچ 2020

تصوف: عصری معنویت

دیوبند: شاہ ولایت گرلز کالج منگلور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'تصوف عصری معنویت' 15 مارچ 2020 کو منعقد کیا گیا، جس میں بڑی تعداد میں دانشوران نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ تصوف دلوں کو جوڑتا ہے، انھوں نے زور دے کر کہا کہ تصوف ایک طرز زندگی کا نام ہے، جس میں بھائی چارہ، خدمت خلق اور محبت و پیار کے ذریعے انسان کو انسان کے قریب لانے کی طاقت موجود ہے۔ پروفیسر فیروز احمد سابق صدر شعبہ اردو راجستھان یونیورسٹی نے کہا کہ ہمارے ہندوستانی سماج کی تشکیل میں

صوفیاء کرام کا زبردست کردار رہا ہے، جس کے ذریعے آج ہم دنیا بھر میں پرامن بقا باہمی کے علمبردار بنے ہیں، ایس ایم جی کالج سنبھل کے پرنسپل ڈاکٹر عابد حسین نے کہا کہ تصوف اور اہل تصوف عظمت انسانی کے راز سے باخبر ہیں اس لیے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے ہیں۔

معروف قلم کار وادیب سید وجاہت شاہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تصوف دل کی صفائی کا نام ہے اور انسان کے جسم میں دل ہی ایک ایسی شے ہے جو پورے بدن کا سردار کہلاتا ہے، جس طرف یہ دل غالب ہوتا ہے انسان کی عقل و طبیعت وبھی ادھر ہی جھکتی ہے، انھوں نے کہا کہ تصوف کا مطلب ہی اللہ سے ڈرنا، برائیوں سے بچنا اور اپنے نفس کی اصلاح کرنا ہے، ہر کام کو اللہ کی مرضی کے مطابق، اللہ ہی کے لیے کرنے کا نام تصوف ہے، حدیث میں آتا ہے کہ کسی سے محبت کرو تو اللہ کے لیے اور کسی سے نفرت کرو تو بھی اللہ کے لیے، انھوں نے کہا کہ اپنی زندگی کو خوشحال پرسکون اور کامیاب بنانے کی لیے ہمیں آج کے زمانے میں بھی تصوف کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی پروگرام میں جانے کے لیے صاف ستھرے اچھے کپڑوں کی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ انجم نے خواتین صوفیا کی سماجی خدمت پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر اسلم قاسمی نے کہا کہ صوفیائے کرام کی تعلیمات بلا تفریق مذہب وملت آج بھی ہمارے سماج میں یکجہتی کو مضبوط کرتی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 16 مارچ 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

بین الاقوامی غالب تقریبات

نئی دھلی: جدلیات اور لاشعور سے متعلق بحثیں ترقی پسند تحریک سے پہلے ہمارے ادب کا حصہ نہیں تھیں۔ ترقی پسند

تحریک کا فیضان ہے کہ ہم ان اصطلاحات سے واقف ہوئے۔ غالب کے یہاں جدلیات نفی کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'غالب کی شاعری میں نفی و اثبات' کے موضوع پر منعقد سہ روزہ بین الاقوامی سمینار میں کلیدی خطبے کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔ صدارت کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے سابق جج جناب آفتاب عالم نے کہا کہ غالب کی شاعری میں معانی کے کئی جہاں آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا تضاد بھی اسی قدر وسیع اور گہرا ہے۔ اس درجے کا تضاد شاید آپ مومن، ذوق، ظفر یا داغ کے یہاں نہیں پائیں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی اولیت یہ بھی ہے کہ ہم نے تمام سمیناروں کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ ہم نے اپنے کئی اہم بزرگوں سے گزارش کر کے بعض اہم کتابیں بھی لکھوائیں جو آج حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے کہ جن سے عصری حسیت بھی متاثر ہوتی ہے اور جن کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ ممتاز مؤرخ پروفیسر ہربنس مکھیا نے تعارفی خطاب میں کہا کہ ہم لوگ چیزوں کو اُن کے تضاد کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں متضاد چیزیں ایک دوسرے سے بہت مختلف نظر آتی ہیں حالانکہ ان کی گہرائی میں اتر کر غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ متضاد چیزوں میں بھی گہرا ربط اور تعلق ہوتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ کسی ادارے کا نصف صدی کا سفر ایک یادگار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے علم و ادب کی کس طرح خدمت کی ہے اس کا اندازہ آپ کو آج ریلیز ہونے والے سوینیر اور ہماری کتاب 'غالب انسٹی ٹیوٹ: نصف صدی کا سفر' کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ علم و ادب کی خدمت کرنے والوں کو ہر ممکن تعاون دے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جن افراد کو غالب انسٹی ٹیوٹ نے ابتدائی مراحل میں متعارف کرایا، وہ آج ملک کی مشہور و معروف دانش گاہوں میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں۔

اس موقعے پر جسٹس بدر دُرریز احمد کے ہاتھوں پروفیسر علیم اللہ حالی کو فخر الدین علی احمد غالب انعام برائے تحقیق و تنقید، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی کو فخر الدین علی احمد غالب اوارڈ برائے فارسی تحقیق و تنقید، پروفیسر خالد محمود کو غالب اوارڈ برائے اردو نثر، پروفیسر شہپر رسول کو غالب اوارڈ برائے اردو شاعری، جناب مظفر علی کو ہم سب غالب اوارڈ برائے اردو ڈرامہ اور ڈاکٹر نریش کو غالب اوارڈ برائے مجموعی علمی خدمات پیش کیا گیا۔ اس گولڈن جبلی تقریبات کے موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع مندرجہ ذیل کتابوں کی رسم رونمائی عمل میں آئی: دیوان غالب کا فی میل فارم، سووینیر 1969-2019، گنجینۂ معنی کا طلسم جلد سوم مصنفہ رشید حسن خاں، قادر نامہ مرتبہ پروفیسر اخلاق احمد آہن، اردو ادب میں وقت کا تصور مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، شرح دیوان غالب مصنفہ حسرت موہانی، باقیات شہریار، غالب اور الور مصنفہ ڈاکٹر مشتاق تجاروی، نقد غالب اور آل احمد سرور مرتبہ ڈاکٹر امتیاز احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نصف صدی کا سفر مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی و ڈاکٹر رضا حیدر، شمس الرحمٰن فاروقی ادیب و دانشور مرتبہ ڈاکٹر رضا حیدر و محضر رضا، نظم طباطبائی مونوگراف پروفیسر ظفر احمد صدیقی، رشید حسن خاں مونوگراف مصنفہ ڈاکٹر عمیر منظر، سید مسعود حسن رضوی ادیب مونوگراف مصنفہ ڈاکٹر نور فاطمہ، یوسف سلیم چشتی مونوگراف مصنفہ ڈاکٹر عبدالسمیع، انشاء اللہ خاں انشا اور ہندستانی روایت مرتبہ ڈاکٹر رضا حیدر، کچھ غالب کے بارے میں مرتبہ ڈاکٹر محضر رضا، عہد غالب کا لکھنؤ مرتبہ ڈاکٹر رضا حیدر، غالب نامہ جولائی 2019 و جنوری 2020۔ اس موقعے پر اسکالرز نے بھی 'غالب کی شاعری میں نفی و اثبات' کے موضوع پر اپنے مقالات پیش کیے اور سامعین میں علم و ادب سے وابستہ شخصیات، ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات کی بڑی تعداد موجود رہی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' اور قندیل ڈاٹ کام، 14 مارچ 2020

دھلی:

منشی نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ورجینیا یونیورسٹی امریکہ کی پروفیسر اور معروف اسکالر مہر افشاں فاروقی نے 6 مارچ کو شعبۂ اردو جامعہ ملیہ

اسلامیہ کے زیر اہتمام 'غالب، منشی نول کشور اور مطبوعہ کتابوں کا رواج' کے زیر عنوان سہ پہر تین بجے ٹیگور ہال دیار میر تقی میر میں منشی نول کشور یادگاری خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے وقیع خطبے میں کہا کہ علمی اور ادبی کلچر کے

فروغ میں طباعتی ایجادات اور ٹیکنالوجی کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ غالب کی شہرت ومقبولیت میں ان کی شاعرانہ عظمت اور عبقریت کے علاوہ اس زمانے کے ترقی یافتہ پریس مطبع منشی نول کشور کا بھی غیر معمولی کردار رہا ہے۔ غالب کے تصور میں کتاب کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار، طباعتی نفاست، تزئین وخوش نمائی اور عمدہ کتابت کے معیارات تھے، ان کو اپنے اس خواب کی تعبیر مطبع منشی نول کشور میں نظر آئی۔ چنانچہ غالب، منشی نول کشور اور غالب کی مطبوعہ کتابوں کے مابین جو بامعنی رشتہ قائم ہوتا ہے اور غالب کی تشہیر میں ان عوامل کا جو کردار رہا ہے، اس پر ایک مبسوط تحقیق بہت نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ منشی نول کشور محض ایک کاروباری ناشر ہی نہیں تھے بلکہ وہ مشرقی تہذیب کے روشن دماغ سفیر تھے۔

صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ خطبہ کے کنوینر پروفیسر احمد محفوظ نے مہمان مقرر پروفیسر مہر افشاں فاروقی کا مفصل تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے کلماتِ تشکر پیش کیے۔ اس موقع پر ورجینیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ریسرچ اسکالر میگن اور ایلیٹ کے علاوہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ کے اساتذہ وریسرچ اسکالرز موجود رہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 مارچ 2020

'آنند نارائن ملا کی حیات اور خدمات' پر سمپوزیم

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کی سرپرستی میں 14 مارچ کو نامور اردو شاعر آنند نارائن ملا کی حیات وخدمات پر ایک

سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ مشہور ومعروف اردو نقاد اور ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ آنند نارائن ملا کو گنگا جمنی تہذیب کے لیے یاد رکھنا بے حد ضروری ہے۔ پروفیسر نارنگ نے ملا کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے انسانیت کو ترجیح دی اور ہر طرح کے تشدد کی مخالفت کی۔ اس تناظر میں وہ گاندھی کے پیروکار ہیں۔ انھوں نے ان کی شاعری پر اقبال کے اثرات کو بتاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تقسیم کے المیہ پر جو محسوس کیا اسے بہت شفافیت کے ساتھ پیش کیا اور وہ آنے والی نسلوں کو راہ دکھاتا رہے گا۔ وہ اردو کو صلح کی زبان مانتے تھے۔

پروگرام میں پروفیسر نارنگ کے علاوہ آنند ملا کی بیٹی ڈاکٹر اپنتا ملا وائل، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید، ساہتیہ کے اردو مشاورت گروپ کے کنوینر نامور اردو شاعر ش ک نظام، نامور اردو مصنف اور نقاد پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر ظہیر علی اور ڈاکٹر دانش الہ آبادی نے شرکت کی۔ پروگرام کی شروعات میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے شرینواس راؤ نے تمام شرکا کا خیر مقدم شال اوڑھا کر اور کتابیں ہدیہ کرکے کیا۔ پروگرام میں دو سیشن ہوئے۔ پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ آنند نارائن ملا کی شاعری پر کسی کا اثر نہیں تھا بلکہ انھوں نے خود اپنی الگ راہ پیدا کی۔ ان کی زندگی اور شاعری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ انھوں نے ان کے نظریاتی نظریے کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی بھی نظریہ سے متاثر نہیں تھے۔ وہ مانتے تھے کہ ایسا کرنے پر فنکار کے تخلیقات متاثر ہوتی ہیں اور اس کی دھار کمزور ہوتی ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ فی الحال انسانیت پر جو خطرہ ہے اسے آنند نارائن ملا نے بہت پہلے پہچان لیا تھا۔ اب ضرورت یہ ہے کہ ہم ان کی شاعری کو دوبارہ جانچیں اور اس پر دوبارہ غور وخوض کریں۔ آنند نارائن ملا کی بیٹی اپنتا ملا وائل نے کہا کہ یہ ان کے لیے فخر کی بات ہے کہ ان کی وراثت کو ایک بار پھر ساہتیہ اکادمی کے ذریعہ یاد کیا جا رہا ہے اور اس پر بڑے بڑے دانشوران کے ذریعہ تبادلہ خیال کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے آنند نارائن ملا سے متعلق کئی یادوں کا تذکرہ کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورت منڈل کے کنوینر ش ک نظام نے کہا کہ آنند نارائن ملا نے اپنی شاعری میں محبت کو ترجیح دی اور ہمیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ اردو کو اپنے مذہب سے زیادہ اہمیت دینے کے ان کے فلسفے نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ پروگرام کے دوسرے سیشن کی صدارت ش ک نظام نے کی اور ظہیر علی اور دانش الہ آبادی نے اپنے مضامین پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت ہندی ایڈیٹر انوپم تیواری نے کی۔ پروگرام میں اردو دنیا سے جڑے ہوئے کئی اہم مصنف، صحافی اور منورما نارنگ، چندر بھان خیال، حقانی القاسمی، سرور الہدیٰ، احمد علوی سمیت کئی لوگ موجود تھے۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 15 مارچ 2020

آندھرا پردیش:

شعبۂ اردو (ایس وی یو) تروپتی کی علمی وادبی اور تدریسی خدمات

تروپتی: جشن الماس اور دو روزہ قومی سمینار بہ عنوان 'شعبۂ اردو (ایس وی یو) تروپتی کی علمی وادبی اور تدریسی خدمات' شعبۂ اردو جامعہ سری وینکٹیشورا، تروپتی، آندھرا پردیش میں 14,15 مارچ 2020 کو انعقاد ہوا۔ شاندار افتتاحی اجلاس (S.V.U) اڈمنسٹریٹیو بلڈنگ کے سینٹ ہال میں سید عارف اللہ قادری کی تلاوت کلام پاک سے آغاز ہوا۔ اس شاندار اجلاس میں کثیر تعداد میں سامعین جمع ہوئے۔ اس اجلاس کے تمام مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر شیخ حسینہ بیگم کرتے ہوئے ان کے خدمت میں گلدستہ پیش کیا۔

اس اجلاس میں مہمان خصوصی پروفیسر سندرولی صاحب (ایس وی یو ریکٹر)، پروفیسر مظفر علی شہ میری وائس چانسلر (ڈاکٹر عبدالحق اردو یونی ورسٹی کرنول وقدیم طالب علم)، پروفیسر مرلی دھر (نائب پرنسپال آرٹس کالج، ایس وی یو)، مہمانِ اعزازی پروفیسر عبدالاحد، پروفیسر بشیر احمد (سابق صدر شعبہ اردو، ایس وی یو قدیم طالب علم)، پروفیسر ستار ساحر (سابق صدر شعبہ اردو، ایس وی یو قدیم طالب علم) خصوصی مدعوعالی جناب مقبول احمد (موظف آر جے ڈی وپہلی بیاچ کے (1959) قدیم طالب علم، کڈپہ) جناب انیس الحق (سابق ڈائرکٹر جنرل دوردرشن بنگلورو قدیم طالب علم)،، ڈاکٹر راہی فدائی صاحب (قدیم طالب علم، محقق ونقاد، بنگلور)، پروفیسر قاضی حبیب احمد (صدر شعبہ اردو مدراس یونی ورسٹی، چینئی وقدیم طالب علم) جناب ایس یم کمال اللہ ظہوری لطفی، جنیدی صاحب، گورنمنٹ سرقاضی، ضلع چتور، کی حیثیت سے شریک رہے۔ صدارت کی ذمہ داری پروفیسر مرلی دھر وائس پرنسپل، S.V.U کالج آف آرٹس نے انجام دی۔ سمینار کے ڈائرکٹر صدر شعبہ اردو (S.V.U) ڈاکٹر محمد نثار احمد اور معزز مہمانان نے مل کر شمع روشن کی۔

سمینار کے کنوینر ڈاکٹر امین اللہ نے خطبہ استقبالیہ میں مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد سلائڈ شو شعبۂ اردو (ایس وی یو) کے ذریعہ شعبہ اردو (ایس وی یو) کی ساٹھ سالہ کارکردگی کا جائزہ ترانۂ شعبہ اردو (ستار فیضی کی نظم) کے ساتھ پیش کیا گیا۔ سمینار کے ڈائرکٹر صدر شعبہ اردو (S.V.U) ڈاکٹر محمد نثار احمد کی جانب سے تدوین شدہ یادگار کتاب بعنوان 'سمت و رفتار' (مجموعہ مضامین ومقالات) کی رسم اجرا مہمان خصوصی پروفیسر سندرولی ریکٹر (ایس وی یو) کے ہاتھوں ہوئی۔ سمینار

کے ڈائرکٹر صدر شعبہ اردو (ایس وی یو) ڈاکٹر محمد نثار احمد نے جشن الماس اور دو روزہ قومی سمینار منعقد کرنے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہمارا مقصد صرف قدیم ورثہ، علاقائی ادب کا تحفظ ہی نہیں ساتھ ساتھ اس کے لیے عملی اقدامات کے سلسلے میں غور وفکر اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کے ساتھ منظم طور پر کچھ کرنے کا عزم اور اس کی فکر کرنا ہے۔ یادگار تاریخی کتاب کی اشاعت بھی اس کی ایک اہم کڑی ہے۔

پروفیسر سندرولی نے اپنے خصوصی خطاب میں انگریزی اور اردو کے ادبی اصناف کے متعلق ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جشن الماس کے موقع پر شعبہ کے فارغین کا پہلی بیاچ تا حال اکٹھا کرنا شعبہ اردو کے جشن کی شاندار کامیابی کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر عبدالاحد نے اپنے خطبہ میں شعبہ کے صدر و اساتذہ کو جشن کے حسن انتظام پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے تدریسی حقوق کی مکمل ادائیگی نہیں ہو رہی ہے۔ اسی لیے وہ خاص اردو کا ماحول پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نے شعبہ اردو کے قیام کا سہرا افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کے سر باندھا اور کہا کہ ملک کے مختلف ریاستوں میں یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ و طالبات بہ حسن وخوبی اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر ستار ساحر، جناب مقبول احمد، قاضی محمد انیس الحق، ڈاکٹر راہی فدائی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ پروفیسر قاضی حبیب نے شعبہ کی توجہ ادبی جریدہ جاری کرنے کی طرف مبذول کرواتے ہوئے کہا کہ یونی ورسٹی میں قلم ہی کا زور ہونا چاہیے قلم ہی سے ہماری پہچان قائم ہے۔ پروفیسر مظفر شہ میری نے اپنے کلیدی خطبہ میں شعبہ اردو کے قیام سے لے کر تا حال تک کے ہر استاد کی کاوشوں کو فرداً فرداً تفصیلاً ذکر کرتے ہوئے استاذی پروفیسر رضی الدین احمد مرحوم کی نصیحت کو دوہرایا ”بڑا آدمی وہ ہے کسی سے ملنے کے بعد دوسروں کو بڑا سمجھیں بلکہ کسی سے ملنے کے بعد خود کو بھی بڑا آدمی بننے کا حوصلہ محسوس کرے۔“ پروفیسر مرلی دھر کے صدارتی خطبے کے بعد ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری کے ہدیہ تشکر پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

دوپہر 2:30 بجے پہلا تکنیکی اجلاس کا آغاز ہوا جس میں پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ، علی گڑھ، ڈاکٹر خواجہ پیر، کڈپہ، ڈاکٹر راہی فدائی بنگلور، پروفیسر رفعت النساء میسور، ڈاکٹر غفار ملاپورم، کیرلا، ڈاکٹر محمد نقی اللہ خان نقی، گرم کنڈہ، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، رایچوٹی، ڈاکٹر سید ریاض بخاری مدن پلی نے مقالے پیش کیے۔

پروفیسر سید سجاد حسین (سابق پروفیسر مدراس یونیورسٹی چنئی) نے اپنے صدارتی خطبہ میں پڑھے گئے مقالوں کو بصیرت افروز مقالے کہا۔ صدر شعبہ اردو اور ان کی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے سلائڈ شو کی تعریف فرمائی۔

دوسرے دن صبح دس بجے دوسرا تکنیکی اجلاس شروع ہوا۔ صدور قاضی انیس الحق اور پروفیسر معید جاوید (صدر، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی رہے۔ اس میں ڈاکٹر عطاء اللہ سنجری، کیرالا، حافظ شبیر احمد کرنولی، ڈاکٹر شمس الدین تروکاد، کیرلا نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر معید جاوید نے اپنے صدارتی خطبہ میں مقالہ پڑھنے کے لب ولہجہ کی باریکیوں پر تفصیلاً گفتگو فرمائی۔ قاضی انیس الحق نے اجلاس سے مخاطب ہو کر فرمایا اردو کو روزگار سے کس طرح جوڑا جا سکتا ہے اور مسابقتی امتحانات میں حصہ لینے کی ترغیب فرمائی۔

تیسرا تکنیکی اجلاس بارہ بجے شروع ہوا، جس میں صدور پروفیسر خطیب مصطفیٰ اور پروفیسر ستار ساحر رہے۔ اور پروفیسر بشیر احمد کرنول، حافظ نذیر احمد کرنول، ڈاکٹر داؤد خان مدن پلی، ڈاکٹر امین اللہ، ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری منیر نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر خطیب مصطفیٰ نے اپنے صدارتی خطبہ میں ترجمہ نگاری کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور ترجمے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ ہر اجلاس کے اختتام پر سند اور مومنٹو پیش کیے گئے۔ جشن الماس میں طعام اور چائے کا نظم رہا۔

دوسرے دن 2:30 بجے اختتامی اجلاس شروع ہوا۔ مہمان خصوصی قاضی محمد انیس الحق (بنگلور) مہمان اعزازی پروفیسر رفعت النساء بیگم (میسور) پروفیسر معید جاوید (حیدرآباد) خصوصی مدعو جناب حسینی باشا شہ میری پرنسپال جونیر کالج کڈپہ، ڈاکٹر پی۔ داؤد خان، مدن پلی موظف صدر شعبہ اردو ڈگری کالج) ڈاکٹر غفار (ملاپورم، کیرلا)، ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری (سنسکرت شنکراچاریہ یونی ورسٹی، کیرلا) شریک اجلاس رہے۔ مہمانان کا تعارف ڈاکٹر منیر محی الدین قادری منیر نے پیش کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد نثار احمد، ڈائرکٹر و صدر شعبہ اردو (S.V.U)، 30 مارچ 2020

اعزاز واکرام:

ڈاکٹر محمد طاہر

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خان اور انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ہارمنی کے جنرل سکریٹری محمد خالد نے مشیر طب یونانی، حکومتِ ہند ڈاکٹر محمد طاہر کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انھیں ابن سینا یادگار مومنٹو پیش کیا۔ محمد خالد نے کہا کہ عالمی میڈیسن ڈے 6 مارچ 2020 کے موقع پر ڈاکٹر محمد طاہر کو ابن سینا یادگار مومنٹو لکھنو میں منعقدہ تقریب میں پیش کیا جانا تھا، مگر منسٹری آف آیوش کی مصروفیات کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے، اس لیے دہلی میں آکر ان کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 مارچ 2020

نورالحسنین

نئی دہلی: چوبیسویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر 2020 جیوری کی میٹنگ نئی دہلی میں منعقد ہوئی جس میں اردو کے ممتاز فکشن نگار و صحافی نورالحسنین کو یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی

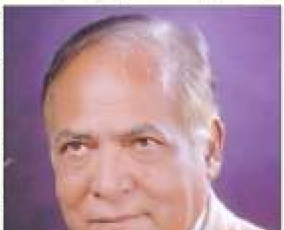

تمغہ اور سپاس نامے پر مشتمل ہے۔ جیوری کے چیئرمین پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ نورالحسنین کا شمار عہد حاضر کے گراں قدر افسانہ نگار، کالم نویس اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ انھیں بچپن سے ہی فکشن لکھنے کا شوق تھا۔ نورالحسنین نے زیادہ تر معاشرتی، سیاسی وسماجی افسانے لکھے ہیں۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے اور چار ناول شائع ہو چکے ہیں۔ 'نیا افسانہ: نئے نام' (دو جلدوں میں) اور 'اردو ناول: کل اور آج' کے نام سے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ 'خوش بیانیاں' (خاکے)، 'گڈو میاں'، 'چوتھا شہزادہ' (بچوں کے لیے کہانیاں)

بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ نورالحسنین کو مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا جاچکا ہے جن میں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی سے ان کی کتابوں پر پانچ بار ایوارڈ شامل ہے۔ اترپردیش اردو اکادمی سے تین بار ایوارڈ اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کی جانب سے فکشن کا 'منظر کاظمی قومی ایوارڈ برائے 2017' سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔ اب تک 9 مختلف یونیورسٹیوں میں ان کے ناولوں اور افسانوں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کا کام بھی ہوچکا ہے۔

مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا یہ پروقار ادبی ایوارڈ ہر سال ایک ہندستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ اس سال پینل آف جج کا اجلاس جیوری کے چیئرمین اور اردو کے ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اراکین جیوری میں پروفیسر شافع قدوائی، جناب شین کاف نظام اور حقانی القاسمی شامل تھے، جبکہ کوآرڈینیٹر کفایت دہلوی اور معاون محمد موسیٰ رضا بھی موجود تھے۔ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے سرپرست اعلیٰ محمد عتیق ہیں۔ یہ ایوارڈ بانی مجلس جناب مصیب الرحمٰن نے شروع کیا تھا، تب سے اب تک 24 ادیبوں کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ نورالحسنین کو یہ ایوارڈ ماہ اکتوبر 2020 کو دوحہ قطر میں منعقدہ تقریب میں پیش کیا جائے گا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 مارچ 2020

وفیات:

انل ٹھکر

ہبلی: نامور افسانہ نگار، ناول نویس اور ڈرامہ نگار انل ٹھکر چھیاسی سال کی عمر میں ہبلی، کرناٹک میں 4 اپریل 2020 کو وفات پاگئے۔ تقسیم ہند سے قبل ریاست گجرات کے ضلع 'کچھ' میں 'ورسامیڑی' گاؤں میں ماوجی بھائی کے گھر 6 جون 1934 کو ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ انھیں اردو کے علاوہ ہندی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے 1982 سے 2020 تک ڈراموں کے تین مجموعے، چار افسانوی مجموعے اور چھ ناول تخلیق کیے جنھیں اہل علم و ادب کے حلقے میں قبول عام حاصل ہوا۔ ان کا ڈرامہ ''چوتھی دیوار'' کرناٹک یونیورسٹی میں ایم کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ انھیں متعدد اردو اکادمیوں اور دیگر اردو اداروں کی جانب سے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ٹھکر ایک بہترین اداکار بھی تھے اور انھوں نے جہاں متعدد ڈرامے اسٹیج کیے، وہیں کنڑ اور ہندی فلموں اور ٹی وی سیریلز میں اداکاری بھی کی۔

عبدالاحد ساز

ممبئی: معروف شاعر عبدالاحد ساز کا طویل علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ واقع جوگیشوری ممبئی میں 22 مارچ کو انتقال ہوگیا۔

وہ عروس البلاد ممبئی سے 1980 کی دہائی میں اُبھرنے اور پوری اُردو دنیا میں اپنی پہچان بنانے والے شعرا میں سے ایک تھے۔

عبدالاحد ساز نے کم وقت میں اپنی ادبی پہچان بنائی۔ اُن کے تین شعری مجموعے 'خموشی بول اُٹھی ہے' (1990)، 'سرگوشیاں زمانوں کی' (2003) اور 'در کھلے پچھلے پہر' شائع ہوئے۔ سنجیدگی اور متانت کا پیکر عبدالاحد ساز جتنے شائستہ اور نرم گفتار تھے، اُتنا ہی مدھم اور مہذب اُن کا شعری لہجہ تھا جو اُن کی شاعری کا امتیازی وصف قرار پایا۔ مادری زبان کچھی ہونے اور کاروباری حلقوں میں گجراتی بولنے والے ساز کا اُردو ذخیرۂ الفاظ بھی خاصا وسیع تھا۔ اُن کی شاعری پڑھنے اور سننے یا اُن سے گفتگو کرنے والے لوگ اُنھیں کچھی یا گجراتی بولتا ہوا دیکھتے تو دنگ رہ جاتے تھے۔ ساز نے جن کے والد عبدالرزاق سعید بھی اہم اُردو شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے، ابتدائی وثانوی تعلیم اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول سے حاصل کی اور پھر سڈنہم کالج میں داخلہ لیا، جہاں سے انھوں نے بی کام کی ڈگری حاصل کی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 2020

اسرار جامعی

نئی دہلی: طنز و مزاح کے مشہور شاعر اسرار جامعی طویل علالت کے بعد 4/ اپریل 2020 کو صبح ساڑھے پانچ بجے انتقال ہوگیا۔

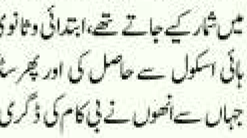

ان کی عمر تقریباً بیاسی سال تھی۔ وہ طویل عرصے سے علیل تھے۔ ان کا علاج یہاں کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں چل رہا تھا۔ اسرار جامعی کی پیدائش صوبۂ بہار کے گیا میں 1938 میں ہوئی تھی، انھوں نے ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حاصل کی، سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے اساتذہ میں تھے۔ رانچی کالج سے بی ایس سی اور برلا کالج آف ٹکنالوجی سے انجینئرنگ کیا تھا۔ اسرار جامعی نے اردو کی مزاحیہ شاعری میں بڑی اہم اور نمایاں خدمات انجام دیں، ان کا ایک شعری مجموعہ بھی 'شاعر اعظم' کے نام سے شائع ہوا، اس کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

اسرار جامعی کے کلام کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ لفظوں اور ترکیبوں میں بہت زیادہ توڑ جوڑ کیے بغیر بہت معنی خیز اشعار کہتے تھے اور محض چند حرفی ہیرپھیر سے بات کو کہیں سے کہیں پہنچادیتے تھے۔ ان کے طنز میں پھکڑپن نہیں ہوتا تھا، ان کا طنز ایسا ہوتا تھا کہ وہ شخص بھی سن کر مزے لیتا جوان کا ہدف ہوتا۔ اسرار جامعی کو ان کی ادبی و شعری خدمات پر مختلف اداروں کی جانب سے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' وقندیل ڈاٹ کوم، 5 اپریل 2020

ڈاکٹر ابرار اعظمی

اعظم گڑھ: اردو کے ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ابرار اعظمی خالص پوری کا پچاسی سال کی عمر میں 7 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ وہ 5 فروری 1936 کو خالص پور سگڑی، اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ میاں جی اسلامیہ کالج گورکھپور میں وہ مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے ہم سبق تھے۔ ڈاکٹر ابرار اعظمی کے تین شعری مجموعے 'جوہر آئینہ'، 'پرستش وعقیدت'، 'غبار شیشہ ساعت' شائع ہوئے۔ انھوں نے دیگر متعدد اہم اور قیمتی کتابیں اور رسالے لکھے۔ ان میں 'نثر پارے' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شمائل ترمذی کی انھوں نے جو تلخیص کی تھی وہ بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، انھوں نے شاعری کے ساتھ کچھ افسانے بھی لکھے، ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'وہ ایک رات اور دوسرے افسانے' کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ فاروقی صاحب کی بعض نادر تحریریں مرتب کرکے 'بازیافت' کے نام سے شائع کیں۔ 'آیئے قرآن پڑھیں' نامی ان کا کتابچہ بھی بہت مقبول ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن چھپے۔ ان کی تخلیقات آجکل، معارف، شب خون اور دیگر متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں۔ اصلاً وہ تعلیم کے آدمی تھے۔ ماناری پی جی کالج میں شعبۂ تعلیمات کے صدر رہے اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ وہ جامعۃ الفلاح کے فاؤنڈر رکن تھے اور وہاں کے تعلیمی و انتظامی امور میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

پریس ریلیز: محمد الیاس اعظمی، اعظم گڑھ، 7 اپریل 2020

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون
اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 20
قیمت: 20 روپے

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

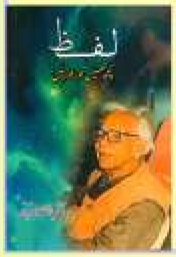

مصنف: آل احمد سرور
دوسری طباعت: 2019
صفحات: 95
قیمت: 70 روپے

صحت الفاظ

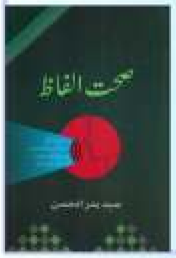

مصنف: سید بدرالحسن
ساتویں طباعت: 2019
صفحات: 253
قیمت: 90 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

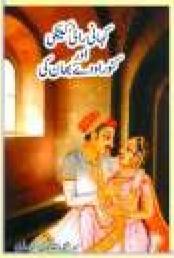

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 30
قیمت: 35 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

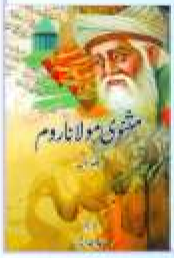

مترجم: سید احمد ایثار
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 223 (جلد اول)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم)، 238 (پنجم)، 256 (ششم)
قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

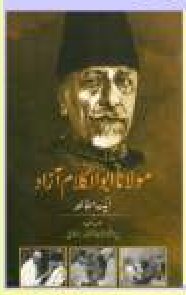

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
دوسری طباعت: 2019
صفحات: 474
قیمت: 215 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

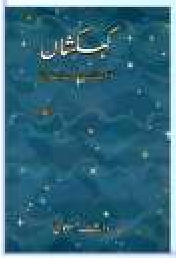

مصنف: وارث علوی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 527
قیمت: 240 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین
تیسری طباعت: 2019
صفحات: 910
قیمت: 395 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/04/2020**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, May-2020, Vol.22, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025